زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثـالـث

جلد ۔ ۵ شمارہ ۔ ۱۸

اپریل تا جون ۲۰۲۱ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

تزئین کار: اعجاز رحمانی

سرورق: محمد نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۲۰۰/روپے۔اس شمارے کی قیمت.....۳۰۰/ روپے

سالانہ : ۸۰۰/روپے

خصوصی تعاون : .....پندرہ ہزار روپے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ستر (۷۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	اسّی (۸۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پچاس (۵۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو ساٹھ (۱۶۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	بیس (۲۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
قطر:	:	دوسو (۲۰۰) ریال
کویت	:	تیس (۳۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتے پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad

Indian Bank

Jamalpur Branch

A/c No. 20962191966

IFSC Code-IDIB000J550

MICR-811019203

فہرست

	اداریہ	اقبال حسن آزاد	۵
	حمد	محمد شفیع الرحمٰن شفیع	۹
	نعت	دلشاد نظمی	۱۰
غزلیں	سید انور جاوید ہاشمی، ارشد عبدالحمید، اشفاق حسین، افتخار حیدر، مرغوب اثر فاطمی، نوشاد احمد کریمی، ڈاکٹر ذکی طارق، اصغر شمیم، شہزاد انجم برہانی، ڈاکٹر رونق شہری، اسحاق وردگ، مصروفہ قادر، سرور جلال پوری		۱۱-۲۷
خراج عقیدت	شمس الرحمٰن فاروقی اور ہماری نسل	صفدر امام قادری	۲۸
	شمس الرحمٰن فاروقی کی ترجمہ نگاری	ڈاکٹر ارشد جمیل	۳۲
	شمس الرحمٰن فاروقی کی فکشن شعریات.....اتفاق واختلاف	محمد اقبال لون	۴۳
	شمس الرحمٰن فاروقی اور عملی تنقید	ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ	۵۴
	شمس الرحمٰن فاروقی: ادب پر موت کا شب خون	ڈاکٹر سیفی سرونجی	۶۱
	جدیدیت کا علم بردار: شمس الرحمٰن فاروقی	ابو محمد	۶۸
	آہ! شمس الرحمٰن فاروقی	ڈاکٹر عرشیہ اقبال	۷۷
	شمس الرحمٰن فاروقی: ایک نابغۂ روزگار شخصیت	ڈاکٹر تسنیمہ پروین	۸۲
یاد رفتگاں	احمد فراز: آخری مشاعرہ، آخری ملاقات	اشفاق حسین	۸۶
	ظفر عدیم کی چند منظومات وامتیازات	ڈاکٹر منظر اعجاز	۹۵
مضامین	مولانا منت اللہ رحمانی بحیثیت محقق ومدون	ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی	۱۰۴
	اسلوب کی تعمیر میں اصوات کا کردار	محمد لطیف	۱۱۴
	اکیسویں صدی میں اردو غزل	ڈاکٹر منصور خوشتر	۱۲۰
	اودھ کی شادیاں: رسموں اور گیتوں کا مطالعہ	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۱۳۶
	وحشت کلکتوی کی انفرادیت	حارث حمزہ لون	۱۵۰
	ناول ''غدار'' ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا ترجمان	ڈاکٹر رقیہ نبی	۱۵۸

اعتراف	احمد صغیر کی ناول نگاری ''ایک بوند اجالا'' کے آئینہ میں	جگ موہن سنگھ	۱۶۱
خصوصی مطالعہ	تجرید سے پرے ایک نیا قدم.....ہجور آما	خلیل مامون	۱۷۰
ناول کا ایک باب	ہجور آما	شبیر احمد	۱۷۹
افسانے	یوسا	خاقان ساجد	۱۹۰
	مداوا نہیں کوئی	خالد قیوم تنولی	۱۹۹
	دانے کی مٹی	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۲۰۸
	اینٹی وائرس	تنویر احمد تماپوری	۲۱۲
	کپاس کا کتا	رابعہ سلیم	۲۱۷
	وارث	ناہید طاہر	۲۲۰
	یخ بستہ تپش	ابصار فاطمہ	۲۲۳
	سمندر پر جھاگ	ڈاکٹر صوفیہ شریں	۲۲۷
ناول کا ایک باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خاں	۲۳۳
ثالث پر تبصرے	عشرت ظہیر، ڈاکٹر شاہد جمیل، سلیم انصاری، ڈاکٹر احسان عالم، وسیم احمد فدا، ڈاکٹر شاذیہ کمال		۲۴۸-۲۷۰
تبصرے	دھواں مبصر مریم صدیقی، جانے پہچانے لوگ مبصر اقبال حسن آزاد، عہد ساز شخصیت: سرسید احمد خان مبصر اقبال حسین، یادوں کی سوغات مبصر شیخ اصغر شیخ اکبر، اسیر خواب مبصر ڈاکٹر محمد ابوعبیدہ جوہر		۲۷۱-۲۸۱
مکتوبات	حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحبؒ، مشتاق احمد نوری، سریش کمار، نعمان قیصر، ڈاکٹر ذکی طارق		۲۸۲-۲۸۸

﴿ثالث ملنے کا پتا﴾

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) +91 9304888739

اداریہ

صدق و صفا کا مہر درخشاں نہیں رہا
افسوس اب وہ نیّر تاباں نہیں رہا

امارت شرعیہ بہار، اڈیشہ اور جھارکھنڈ کے امیر شریعت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری اور خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ ۳؍اپریل ۲۰۲۱ بروز سنیچر انتقال فرما گئے۔ ان کی عمر ۷۷ سال تھی۔ آپ کی پیدائش ۵؍جون ۱۹۴۳ء کو مونگیر کی خانقاہ رحمانی میں مولانا منت اللہ رحمانی کے گھر میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند اور لکھنؤ کا سفر کیا۔ وہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۶ء تک بہار قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ ۲۹؍نومبر ۲۰۰۵ء کو امارت شرعیہ کے امیر شریعت منتخب کیے گئے۔ ۱۹۹۱ء سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری اور جون ۲۰۱۶ء سے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔

مولانا ولی رحمانیؒ کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ موصوف تعلیمی ورفاہی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر نہ صرف یہ کہ حصہ لیا بلکہ ملت اسلامیہ کی نئی نسل کو جدید تعلیم سے جوڑنے کے لئے بھی عملاً مصروف رہے۔ انہوں نے رحمانی ۳۰ کے ذریعے نئی تعلیمی بیداری پیدا کی جس کے نتائج ملک بھر میں محسوس کیے گئے۔ آپ متعدد اداروں کے سربراہ رہے اور ملک وقوم کی کے لیے کئی اہم خدمات انجام دیں۔ وہ مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے۔ ان میں بروقت فیصلہ لینے کی خداداد صلاحیت تھی۔ آپ کئی تحریکوں کے روح رواں تھے۔ آر ٹی آئی قانون سے مدارس کو مستثنیٰ قرار دینے اور داڑھی کے متعلق سپریم کورٹ کے فاضل جج کے نامناسب ریمارکس پر دوٹوک گفتگو کر کے فاضل جج کو معافی مانگنے پر مجبور کرنے، طلاق ثلاثہ بل کے خلاف پورے ملک میں مضبوط تحریک چلانے اور پانچ کروڑ سے زائد دستخط کروا کر صدر جمہوریہ کو بھیجنے جیسے بے باک فیصلوں کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ شریعت کے تحفظ کا معاملہ ہو یا پھر مدارس اسلامیہ کی بدنامی کے خلاف چلائی جانے والی مہم اور 'ناموس مدارس اسلامیہ کانفرنس' کا انعقاد وغیرہ، مولانا ولی رحمانی کی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کی سربراہی میں بہ طور خاص بہار میں تعلیمی ماحول کو سازگار بنانے کی لگاتار کوشش ہوتی رہی اور اس درمیان ان کی سربراہی میں ۲۰۲ رحمانی مکتب اور خواتین تعلیم مراکز قائم کیے گئے۔ انہوں نے مونگیر میں رحمانی بی ایڈ کالج بھی قائم کیا۔

وہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے نائب صدر بھی رہے۔ علاوہ ازیں مرکزی وقف کونسل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ، قائمہ کمیٹی برائے اقلیتی تعلیم جیسے سرکاری اداروں کی رکنیت سے بھی نوازے گئے۔ انہوں نے

حکومت ہند کی مدرسہ ماڈرنائزیشن کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اور ان کی صحافتی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے پٹنہ سے ایک اردو روزنامہ 'ایثار' بھی شروع کیا تھا جو اپنے دور کا ایک کامیاب اخبار تھا۔ وہ ایک عرصہ تک امارت شرعیہ کے ترجمان ہفت روزہ "نقیب" کے بھی مدیر رہے۔ انہوں نے درجن بھر علمی کتابیں بھی لکھیں، جبکہ کئی درجن کتابچے اور تین سو سے زیادہ مضامین بھی ان کی علمی حیثیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ تحریریں مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ "تصوف اور حضرت شاہ ولی اللہ"، "حضرت سجاد، مفکر اسلام" اور "دینی مدارس میں صنعتی تعلیم کا مسئلہ" ان کی اہم تصانیف ہیں۔

ان کی خدمات کا کئی گوشوں سے اعتراف بھی کیا گیا۔ موصوف کئی ایوارڈز سے نوازے بھی گئے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ کولمبو یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی انہیں ملی، بہترین کارکردگی کیلئے راجیو گاندھی ایوارڈ سے بھی نوازے گئے، شکشا رتن بھی انہیں دیا گیا ساتھ ہی ساتھ ایک امریکی ادارہ نے انہیں 'سرسید ایوارڈ' کا مستحق بھی سمجھا۔

وہ ایک بہترین مقرر بھی تھے۔ حکومت وقت کی لغزشوں پر کھل کر بولتے تھے۔ حق بات کہنے کے لیے وہ کسی مصلحت، تعلق یا نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ بلا خوف وخطر سچ کہتے تھے، سرعام کہتے تھے اور ظالموں کے منہ پر کہتے تھے۔ انہوں بجا طور پر شیر دل کہا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا کہ:

آئین جوانمردی، حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
(علامہ اقبال)

ان کا انتقال قوم وملت کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ میرا بھی ذاتی نقصان ہے۔ حضرت مجھے کافی عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ شفقت کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دست مبارک سے میرے دوسرے افسانوی مجموعے "مردم گزیدہ" اور "ثالث، شمارہ نمبر۔۱۷" کا اجراء فرمایا تھا۔ اس شمارے میں موصوف کی شخصیت پر میرا لکھا ہوا خاکہ شائع ہوا تھا۔ "ثالث، شمارہ نمبر۔۱۸" میں ان کا ایک مشفقانہ خط شامل ہے۔

حضرت مولانا اب جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کے افکار وخیالات مشعل راہ بن کر ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(علامہ اقبال)

☆☆☆

یکے بعد دیگرے کئی اہم شخصیات کی موت نے ذہن ودل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مولانا محمد ولی رحمانی کے بعد

۴؍اپریل ۲۰۲۱ء کو عالمی شہرت یافتہ رسالے ''شاعر'' ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی اور ۵؍اپریل ۲۰۲۱ء کو مولانا آزاد نیشن اردو یونیورسیٹی، حیدرآباد کے پروفیسر اور ششماہی جرنل ''ادب وثقافت'' کے مدیر محمد ظفر الدین بھی چل بسے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

افتخار امام صدیقی (پیدائش: ۱۹؍ستمبر ۱۹۴۷ء وفات: ۴؍اپریل ۲۰۲۱ء) ممتاز شاعر اور مقبول عام قدیم ترین رسالہ ''شاعر'' کے مدیر اعلیٰ رہے ہیں۔ ان کے والد اعجاز صدیقی بھی نامور شاعر تھے جو اردو ادب کے مشہور شاعر اور ادیب سیماب اکبرآبادی کے فرزند تھے۔ افتخار امام صدیقی نے اپنے دادا کے رسالہ ''شاعر'' کی اشاعت تسلسل سے یوں عمل میں لائی کہ اس کا ہر شمارہ ایک نئے موضوع پر مشتمل رہا۔ ماہ نامہ ''شاعر'' کو جدید رنگ ڈھنگ میں ڈھالنے اور اسے دور دور تک پہچانے میں افتخار امام صدیقی کی کوشش ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے سو کے قریب ادبی شخصیات کے انٹرویو کئے اور خاص نمبر شائع کئے۔

☆☆☆

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسیٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ظفر الدین ڈائرکٹر سنٹر فار اردو کلچر اسٹڈیز اور ڈائرکٹر آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلیکیشن کے ڈائرکٹر کا مورخہ ۵؍اپریل ۲۰۲۱ء کا حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ یونیورسیٹی کے اولین پی آر او تھے۔ ان کی نگرانی میں فاضلاتی تعلیم کے شعبہ کی سینکڑوں کتابیں تیار ہوئیں۔ جب یونیورسیٹی میں شعبہء ترجمہ قائم ہوا تو وہ اس کے اولین صدر بنائے گئے۔ بعدازاں ٹرانسلیشن اینڈ پبلیکیشنڈ یپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ ان کی نگرانی میں ۶۶ کتابیں تیار کی گئیں۔ اُن کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔ مرحوم گیا، بہار کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم دہلی یونیورسیٹی سے حاصل کی تھی۔ کئی برس تک دہلی کے روزنامہ ''قومی آواز'' سے منسلک رہے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز کاتب کی حیثیت سے کیا تھا۔ کتابت سے ترقی کرتے ہوئے سب ایڈیٹر بنائے گئے۔ اس کے بعد مزید ترقی کر کے وہ بیورو میں پہنچے۔ اس دوران تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے ایم فل کا مقالہ نیاز حیدر کی حیات وخدمات پر تھا۔ بعدازاں جب مانو حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا تو وہ حیدرآباد چلے گئے۔ اور آخر تک وہیں رہے۔ ادارہ سبھی مرحومین کے لیے دعا گو ہے۔

☆☆☆

ادب بڑا سخت جان ہوتا ہے۔ آفات ارضی وسماوی کا اس پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا اس کے برخلاف بقول غالب:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

گزشتہ ایک برس سے کرونا کی وبا نے زندگی کے ہر شعبے کو بری طرح متاثر کیا ہے لیکن ادب نے اپنی لیے نئی راہیں تلاش کر لیں اور اس دروان دنیا کی ہر زبان میں بہترین ادب پیش کیا گیا۔ سیمینار کی جگہ ویبنیار نے لے لی اور جو رسالے کتابی شکل میں شایع نہیں ہو سکے انہیں آن لائن جاری کر دیا گیا۔ الحمدللہ! ''ثالث'' آن لائن بھی جاری رہا

اور کتابی شکل میں بھی شایع ہوتا رہا۔ بے شک اس راہ میں کئی مصیبتیں اور رکاوٹیں آئیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ احباب کی مسلسل حوصلہ افزائی نے میرے جوش اور جنون کو کم نہیں ہونے دیا اور اس کے نتیجے میں یہ تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ رسالے کی ترتیب وتزئین کے دوران شمس الرحمٰن فاروقی پر کئی اہم مضامین موصول ہوگئے۔ لہذا رسالے کی ضخامت بڑھانی پڑی اور ۲۲۴ کی جگہ ۲۸۸ صفحات کا رسالہ تیار ہوگیا۔ اس لیے اس کی قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کرنا پڑا۔ اس شمارے کی قیمت مبلغ ۳۰۰؍روپے ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ''ثالث'' کے لیے کوئی پیشگی رقم نہ بھیجیں۔ البتہ رسالہ موصول ہوجانے کے بعد اگر مناسب سمجھیں تو اس ایک شمارے کی قیمت بھیج دیں۔

الحمدللہ! ''ثالث'' کے لیے کثیر تعداد میں شعری اور نثری تخلیقات موصول ہوتی ہیں۔ اگر تخلیق پسند آجاتی ہے تو اسے شائع کر دیتا ہوں خواہ لکھنے والا نیا ہو یا پرانا۔ زبان وبیان کی چھوٹی موٹی غلطیاں میں خود درست کر لیتا ہوں۔ لیکن اگر اغلاط کی بھرمار ہوتی ہے تو میں معذرت کر لیتا ہوں۔ اور اگر متن میں کہیں تبدیلی کی گنجائش ہوتی ہے تو پہلے صاحب تحریر سے اس کی اجازت لے لیتا ہوں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے بھائی! میں بغیر پڑھے کسی تخلیق کو اپنے رسالے میں شامل نہیں کرتا اور مجھے اس وقت اور کوفت ہوتی ہے جب قلم کار حضرات بار بار فون کر کے یہ دریافت کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق کب شایع کی جائے گی؟ میرے پاس ان لوگوں کے لیے ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ پہلے میں اسے پڑھوں گا اور اگر یہ میرے رسالے کے معیار پر پوری اترے گی تب ہی اسے شائع کروں گا۔ قلم کار حضرات سے گزارش ہے کہ ''ثالث'' میں بغرض اشاعت کوئی مضمون بھیجنے کے بعد صبر وتحمل سے کام لیں۔ بار بار مجھے فون نہ کریں اور نہ ہی کوئی میسیج بھیجیں۔ اگر آپ کا مضمون قابلِ اشاعت ہوگا تو شایع کر دیا جائے گا۔ اگر آپ کو اپنی کسی شعری یا نثری تخلیق کی رسید نہ ملے تو سمجھ لیں کہ اسے ناقابل اشاعت سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ غیر طلبیدہ تخلیقات کی رسید دینا مدیر کی ذمہ داری نہیں ہے۔

بیشک بہت سارے رسالے پیسے لے کر مضامین شائع کرتے ہیں لیکن میں نے مضمون چھاپنے کے لیے کبھی بھی کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ کچھ لوگ اس امید پر ثالث کا سالانہ چندہ بھیجتے ہیں کہ میں ان کی شعری اور نثری تخلیقات شایع کر دوں گا۔ عرض ہے کہ ثالث میں چھپنے کی صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ تخلیق مجھے پسند آنی چاہیے۔ میں قلمی معاونین کو رسالہ بھی اعزازی طور پر بھیجتا ہوں۔

''ثالث'' اپنے آٹھویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ رسالے کی ویب سائٹ کو دم تحریر ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) سے زائد بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر رسالے کے تمام شماروں کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

www.salismagazine.in

◀◀ ● ▶▶

● محمد شفیع الرحمٰن شفیعؔ

حمد باری تعالیٰ

ہے تقاضا زندگی میں ہر دلِ آگاہ کا
کر لے وہ اقرار کہ بندہ ہے وہ اللہ کا

حرف کوئی ابتدا میں اس سے تو بہتر نہیں
ہو اعادہ ہر عمل سے پہلے بسم اللہ کا

لا کی لاٹھی سے بھگاتے جھوٹے معبودوں کو ہم
ہوش میں لاتا ہمیں خود فیض الا اللہ کا

مضطرب دن بھر رہیں، راتوں کو جاری ہے فغاں
فجر ہوتے ہی بپا طوفان رہتا آہ کا

طائرِ قدسی ہیں خود اُڑ جائیں گے اک روز ہم
کیوں اُٹھائیں بارِ احساں مہر کا یا ماہ کا

خاک پہنچی عرش پر کیسی بلندی چاہیے
آسماں ،سُرمہ بنا لے مجھ غبارِ راہ کا

دل کو احسن، اجمل و ارفع و اعلیٰ چاہیے
صرف ایک اللہ ہے مقصود ایسی چاہ کا

پاس بھی سب سے وہی ہے، دور بھی سب سے وہی
ہے نہاں، پھر بھی عیاں جلوہ ہے اس دل خواہ کا

ہے تمنا خلد میں دیدار ہو جائے نصیب!
دل نہیں طالب کسی بھی اور رسم و راہ کا

اے خدا، واضح ،عیاں ہر دم ہو راہِ مستقیم!
واسطہ مجھ سے نہ ہو پائے کسی گمراہ کا

بخش دے مجھ کو محمدؐ کی شفاعت حشر میں!
ہو شفیعاؔ کو میسر جام عالی جاہ کا

◂◂ ● ▸▸

Shabnam Manzil
Alba Colony (Near Bari Masjid)
Phulwari Sharif Patna-801505
8210302550

● دلشاد نظمیؔ

نعت پاک

غم نہیں ظلم و ستم ہم پہ جو اغیار کے ہیں
ہم کہ جس حال میں ہیں احمدؐ مختار کے ہیں

کی ہمیں صبر کی تلقین مگر یہ بھی کہا
وقت آجائے تو پھر فیصلے تلوار کے ہیں

خود پیادہ پا چلیں اور سواری پہ غلام
ایسے اندازِ سفر قافلہ سالار کے ہیں

ساری صدیاں بھی سمٹ جائیں تو طے ہو نہ سفر
میہماں عرشِ بریں کون سی رفتار کے ہیں

جس طرف جایئے مرکز بھی وہی حد بھی وہی
زاویئے سارے اسی نقطۂ پرکار کے ہیں

حشر کے دن ہیں وہی شافعِ محشر دلشادؔ
رہنما حشر تلک بھی وہی سنسار کے ہیں

◂◂ ● ▸▸

423- Hathi Khana
Kali Mandir Road
Doranda Ranchi (Jharkhand)-834002
9117989676

سید انور جاوید ہاشمی

روح کا قرض اتارنے کے لیے
ہے کوئی جان وارنے کے لیے

خود کو دیکھا نہیں سنورتے ہوئے
ایک اک پل سنوارنے کے لیے

تم مجھے جیت لو تمھاری خوشی
میں ہوں آمادہ ہارنے کے لیے

راستے رہ نمائی کرتے گئے
ر ا ستوں سے گزارنے کے لیے

پیش مجھ کو سلام کیوں نہ کیا
راستے میں پکارنے کے لیے

ایک مدت سے کر رہا ہوں جتن
نفسِ امارہ مارنے کے لیے

بستی والے ہیں موردِ الزام
بستیوں کو اجاڑنے کے لیے

◂◂ ● ▸▸

R-1 R-40
House Gulshan E Maymar
Karanchi 75340 Pakistan

ارشد عبدالحمید

زندگی تیری مدارات تو ہونے کی نہیں
عرصۂ دشت میں برسات تو ہونے کی نہیں

دور سے شاہ کے محلوں کی طرح دیکھ ہی آئیں
مسکراہٹ سے ملاقات تو ہونے کی نہیں

از رہِ شوق دریچہ کوئی دل میں کھل جائے
یہ گلی شہرِ طلسمات تو ہونے کی نہیں

خام ہے سلسلۂ عشق میں وقفے کا خیال
دن تو ڈھلنے کا نہیں رات تو ہونے کی نہیں

میرے ساتھ اتنا برا تو نہیں ہونے والا
یہ بھلی دنیا مری ذات تو ہونے کی نہیں

سکّۂ صبر ہی کاسے سے بر آمد ہو جائے
ہم فقیروں سے کرامات تو ہونے کی نہیں

◂◂ ● ▸▸

رامش و رنگ میں تر بہ تر دل کی جناب بہت ہوئی
موسمِ عشق نکھر گیا بارشِ خواب بہت ہوئی

ناقۂ عزم کے دست و پا ریگِ گمان میں دھنس گئے
دشت عبور تو ہو گیا جان خراب بہت ہوئی

آس کے پھول پہ لکھ کبھی شبنمِ جاں کی عبارتیں
نقش و نگار بہت ہوئے لوح و کتاب بہت ہوئی

ہاں وہ نگاہِ خمار اثر میری طرف بھی اٹھی مگر
رشکِ وصال ذرا ذرا نذرِ حجاب بہت ہوئی

ٹونک ہمارے جو ساتھ تھا سنگ ادھر بھی تھا لکھنؤ
کام کی بات نہ ہو سکی آپ جناب بہت ہوئی

◂◂ ● ▸▸

ارشدؔ عبدالحمید

دیے کو سامنا مہتاب کی مثال کا تھا
مرے بزرگ نہ ہوتے تو میں کمال کا تھا

میں خیرہ آنکھیں لیے چھانتا تھا خاکِ مثال
وہ نور دشتِ تصور میں اس جمال کا تھا

پھر اس کے بعد حقیقت کی راہ پڑتی تھی
وصال تک تو حسیں راستہ خیال کا تھا

خبر نہ تھی کہ کل عالم محیط کر لے گا
وہ اشک جس میں فسانہ مرے ملال کا تھا

جواب میں تھی کسی دوسرے جواب کی رمز
سوال پھر اسی گم گشتۂ سوال کا تھا

اتر گئی وہ جو چادر سیاہ رات کی تھی
گزر گیا وہ جو خنجر ترے خیال کا تھا

یہ ہم جو دشتِ تحیر کے شعر کہتے تھے
ہماری غزلوں پہ سایہ کسی غزال کا تھا

◂◂ ● ▸▸

کیسے دل والے ہیں بیٹھے ہیں جہاں میں خاموش
مور جنگل میں، ہم اس شہرِ بتاں میں خاموش

یہ کوئی اور ہے جو بول رہا ہے مجھ میں
میں تو مدت سے ہوں اک خوابِ گراں میں خاموش

وقت سے کوئی بغاوت نہ شکایت نہ گریز
بہتے جاتے ہیں سب اس جوئے رواں میں خاموش

پھر ترے ساتھ ہی آ پہنچا زمانے کا خیال
ایک ہلچل ہوئی پھر وادیِ جاں میں خاموش

ہم کو بھی جنگِ گل و لالہ میں شامل سمجھو
ہم بھی مصروف ہیں فریاد و فغاں میں خاموش

اک ہوس ہے کہ جہاں بھر سے تسلی نہ ہوئی
اک شکم ہے کہ ہوا پارۂ ناں میں خاموش

بول اٹھتے ہیں مرے طرزِ تکلم کے طفیل
شعر ورنہ پڑے رہتے ہیں زباں میں خاموش

◂◂ ● ▸▸

ارشدؔ عبدالحمید

دل کو اک چشمِ ستمگار سے باندھا ہوا ہے
ہم نے اس جان کو تلوار سے باندھا ہوا ہے

ہم نے تخئیل کھلی رکھی ہے زنداں میں اور
آنکھ کو روزنِ دیوار سے باندھا ہوا ہے

کون خطے کے ہیں یہ لوگ جنھوں نے شب کو
صبحِ جہد و عمل آثار سے باندھا ہوا ہے

کیسے پیاسے ہیں کہ اثبات پہ جاں وارتے ہیں
کیسا پانی ہے کہ انکار سے باندھا ہوا ہے

تم ہی تھے یوسف و اسحٰق سے ہارے ہوئے لوگ
تم نے ہی مصر کو بازار سے باندھا ہوا ہے

آپ کے شعر میں آزادیِ احساس نہیں
آپ نے شعر کو افکار سے باندھا ہوا ہے

ہم جو سرسبز ہیں ارشدؔ تو ہمارے دل نے
خود کو اک شاخِ نمو بار سے باندھا ہوا ہے

◂◂ ● ▸▸

نور امکان کا ہو جیسے نمایاں سرِ خواب
صرف احساس ہے یا ہے یہ چراغاں سرِ خواب

جب سے جاری ہوئی ہے جوئے امید و تسلیم
بستے جاتے ہیں سمرقند و بدخشاں سرِ خواب

آگے اس موڑ کے رستہ نہیں ملتا کوئی
خیمہ زن کب سے ہے یہ قافلۂ جاں سرِ خواب

ایستادہ ہے سوا نیزے پہ خورشید
اور آنکھوں میں ہے ایوانِ زمستاں سرِ خواب

رونقیں کتنی نظر آتی ہیں چاروں جانب
آ کے رک جاتا ہے کیوں جادۂ ارماں سرِ خواب

تنگیاں جس میں حقیقت کی سماتی ہی نہ تھیں
دیکھتا ہوں کہ کشادہ ہے وہ داماں سرِ خواب

◂◂ ● ▸▸

Plot No: 64 to 67
Firdos Nagar Near Rajban
Tonk-304001 (Rajasthan)

اشفاقؔ حسین

پی آنکھ سے ساحل چھو کر روتا ہے
مٹی کی حالت پہ سمندر روتا ہے

جانے کیا گزری ہے ہوا کے جھونکوں پر
آج تو شہر کا ہر اک منظر روتا ہے

شام ڈھلے، یا چاند کھلے یا بارش ہو
ایسے موقعوں پر وہ اکثر روتا ہے

چاہے ہونٹوں پر ہو تبسم کتنا ہی
دل روئے تو آنکھ کا ساگر روتا ہے

یوں روئیں ہم مل کر جیسے حبس کے بعد
موسم اپنی پیاس بجھا کر روتا ہے

پھینک کے پتھر اُس جانب اِس سوچ میں ہوں
شیشہ ٹوٹ گیا یا پتھر روتا ہے

وہ جو بہت ہنستا ہے تمھاری محفل میں
وہ بھی اپنی ذات کے اندر روتا ہے

◂◂ ● ▸▸

میں سطحِ آب پہ وہ گہرے پانیوں میں ہے
بڑا تضاد ہماری طبیعتوں میں ہے

گئے دنوں کی رُتوں کے حسین خواب کا نقش
لہو کی طرح مرے جسم کی رگوں میں ہے

اُسی سے بھیک اجالوں کی مانگتے ہو کہ جو
خود اک چراغ کی مانند آندھیوں میں ہے

کھلیں گے کیسے یہاں تیری چاہتوں کے گلاب
کہ نفرتوں کی گھنی دھوپ آنگنوں میں ہے

جو ہے گواہ مری زخم زخم شاموں کا
وہ قافلہ ابھی گمنام راستوں میں ہے

کہیں یہ دردِ محبت کی ابتدا ہی نہ ہو
دبی دبی سی کسک دل کی دھڑکنوں میں ہے

◂◂ ● ▸▸

اشفاقؔ حسین

ملے تھے تجھ سے تو ہم چند ساعتوں کے لیے
مگر یہ زخم دیے تو نے مدّتوں کے لیے

بچھڑ کے تجھ سے یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ فاصلے بھی ضروری ہیں قربتوں کے لیے

میں کیوں کسی کی کدورت کو اپنے دل میں رکھوں
کہ دل تو خلق ہوا ہے محبتوں کے لیے

ہماری سادہ مزاجی کو جرم ٹھہرا کر
جواز ڈھونڈ رہے ہیں عداوتوں کے لیے

یہ کس غریب کو مصلوب کر دیا ہے کہ اب
ترس رہا ہے زمانہ صداقتوں کے لیے

فریبِ لفظِ محبت میں آئے ہو اشفاقؔ
مگر یہ لفظ بنا ہے حکایتوں کے لیے

◂◂ ● ▸▸

یہ تیری عنایت ہے یہ تیری پذیرائی
شمشیرِ محبت جو نس نس میں اتر آئی

کب تیرے حوالوں سے ہے ذکر میرا خالی
تیرے ہی توسط سے ہے خود سے شناسائی

دل ہی تو گنوانا ہے جاں ہی تو لٹانی ہے
کیا کوچۂ قاتل میں اندیشۂ رسوائی

اب دل کے دریچوں پہ دستک نہ کوئی ہو گی
آ تجھ سے کریں باتیں اے موسم تنہائی

کل تک جسے سچ سمجھا وہ آج غلط نکلا
اشفاقؔ نہ کام آیا سرمایۂ دانائی

◂◂ ● ▸▸

1570 River Road
Ottawa , Ontario,
Canada. K4M 1B4.
Ph 647 588 3499

افتخار حیدر

آبجو دیکھی، دھنک دیکھی، ستارے دیکھے
ایک ہی دن میں کئی روپ تمھارے دیکھے

ایک معصوم کے ہونٹوں پہ تبسم دیکھا
اور پرنور سی آنکھوں میں شرارے دیکھے

دیکھنا چاہے جو احساس کی شدت کا کمال
دیکھنا چاہے تو پھر زخم ہمارے دیکھے

ہم نے دنیا میں محبت ہی محبت بھگتی
ہم نے دنیا میں خسارے ہی خسارے دیکھے

تم نے دیکھے کبھی آزار سے لرزیدہ وجود؟
اپنی آنکھوں سے غمِ ہجر کے مارے دیکھے؟

جو نہیں رکھتا ہو اعجازِ محبت پہ یقین
جائے صحرا میں ترا نام پکارے، دیکھے

◂◂ ● ▸▸

پھر بھی تسکینِ دل و جاں کو نظارہ ہوتے
تم اگر پھول نہ ہوتے تو ستارا ہوتے

وہ کبھی برف کبھی برف سے بادل ہوتا
ہم کہہ آگ کہہ جل کے شرارہ ہوتے

تم جو دوبارہ چلے آتے ہماری جانب
کھول کر بانہیں وہیں ہم بھی دوبارہ ہوتے

دشتِ غربت میں بنایا تھا سہارا جس کو
اس نے جھٹکا دیا دامن کو سہارا ہوتے

آپ تو پہر یا دوپہر رکے چلتے بنے
آپ نے دیکھا نہیں دوست خسارہ ہوتے

وہ کہ اک اجنبی انداز میں کچھ کہتا رہا
ہم کہ الفاظ کو دیکھا کیے آرا ہوتے

◂◂ ● ▸▸

افتخار حیدر

ہر شکایت بھول کر ہر مصلحت کو ٹال کر
دیکھ تیرے شہر میں آیا ہوں استقبال کر

سامنے آ اور کسی کو دید کی خیرات دے
سامنے آ اور کسی سائل کو مالا مال کر

جو کماحقہٗ اس کے حسن کے شایان ہو
اے تخیل اک تو ایسا لفظ استعمال کر

وہ سمجھتی تھی کہ اس کا چاند چہرا چھپ گیا
وہ سمجھتی تھی یہی چہرے پہ پلّو ڈال کر

عشق تیرا شوق ہے خود کو مٹا اس راہ میں
حسن تیرا کام ہے جذبوں کا استحصال کر

زخم سینے میں چھپا اور کھل کھلا کر مسکرا
درد کو دل میں دبا اور شوق سے دھمّال کر

چھوڑ اَنا کو ہے محبت کا تقاضہ افتخار
تھام موبائل ملا نمبر اور اس کو کال کر

◂◂ ● ▸▸

میں نے اک خوش بدن میں رنگ بھرے
اس نے میرے سخن میں رنگ بھرے

اس کے ماتھے پہ روشنی پھینکی
اور چاہِ ذقن میں رنگ بھرے

وہ جو آئی تھی سیرِ گلشن کو
اس نے صحنِ چمن میں رنگ بھرے

ایک مٹیار راستے میں ملی
دل نشیں پیرہن میں رنگ بھرے

کس نے کھولیں جہاتِ فن مجھ پر
کس نے میرے دہن میں رنگ بھرے

کوئی آئے اداسیوں کا مکیں
کوئی آئے گھٹن میں رنگ بھرے

◂◂ ● ▸▸

Plot No 242 Gulshan Sardar
Rachna Town Shahadra
Lahor(Pakistan) 03368311214

مرغوب آثر فاطمی

ایک نسخہ تو کامیاب نکال
خود ستائی کی مت کتاب نکال
تیری ہر بات پر توجہ دوں
تُو سوالات سے جواب نکال!
یہ صفائی تجھی کو زیبا ہے
رکھ کبوتر، اُدھر گلاب نکال
ہو سرِعام درسِ خوش فہمی
اتنا دلکش کوئی نصاب نکال
جاں گُسل ہے تِری مسیحائی
اپنی زنبیل سے عذاب نکال

ہو چکا ہے جہان زیر و زبر
اب تو مغرب سے آفتاب نکال
کم نہ ہوں گے زمیں پہ ہنگامے
ہم نفس بیٹھ ، چل رَباب نکال
تُو مروّت کرے گا گن گن کے
پھر کہے گا کہ اب حساب نکال
جوئے گم گشتہ کی تمنّا ہے؟
ذہن سے جلوۂ سَراب نکال
کیمیا گر، ہے امتحان ترا
کود کنوئیں میں ماہتاب نکال
اپنے کمرے کی تیرگی میں آثر
ڈھونڈ کر چاندنی کے خواب نکال

◂◂ ● ▸▸

Road No. 17 Mohalla Aliganj
Gaya Bihar 823001

نوشاد احمد کریمی

جو آنے والا ہے ہم پر عذاب دیکھتے ہیں
طرح طرح کے شب غم میں خواب دیکھتے ہیں
قدم قدم جہاں روشن تھے تشنگی کے چراغ
اسی سراب کو اب زیر آب دیکھتے ہیں
سمجھ سکے نہ عروج و زوال کا مطلب
جو روز ڈھلتا ہوا آفتاب دیکھتے ہیں
ستاتے رہتے ہیں خدشے نئے نئے ہم کو
ہر ایک سمت عجب اضطراب دیکھتے ہیں
یہ کیسے لوگ ہیں،اپنے ہی دائروں میں گم
سوال کرنے سے پہلے جواب دیکھتے ہیں
کسی خیال کے پابند جو نہیں ہوتے
وہ خواب دیکھتے اور بے حساب دیکھتے ہیں
اب ہم سے صبر کا دامن نہ چھوٹ جائے کہیں
کہ اپنے خوں میں عجب اضطراب دیکھتے ہیں
جنہیں غرور تھا اپنی ذہانتوں پہ بہت
انہی پہ ان دنوں نازل عتاب دیکھتے ہیں
یہ تشنگی کا کرشمہ بھی خوب ہے نوشاد
ہم اپنی آنکھوں میں موج سراب دیکھتے ہیں

کیا خبر تھی اسی پوشاک میں رہنا ہوگا
عمر بھر جامۂ صد چاک میں رہنا ہوگا
اے فلک خلقِ خدا پوچھ رہی ہے تجھ سے
اور کب تک خس و خاشاک میں رہنا ہوگا
مجھ سے منسوب ہیں سب جھوٹے فسانے تیرے
پھر مجھے عرصۂ بے باک میں رہنا ہوگا
صفحۂ دہر سے اب اٹھنے لگے ہیں ہم لوگ
کیا ہمیں عالمِ افلاک میں رہنا ہوگا
زندہ رہنے کی اجازت ہے ،مگر شرط ہے یہ
ہم کو ماحولِ المناک میں رہنا ہوگا
کب وہ آئے گا نئے خواب دکھانے والا
ہر گھڑی ہم کو اسی تاک میں رہنا ہوگا
اِک نئی شکل میں پھر ہم کو ابھارے گی زمیں
کیا یہی سوچ کے اس خاک میں رہنا ہوگا
کوئی غنچہ،نہ کوئی گل،نہ کوئی شاخ ہری
کیا ہمیں موسم سفاک میں رہنا ہوگا
پھر وہیں لوٹ کے جانا ہے ہمیں اب نوشاد
جس کے منکر تھے اسی خاک رہنا ہوگا

◂◂ ● ▸▸

Ganj No.1, Bettiah -Bihar Pin-845438
Mob:9931068612

ڈاکٹر ذکی طارق

جہانِ ہوش سے بیزار رہنا چاہتا ہوں
خرد سے بر سرِ پیکار رہنا چاہتا ہوں

سنبھل سنبھل کے اُٹھاتا ہوں ہر قدم اپنا
نئے زمانے سے ہشیار رہنا چاہتا ہوں

نہیں طلب کہ مرے فن کی ہو پذیرائی
میں آج بھی پسِ دیوار رہنا چاہتا ہوں

مری طرف سے ہٹانا نہ تم نظر اپنی
تمہارے ذہن میں اس بار رہنا چاہتا ہوں

حقیقتوں کو ذکی کوئی کچھ سمجھ نہ سکے
میں بند آنکھوں سے بیدار رہنا چاہتا ہوں

◂◂ ● ▸▸

نصیبِ خفتہ کو بیدار کر دیا جائے
زمینِ شوق کو ہموار کر دیا جائے

رہینِ پستیٔ غربت جو ہیں چلو اُن کو
فرازِ زیست کا حقدار کر دیا جائے

جو مصلحت کے ہیں پردے ہٹا دیے جائیں
ہر ایک راز کو اخبار کر دیا جائے

چھپا کے رکھی نہ جائے دلوں میں چنگاری
زباں سے درد کا اظہار کر دیا جائے

ہر ایک موڑ پہ حق گوئی اس کا شیوہ ہے
ذکی کو شمع رہِ دار کر دیا جائے

◂◂ ● ▸▸

564-KelaRoad
GaushalaPhatak
Ghaziabad-201009(U.P)
Mob-9818860029

اصغر شمیم

تھا بہت سنسان رستا دور تک
جا رہا تھا میں اکیلا دور تک

آنکھ جب کھولی تو دیکھا سامنے
دھند میں لپٹا سویرا دور تک

آسماں پر جب نظر میری گئی
ایک پنچھی تھا اکیلا دور تک

کیا پتا کیسے کہاں وہ کھو گیا
خواب جو لے کر چلا تھا دور تک

کاش سورج ڈوبتا اصغر نہیں
ساتھ میرا دیتا سایا دور تک

◂◂ ● ▸▸

یوں تو سب کچھ ہے مرے پاس کہوں کچھ کم ہے
ایسا لگتا ہے مرے دل کا جنوں کچھ کم ہے

ترے اوصاف کی تصویر کشی کر نہ سکا
ترے بارے میں یہاں جو بھی لکھوں کچھ کم ہے

تجھ کو لگتا ہے ترے نام سے منسوب کروں
تری خاطر میں کروں جو بھی کروں کچھ کم ہے

روز ملتا تھا محبت کے نئے باب لیے
کیا ہوا اب کے محبت میں جنوں کچھ کم ہے

مرے حالات جو پہلے تھے وہیں ہیں اصغر
کون کہتا ہے مرا حالِ زبوں کچھ کم ہے

◂◂ ● ▸▸

C/O Baitul Qasim
12/3/H/1-Patwar Bagan Lane
Kolkata-700009(W.B)

شہزاد انجم برہانی

کل آدمی میں تھیں انجم شرافتیں کیا کیا
نمایاں ہیں سر بازار وحشتیں کیا کیا
ہمارے تھا دلِ زندہ بھی پہلو میں ورنہ
گزر گئیں ہیں سروں سے قیامتیں کیا کیا
وہ بے خودی ہے کہ حاصل کا کچھ نہیں افسوس
نظر کے سامنے روشن ہیں حیرتیں کیا کیا
سمند ناز کی ریشہ دوانیاں مت پوچھ
غبارِ راہ میں گم ہیں شباہتیں کیا کیا
فلک شگاف نوائے سرود تا بہ کجا
کہ آنکھ پُتلی میں سمٹی ہیں وسعتیں کیا کیا
نہ میری مانو قسم لو شراب احمر سے
کہ کی ہیں ان کے لبوں نے شرارتیں کیا کیا
کئی دنوں تو ترا دھیان بھی نہیں آتا
وگرنہ ہم کو میسر تھیں فرصتیں کیا کیا
متاعِ کوچہ و بازار تو نہیں ہم لوگ
یہ لوگ پھر بھی لگاتے ہیں قیمتیں کیا کیا
اب اپنے دل کی تباہی تماشا کرتے ہو
تمہیں ہیں انجمِ شہزاد عادتیں کیا کیا

◂◂ ● ▸▸

ہم ہوئے بے رنگ یہ خوش رنگ منظر کاٹ کر
ہوش کا سودا ہوا انگور کا سر کاٹ کر

آہوان زخم خوردہ رم شکن ہو جائیں گے
چھوڑ دو اپنی کماں سے تیر کا پر کاٹ کر

تیرے چہرے کی ملاحت روشنی آمیز ہو
آج لائیں گے فلک سے چاند کا سر کاٹ کر

اور کتنی دیر شب زادے رہیں دامن کشا
کوہِ غم کو دیکھتا ہے دیدہ تر کاٹ کر

تم پہ کھل جائیں دلِ ویراں کی حشر انگیزیاں
صبح کر لو رات کوئی میرے اندر کاٹ کر

◂◂ ● ▸▸

Departmentof Urdu JagjiwanCollege
NewpolicelineChandwa'nAra Bhojpur Bihar

ڈاکٹر رونق شہری

بحال ہو جو تعلق انا سے جاتے ہیں
جدا اگر ہوں سلام ودعا سے جاتے ہیں

ابھی تلک تو نکالے گئے نہیں دل سے
اگر وہ جاتے ہیں میری بلا سے جاتے ہیں

ستم کی مار ہے دوطرفہ جانئے صاحب
جو نا امید ہیں دے کر دلاسے جاتے ہیں

طویل سجدہ بھی ہوکر نماز قائم ہے
نبیؐ کی پشت پر ان کے نواسے جاتے ہیں

حلال رزق کی لذت کشید کرنے کو
پرند روز کدھر بھوکے پیاسے جاتے ہیں

خلش ہے کیسی کہاں کی یہ زود رنجی ہے
جدھر سے گذریں وہ ماحول اداسے جاتے ہیں

◂◂ ● ▸▸

خلاف شورش زاغ وزغن میں جاتے ہوئے
بہت ہی ڈر لگا لفظوں کے بن میں جاتے ہوئے

یہ ہم پہ کیسی ہواؤں کی مہربانی ہے
رکے ہیں خاک عناصر بدن میں جاتے ہوئے

مرا ستارہء گردش بہت منور ہے
بجھونگا حلقہء رنج ومحن میں جاتے ہوئے

مہیب اندھیرے کا پربت ہے مانع پرواز
پرند روشنی کے پیرہن میں جاتے ہوئے

کتاب درد مکمل سی ہوگئی اپنی
بجھا سا ماہ تمام اب گہن میں جاتے ہوئے

پرند مانگتے ہیں کیوں سلامتی کی دعا
زمین چھوڑ کر اپنی گگن میں جاتے ہوئے

◂◂ ● ▸▸

Donaiya , Po : Fatehpur
Gaya Bihar 824232
Mob: 8434707170

اسحاق وردگ

ذات کا راز کھو چکا ہوں میں
گم شدہ چیز ہو چکا ہوں میں

ماں کی لوری سنا رہی ہے یاد
اور دریچے میں سو چکا ہوں میں

اب پلٹنے کا فائدہ کیا ہے
وقت پہلے ہی کھو چکا ہوں میں

سامنے آئنے کے آتے ہی
خاک سے عکس ہو چکا ہوں میں

زخم سرسبز ہونے والے ہیں
یاد کا بیج بو چکا ہوں میں

بوجھ مٹی کا رہ گیا ہے فقط
روح کا بوجھ ڈھو چکا ہوں میں

آپ دیوار کو گرائیں جناب
اپنے سائے کو رو چکا ہوں میں

مجھ کو اپنا پتا نہیں معلوم
جانے کس کس کا ہو چکا ہوں میں

گوشوارہ کبھی نہیں رکھا
کتنی سانسیں پرو چکا ہوں میں

◂◂ ● ▸▸

Jahangir Pura
Peshawar (Pakistan)
03459048908

مصروفہ قادر

زمانے سے بغاوت ہے، نہیں تو
مجھے تم سے محبت ہے نہیں تو

یہ سانسیں اب بھی دیکھو چل رہی ہیں
مجھے تیری ضرورت ہے نہیں تو

میرا دل ہے کہ بس اب بجھ چکا ہے
ذرا سی بھی کدورت ہے ، ہیں تو

بھنور میں ناؤ اب تو پھنس چکی ہے
نکلنے کی بھی صورت ہے، نہیں تو

کہا کس نے میں اس کو پوجتی ہوں
میرے گھر اس کی مورت ہے، نہیں تو

سنا ہے ہاتھ ٹوٹے ہیں وفا کے
کوئی اس میں حقیقت ہے نہیں تو

◂◂ ● ▸▸

ڈروان سے یہ بھولے سے بیچارے لوٹ لیتے ہیں
گلوں سے بوفلک سے یہ ستارے لوٹ لیتے ہیں

عجب قزاق آئے ہیں، غضب دستور ہے ان کا
یہ بیڑے چھوڑ دیتے ہیں کنارے لوٹ لیتے ہیں

برا مت ماننا اب کے یہ تہیہ کر کے آئے ہیں
کہ جتنے بھی ہیں درد و غم تمہارے لوٹ لیتے ہیں

یہ ہم اہل جنوں سود و زیاں کا غم ہیں کب پالے
منافع چھوڑ کر ہم تو خسارے لوٹ لیتے ہیں

نہ اعداء سے گلہ کوئی نہ ہی کوئی شکایت ہے
جو یہ جانا کہ اپنے ہی سہارے لوٹ لیتے ہیں

◂◂ ● ▸▸

مصروفہ قادر

عشق کا بھی نصاب ہوتا ہے
ہاں مگر بے حساب ہوتا ہے

زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں
جس کا ہر پل عذاب ہوتا ہے

جس کا ملنا کبھی نہ ہو ممکن
وہ مرا انتخاب ہوتا ہے

اس کی بھی ہوتی ہیں کئی پرتیں
وہ جو چہرہ کتاب ہوتا ہے

ٹوٹے دل کی سنا کرو لوگو
یہ بھی کارِ ثواب ہوتا ہے

◂◂ ● ▸▸

Mahind Srigufwara
Annantnag
Jammu & Kashmir 192401
7889954338

سرورؔ جلال پوری

یہ دل جو خدشۂ سُود و زیاں میں جلتا ہے
ہے بے شعور، خدا کی اماں میں جلتا ہے
ہماری وسعتِ چشمی کی زد پہ ہے جگنو
جو آفتاب ترے آسماں میں جلتا ہے
تصورات سے جاتی ہے رہ حقیقت کی
دیا یقین کا طاقِ گماں میں جلتا ہے
ابھی بھی سینے میں امیدیں ٹمٹماتی ہیں
چراغ کوئی شکستہ مکاں میں جلتا ہے
مزاج دھوپ کا پیڑوں نے کب سے اوڑھ لیا
بدن وجود کا اب سائباں میں جلتا ہے
ترے خیال کے پھولوں سے باغ باغ ہے دل
پر ایک داغ اسی گلستاں میں جلتا ہے
مری دہکتی جبیں مسئلہ نہیں ہے طبیب !
جگر یہ ہجر کے آتش فشاں میں جلتا ہے
مری طرح سے ہی سرورؔ نے لو لگائی تھی
جبھی تو موم کی صورت جہاں میں جلتا ہے

◂◂ ● ▸▸

Assistant Prof. (Urdu)
HS College Madhepura

● **خراجِ عقیدت**

● **صفدر امام قادری**

شمس الرحمٰن فاروقی اور ہماری نسل

شمس الرحمٰن فاروقی کی وفات بے شک اردو تنقید کے لیے ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ اپنی گوناگوں علمی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہمیں یاد آتے رہیں گے۔

۱۹۸۰ء کے بعد کی ہماری نسل نے شعر و ادب میں جب اپنے بال و پَر پھیلائے اس وقت سے کافی پہلے سیّد احتشام حسین رخصت ہو چکے تھے۔ کلیم الدین احمد کی وفات ابھی ابھی ہوئی تھی۔ آلِ احمد سرور البتّہ زندہ تھے مگر تنقید نگار کی حیثیت سے ان کی سرگرمیاں محدود تھیں اور اب وہ سکّۂ رائج الوقت تو ہرگز نہیں تھے۔ جدیدیوں کا زور کم ہونے لگا تھا اور علامتی کہانیوں سے ایک عالَم اُکتا رہا تھا۔ 'شب خون' کی اشاعت میں بھی باقاعدگی کم ہونے لگی تھی اور جدید شعراء یا نقّاد یہ سمجھنے لگے تھے کہ ادب میں کچھ نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اسی زمانے میں شمس الرحمان فاروقی کی 'شعرِ شور انگیز' کی قسطیں شایع ہونا شروع ہوئیں۔ 'زبان و ادب' سے لے کر 'جواز' تک 'شب خون' میں 'تفہیمِ غالب' کے حوالے سے ایک مدّت سے فاروقی غالب کے اشعار کی تشریحات کر رہے تھے مگر کم لوگوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جدیدیت کا نظریہ ساز نقّاد کلاسیکی موضوعات کے اِرد گرد اس اہتمام سے سامنے آئے گا۔ اس وقت تک شمس الرحمان فاروقی جدیدیت کے سکّہ بند نقّاد کی طرح نظر آتے تھے اور علامت، استعارہ اور ابہام کے دائرے میں ادب کو سمجھنے کی تبلیغ کر رہے تھے۔ تعجب کی یہ بات ضرور تھی کہ آخر وہ کس طرح ادب کے قدیم ٹھکانوں کو اپنے لیے اس اہتمام سے افہام و تفہیم کا حصّہ بنائیں گے؟

فاروقی نے مرتے دم تک جدیدیت کے زوال یا کم از کم اردو میں جدید ادب کے زور کے تھمنے کا کبھی اقرار نہیں کیا مگر عملی طَور پر 'شعرِ شور انگیز' ایک نئے فاروقی کی شناخت کے ابتدائی حوالے کے طَور پر سامنے آنے والی شَے تھی۔ میر کا انتخاب اور اُن کے اشعار کی تعبیر و تشریح کا کام وہ دل لگا کر اتنے دنوں تک کر پائیں گے، یہ کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ فاروقی نے صرف چار جلدیں نہیں تیار کیں، آنے والے وقت میں وہ ان جلدوں کے مواد کی تصحیح، ترمیم و اضافہ اور تفہیمِ نَو میں مبتلا رہے اور اپنے کارناموں کی وجہ سے اردو کے بجا طَور پر سب سے بڑے میر

شناس کا تمغہ حاصل کرنے کے حق دار ہوئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ میر کے سلسلے سے انھوں نے کوئی ٹھوس تحقیقی کام انجام نہیں دیا بلکہ شعر فہمی کی بنیاد پر ہی اس مقام تک وہ پہنچے۔ کہاں وہ محمد علوی، عادل منصوری، اور ظفر اقبال کے اچھے اور بُرے اشعار کے نئے نئے معنی پیش کر کے جدیدیت کا ڈنکا بجا رہے تھے مگر وقت رہتے انھوں نے ادب کی نئی راہ اپنے لیے منتخب کی اور اس پر مکمل دل جمعی کے ساتھ آگے بڑھنے میں کامیاب ہوئے۔

ہماری نسل کو ابتدائی موڑ پر ہی ایک ایسے فاروقی ملے جو تحریکی اور تنظیمی سطح پر نئے اور عجیب وغریب اصول وضوابط کی وکالت کے لیے شہرت یافتہ ہو مگر کلاسیکی ادب کو سنجیدگی سے پڑھنے کا ثبوت بھی فراہم کر رہا ہو۔ اوّلاً فاروقی کی شخصیت دولخت نظر آئی مگر آنے والی دہائیوں میں یہ بات سمجھ میں آئی کہ ادب میں نئی قدروں کی آمد کے موقعے سے پُرانے تحریک کاروں کو خاموشی سے اسی طرح نئے میدانوں کی سَیر کے لیے نکل جانے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ فاروقی اپنے بزرگ ترقی پسندوں کی ادبی طَور پر ناکامیوں کو دیکھ چکے تھے اور جیتے جی بے معنی ہونے کی رُسوائی میں مُبتلا لوگوں سے سبق حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

نقّاد کی حیثیت سے ۱۹۸۰ء کے بعد جب شمس الرحمان فاروقی اُبھر کر سامنے آتے ہیں، اس وقت بہ راہِ راست اُن کا کوئی مقابل تنقید نگار نہیں تھا۔ بزرگوں میں آلِ احمد سرور ضرور تھے مگر اب وہ اردو کے تنقیدی حاشیے تک پہنچ چکے تھے اور یہ بھی یاد رہے کہ فاروقی انھیں اپنا مُربّی تسلیم کرنے لگے تھے۔ دوسرے جدیدی نقادوں میں وارث علوی، شمیم حنفی، فضیل جعفری اور وہاب اشرفی میدان میں تھے مگر تحریکی شناخت کی قیادت فاروقی کے ہاتھ میں تھی۔ گوپی چند نارنگ تصنیف وتالیف کے مقابلے تنظیم، اساتذۂ اردو کی چپقلش اور ادبی اختیار کے کھیل تماشوں میں زیادہ مُبتلا تھے۔ کم از کم دو دہائیوں تک وہ نقّاد کی حیثیت سے اپنی تحریروں سے بہت حد تک غافل رہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے توسّط سے ان کا دبدبہ تو بڑھا مگر بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں شمس الرحمان فاروقی کو یہ کھُلا میدان مِلا کہ وہ آزادانہ طَور پر اپنے علمی کمالات پیش کر سکیں اور خود کو بڑے نقّاد کے طَور پر ثابت کر سکیں۔

اس دوران شمس الرحمان فاروقی ادب کے نئے میدانوں کی طرف توجّہ بڑھائی۔ جدیدیت کے تحریکی موضوعات سے رفتہ رفتہ غیر متعلّقہ طَور پر وہ تو کنارہ کش ہو ہی چکے تھے، اب وہ ادب کے دوسرے گہرے امور کی طرف بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ بڑھنے لگے۔ میر اور غالب کے ساتھ انھوں نے داستانوں کی طرف قدم بڑھائے۔ داستان کی شعریات اور ان کے لسانی اور تہذیبی دائرۂ عمل کو سمجھنے کی کوشش کی، لغت نویسی اور تاریخِ ادبِ اردو کے حلقے میں پہنچے۔ یہ کون سوچ سکتا تھا کہ علامت، استعارہ اور ابہام کی تسبیح پڑھنے والا شخص ان کلاسیکی بند دروازوں پر نہ صرف دستکیں دے گا بلکہ اپنی علمی مہارت کا بھی وہ ثبوت فراہم کرے گا۔ فاروقی نے اپنے کَس بَل سے یہ ثابت کیا کہ ان کے یہاں رفتہ رفتہ مطالعے میں وسعت اور کِس قدر گہرائی آ چکی ہے۔ دیکھتے دیکھتے اب ان کا کوئی ہم عصر ایسا نہیں تھا جس کے یہاں اس انداز کی

وسعت اور گہرائی ایک ساتھ دیکھنے کو ملتی ہو۔

پھر ہم نے اچانک 'شب خون' میں عمر شیخ مرزا اور بنی مادھو رُسوا کے نام سے کچھ افسانے دیکھے۔ اگلے شماروں میں خطوط میں بہ جا طَور پر لوگوں نے یقینی طَور پر یہ لکھ دیا کہ یہ سب فرضی نام ہیں اور یہ افسانے شمس الرحمان فاروقی کے قلم سے ہی نکلے ہیں۔ فاروقی اس سے پہلے نظم، غزل اور رُباعی کے حوالے سے ابتدائی دور سے ہی تخلیقی ادب پیش کر رہے تھے مگر سچّی بات یہ ہے کہ جدید شاعروں میں انھیں بہ مشکل یا مروّتاً ہی کوئی شمار کرتا تھا۔ پھر فاروقی کا افسانوی مجموعہ شایع ہوا اور 'قبضِ زماں' کے بعد جب 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' چھپ کر سامنے آیا تو افسانہ نگار سے فاروقی ناول نگار بن گئے۔ وہ ناول ترجمہ ہو کر ہندی اور انگریزی میں بھی سامنے آیا اور نفسِ مضمون اور قدرتِ بیان دونوں اسباب سے فاروقی ہمارے عظیم ناول نگاروں کی صف کے تازہ واردوں میں کامیابی کے ساتھ شامل ہو گئے۔

آج تنقید، تحقیق، ترتیب وتدوین، افسانہ نگاری، ناول نگاری، ترجمہ، ادبی رسالے کی ادارت وغیرہ الگ الگ محاذ پر فاروقی ہماری زبان کے سب سے بڑے عالموں میں سے ایک ہیں۔ تاریخِ ادبِ اردو کے سلسلے سے فاروقی نے انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی جس کو خود انھوں نے 'اردو کا ابتدائی زمانہ' کے عنوان سے شایع کیا۔ توجّہ دیں تو اختصار کے ساتھ اردو میں تاریخ ادب کی ایسی سنجیدہ کتاب کوئی دوسری نہیں۔ جمیل جالبی چار دہائیوں تک اس موضوع پر کام کرتے رہے مگر بعض گتھّیاں جو فاروقی نے ہمیں سمجھا دیں، ان تک کسی کی نگاہ بھی نہیں گئی تھی۔ بڑے بڑے عالم تاریخِ ادب کے میدان میں بَونے ثابت ہوتے ہیں مگر فاروقی تاریخِ ادبِ اردو اور لغات و روزمرّہ کے میدان میں بھی اُسی طرح کامیاب رہے جیسے جدید ادب اور میر یا غالب یا داستانوں پر اپنی قدرت ثابت کر چکے تھے۔ ان تمام مہارتوں میں فاروقی کا اردو تنقید کے میدان میں کہیں کوئی مقابل نہیں رہا اور وہ اپنی کتابوں کی جِلد در جِلد ترتیب واراشاعت اور اپنی شب بے داریوں کا صفحہ در صفحہ نتیجہ پیش کرتے رہے۔ فاروقی کی وفات پر تاثّرات کا اظہار کرتے ہوئے کسی نے بڑا درست جملہ کہا کہ وہ چھیاسی (۸۶) برسوں میں دوسو (۲۰۰) برس زیادہ مدّت کا علمی کارنامہ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔

فاروقی چوں کہ جدیدیت کی تعبیر وتشریح اور اس کی قیادت سے ہماری زبان میں داخل ہوئے تھے، اس وجہ سے اُن کی تنقید میں بہت دور تک ایک عدم توازن اور کجی نظر آتی رہی۔ 'فاروقی کے تبصرے' پڑھیے اور ترقّی پسندوں کی ناکامیوں پر ان کے علمی حملے پر غور کیجیے کہ کس طرح انھوں نے اپنے بزرگ لکھنے والوں کی دھجیاں اُڑائیں اور اپنی نسل کے نَو آموزوں کے لیے جگہ بنائی۔ فاروقی کی تحریکی تحریریں بڑی تعداد میں ہیں۔ عادل منصوری، ظفر اقبال، محمد علوی اور احمد مشتاق یا قمر احسن وغیرہ کے سلسلے سے ان کے جو مضامین شایع ہوئے ان کا سختی سے احتساب اب تک نہیں ہوا ہے۔ فاروقی نے جس طرح ترقّی پسندوں کی تحریروں کا اپنے ابتدائی دور میں احتساب کیا تھا، اگر اُسی انداز سے اُن کی مذکورہ تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ یہاں ادب

فہمی کے مقابلے میں اپنے ادبی کنبے کی پرورش و پرداخت کا مادّہ زیادہ ہے۔ نقّاد کی حیثیت سے شمس الرحمان فاروقی کی سب سے بڑی حد یہی ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ان کے زمانے کے لوگوں نے لکھنا کم کیا یا اپنے تخلیقی مزاج میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوئے، جو لوگ یہ بات نہیں سمجھ سکے ان کا وجود اپنے وزن و وقار سے محروم ہوا۔

فاروقی کی تحریکی حیثیت کو ان کے دیگر علمی کاموں اور کلاسیکی موضوعات کی مہارت نے متوازن کر دیا۔ اکیسویں صدی کے طالبِ علم تو شاید یہ یاد بھی نہیں کریں کہ شمس الرحمان فاروقی جدید ادب کے پُر جوش تحریک کار تھے اور اُس زمانے کے ان کے بیانات کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اب کے پڑھنے والے یہ تعجب بھی کریں گے کہ کس ذہنی رَو میں فاروقی نے وہ باتیں کی ہوں گی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فاروقی کا مزاج کم و بیش اس پہلی محبت کے دائرے میں ہی صیقل ہوا۔ جدیدیوں کے بعد جو نسل سامنے آئی فاروقی ان کی شناخت اور قدر شناسی کے سلسلے سے اتنے سنجیدہ نہیں رہے۔ اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں جدیدیت کی وہ سرخیلی ہی کام کر رہی تھی۔ نقّاد کے طور پر یہ بھی ان کی ایک حد ہے۔

فاروقی نے رفتہ رفتہ اپنی علمی حیثیت بڑھائی۔ طرح طرح کے ادبی اور علمی کاموں میں منہمک رہے اور خود کو ایک ایسے عالم کے طور پر ثابت کرنے میں کامیاب رہے جو اپنی زبان کی بہ جا طور پر نمایندگی کر سکتا ہو۔ انھیں جب سرسوتی سمّان دیا گیا، اس وقت اختر الایمان اور قرّۃ العین حیدر موجود تھے مگر بعد کے پچیّس برسوں میں فاروقی نے ثابت کیا کہ اپنی زبان کے سب سے بڑے لکھنے والوں میں گِنے جا سکتے ہیں۔ فاروقی نے ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں اپنا وقت لگایا۔ پوسٹل انتظامیہ میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے ادب سے ہی پہلی محبت کا سلسلہ رکھا۔ اُتّر پردیش اردو اکادمی، قومی اردو کونسل اور ترقی اردو بیورو میں بھی وہ انتظامیہ کا حصّہ رہے مگر ہر جگہ خود کو علمی کاموں میں منہمک رکھا۔ اب جب ان کی شدید بیماریوں کی خبر آنے لگی تو یہ باتیں بھی سامنے آئیں کہ کئی نئے علمی سوالات میں وہ سرگرداں تھے۔ ایک عالم کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ہزار منصوبے بنائے، سَو کام کرے اور ملک الموت کی آمد تک خود کو مبتلائے علم رکھے۔ فاروقی کی زندگی اس کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ محمد حسین آزاد دیوانگی میں بھی لکھتے رہے، ذکاء اللہ اور راشد الخیری زندگی کے آخری لمحے تک سرگرمِ تصنیف رہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فاروقی کے ادھورے کام بھی سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں اور وہ سب بھی منظرِ عام پر آئیں گے۔ ایک عالم کی ایسی ہی زندگی ہوتی ہے اور ایسی ہی موت ہوتی ہے۔ ہمارے لیے شمس الرحمان فاروقی علمی تحریک اور معیار کی ضمانت تھے۔ بے شک ہم عہدِ فاروقی میں جی رہے تھے جو ۲۵ر دسمبر کو اختتام پذیر ہوا۔ کورونا کی وبا دنیا میں بہت کچھ لوٹ چکی ہے مگر اردو والوں کا تو تن بدن چھلنی کر گئی۔ اس نے تو ہمارا سردار ہی چھین لیا: 'حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'۔

◂◂ ● ▸▸

202-Abu Plaza
N I T More Ashok Rajpath
Patna-800006 9430466321

● ڈاکٹر ارشد جمیل

شمس الرحمٰن فاروقی کی ترجمہ نگاری

ترجمہ چوں کہ دوسری زبان سے ماخوذ ہوتا ہے اس لیے اس میں ایک حد تک اجنبیت کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس اجنبیت کے احساس کے سبب ہی طبع زاد کے مقابلے ترجمہ کو ثانوی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن دوسرے فنون کی طرح ترجمہ نگاری بھی ایک فن ہے اور ادب میں اس کی حیثیت مسلم ہے۔ ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کے بغیر دوسری زبانوں کے علوم و فنون سے آشنائی نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے بغیر کوئی بھی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ ترجمہ ہی وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے ایک قوم دوسری قوم کے ذخیرہ علم و ادب سے آشنا ہوتی رہی ہے۔

ترجمہ کی تعریف مختلف اصحاب فن نے مختلف انداز سے کی ہے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اس کی تعبیر پیش کرنا ہی ترجمہ کا فن ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک علمی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے گو کہ ترجمہ کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ ترجمہ نگاری کا عمل ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ اصل متن کی داخلی ساخت، آہنگ و اسالیب کو برقرار رکھتے ہوئے اسے دوسری زبان میں منتقل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے ترجمہ کے فن کو ایک پیچیدہ اور پر اسرار فن بھی قرار دیا گیا ہے۔

عہد حاضر میں آمد و رفت میں وسعت اور سرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط و اختلاط بڑھتا جا رہا ہے اور اس لیے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوششیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ دوسرے علوم و فنون سے استفادہ کرنے کی ایک صورت ترجمہ بھی ہے، زبان کے پھلنے پھولنے میں بھی ترجمہ اہم رول ادا کرتا ہے۔ ترجمے کے ذریعہ ہی ہمیں ایک دوسرے کے طور طریقے، مذہب، ادب اور تہذیب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ انسانی تہذیب کی ترقی میں ترجمہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس لیے قوموں اور زبانوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور ربط و ضوابط کی راہیں کھولنے کے لیے ترجمے کی ہی مدد لی جاتی ہے۔ ترجمے کے ذریعے نہ صرف الفاظ اور زبان کی نشو نما میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علوم و فنون میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے نئے نئے اسالیب بیان ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ذخیرۂ ادب سے آشنائی ہوتی ہے۔ بطور فن ہم بھلے

ہی ترجمے کو طبع زاد کے مقابلے کمتر سمجھتے ہوں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترجمے نے کچھ ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں، جو طبع زاد تصنیفات بھی نہیں دے سکتی تھیں، چند مثالیں تو ایسی بھی ہیں جنہیں ترجمے کے ذریعے ہی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اور اس طبع زاد تصنیف کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ترجمے کی بے شمار مشکلات ہیں اور اس کے مسائل کا احساس ہر کسی کو نہیں ہو پاتا ان مشکلات و مسائل کا اندازہ انھیں کو بخوبی ہوسکتا ہے جنھوں نے سنجیدگی اور انہماک سے اردو میں دوسری زبانوں کی تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے، ترجمہ کے سلسلے میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آتی ہیں۔ ادبی ترجمے میں زیادہ مشکل شعری اصطلاحات کے ذیل میں آتی ہیں، کسی غیر زبان کی شاعری کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش اس طرح کی جائے کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کے فنی مزاج اور مخصوص ادبی محاسن سے مرتب ہونے والی فضا بھی برقرار رہے اور ترجمے کے الفاظ سے بھی ویسا ہی اثر مترشح ہو جیسا اس زبان کی شاعری سے ہوتا ہے۔

ادبی ترجموں کی افادیت میں ترجمے کی نوعیت اور اس کے معیار کا بڑا دخل ہوتا ہے، اور اس کا تمام تر انحصار مترجم کی ذہنی و فکری صلاحیت نیز علمی و ادبی استعداد پر ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر دسترس رکھتا ہو۔ اصل تصنیف کی زبان اس کے ادب اور اس کی قومی تہذیب سے پوری طرح واقف ہو۔ مترجم کو اس بنا پر دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام بھی دیا گیا ہے۔ مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسری زبان میں پیش کردہ خیالات سے واقف ہو نیز الفاظ تراکیب اور اصطلاحیں وضع کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ مترجم کو دونوں زبانوں کے ادبی سرمائے اور اس کے مخصوص مزاج سے کماحقہ واقفیت ہونی چاہیے۔ اس میں ادبی قدروں کا بھی ادراک ہونا چاہئے اور ان تمام مسائل پر بھی اس کی نظر ہونی چاہئے جو ادب میں رونما ہوئے ہیں۔ ادب کے سماجی، ثقافتی، اور عمرانی رشتوں کا شعور بھی ایک مترجم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے الفاظ محاورے اور تراکیب پر اپنی گہری نظر رکھے کیوں کہ ایک کامیاب ترجمہ نگار ترجمہ کے عمل میں وہ مصنف کے مطمح نظر کو واضح کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کرتا ہے، جو تراکیب وضع کرتا ہے، جو پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے وہ اصل تخلیق کے مطابق ہوتے ہوئے بھی انفرادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور مترجم کی خلاقانہ کاوش پر دلالت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ترجمہ نگار کو بیک وقت دوہری ذمے داری سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو اس سے ادب کی زبان پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ ترجمے کی زبان پر وسیع مہارت حاصل کرنے کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ ترجمے کا عمل بہت نازک مشکل اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ کام بہت ذمے داری اور دیانت داری کا متقاضی ہوتا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کرنے کے لیے دونوں زبانوں کی

باریکیوں پر مکمل دسترس کے ساتھ محاوروں استعاروں اور تمثیلات سے بھی واقفیت درکار ہوتی ہے۔ مترجم کے لیے ترجمہ میں جن اوصاف اور شرائط کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہ سب فاروقی میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کو انگریزی، فارسی اور ہندی و اردو پر تو عبور حاصل ہے ہی ساتھ ہی فرانسیسی اور عربی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ ان زبانوں سے براہ راست واقفیت کی وجہ سے انہوں نے ان کے ادب، تہذیب، شاعری، تنقید اور فکشن کا کماحقہ مطالعہ کیا ہے اور ان سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے انگریزی زبان سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں بے شمار ترجمے کیے ہیں۔ فاروقی نے اپنے تعلیمی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی اپنے افسانوں کے انگریزی میں ترجمے کیے۔ ان کا ابتدائی افسانہ ''دلدل سے باہر'' ۱۹۵۰ء میں میرٹھ کے رسالہ ''معیار'' میں چھپا تھا۔ اس کے بعد ''سرخ آندھی'' لکھا جو سویت یونین میں مذہب پر استبداد کے بارے میں تھا۔ جس کا بذات خود فاروقی نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مگر وہ اردو افسانہ اور اس کا انگریزی ترجمہ ان کے پاس اب محفوظ نہیں رہا، جس کے متعلق وہ رقم طراز ہیں۔

> ''اردو میں وہ افسانہ کہاں چھپا مجھے یاد نہیں..... میں نے جھٹ پٹ ترجمہ کر کے افسانے کا انگریزی عنوان (The Scarlet Tempest) رکھا۔ ٹائپ وغیرہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ ہاتھ سے لکھ لکھا کر میں نے افسانہ ان کے حوالے کیا اور میری توقع کے بالکل خلاف انہوں نے بھی پسند کیا اور اسی عنوان سے چھاپ دیا..... بہر حال اب میرے پاس اس افسانے کا نہ اردو مسودہ ہے نہ انگریزی اور نہ الہ آباد یونیورسٹی میگزین کا وہ شمارہ جس میں The scarlet tempest چھپا تھا''۔[۱]

مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ انہوں نے شب خون میں بہت سے اردو افسانوں کے تراجم اپنے قلمی ناموں سے شائع کیا۔ جس کے بابت وہ خود تحریر کرتے ہیں۔

> ''شب خون کا پہلا شمارہ بابت ماہ جون ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا۔ یہ مئی ۱۹۶۶ء کا وسط تھا، پہلی ہی شمارے میں کئی چیزیں میں نے ایسی شامل کیں جو لکھی تو میں نے ہی تھیں، لیکن ان پر نام کچھ اور تھا۔ ان میں ایک نام ''شہرزاد'' بھی تھا۔ جسے ایک بھیانک افسانے (Terror story) کے مترجم اور بھیانک افسانے پر ایک تنقیدی نوٹ کے مصنف کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ شہرزاد کے بہت سے تراجم ''شب خون'' میں شائع ہوئے اور مقبول ہوئے۔ پھر ایک آدھ طبع

زاد افسانہ میں نے جاوید جمیل کے نام سے شب خون ہی میں لکھا.....لیکن پھر بھی معاملہ زیادہ تر افسانوں اور ڈراموں کے تراجم تک محدود رہا۔''۲

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاروقی نے جب شب خون نکالنا شروع کیا تو اس میں انہوں نے کئی افسانے انگریزی سے ترجمہ کر کے ''جاوید جمیل'' کے نام سے شائع کیا۔

فاروقی اعلیٰ درجے کے مترجم ہیں۔ترجمہ نگاری ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔الہ آباد میں ان کے ذاتی کتب خانے میں گفتگو کے دوران راقم نے ان سے پوچھا کہ اپنی تحریر کو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا تجربہ کیسا رہا۔کہنے لگے ''اپنی تحریر کو ترجمہ کرنے میں آزادی ہوجاتی ہے، کسی دوسرے کے فکشن کو ترجمہ کریں تو متن سے وفادار اور اس کا احترام کرنا پڑتا ہے۔متن میرا اپنا ہے تو مجھے آزادی ہے کہ اگر کوئی اردو کا لفظ انگریزی میں کہیں آ ہی نہیں رہا ہے یا انگریزی کے آہنگ میں فٹ نہیں بیٹھ رہا تو میں کچھ اور لکھ سکتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ مافی الضمیر کیا ہے''۔ان کے ترجمے کے بارے میں شکایت ہوئی کہ انگریزی پرانی اور مشکل ہے۔اردو میں جس عہد کا بیان ہے اس کا آج کی انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوسکتا تھا۔اس ذائقے کو برقرار رکھنے کے لیے جدید انگریزی تقاضے پورے نہیں کرسکتی تھی۔ترجمے میں کیا سب کچھ منتقل ہوگیا یا پھر کہیں اصل کو قربان بھی کرنا پڑا؟ یا ترجمہ میں کہیں مشکل پیش آئی؟ آپ نے اپنی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیوں کیا؟ان تمام سوالات کے جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے میں انگریزی میں لکھنے کا بہت شوقین تھا۔البتہ میں اپنے آپ کو انگریزی سے زیادہ اردو کا ادیب سمجھتا ہوں۔اپنے مداحوں کے اصرار پر اور کوئی انگریزی مترجم موجود نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہی اپنی تصانیف کے تراجم کا کام کرنا پڑا۔ترجمے کے کام میں محنت تو بہت ہے،لیکن لفظوں میں بچپن سے دلچسپی ہے جہاں نیا لفظ سنا کان کھڑے ہوگئے۔انگریزی پڑھی بہت ہے اس لیے مجھے پرانے الفاظ یاد تھے اس لیے زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑا البتہ ناول کے ترجمے میں جزئیات اور پروٹوکول سب آ گئے۔فارسیت اس کی قربان کرنی پڑی۔عورتوں کی زبان قربان کرنی پڑی ترجمے میں کوئی ایسی مشکل نہیں پیش آئی۔

فاروقی نے اچھے اور بامحاورہ ترجمے کے لیے اپنے مضمون (Some aspectes the theory of Translation) میں چند اصول وضع کیے ہیں۔جس پر سختی سے وہ کاربند رہتے ہیں۔اور ترجمہ نگاروں کو بھی انہیں باتوں پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔انہوں نے نظم ونثر دونوں ہی میں مختلف زبانوں سے براہ راست یا بالواسطہ ترجمے کیے ہیں۔ثبوت کے طور پر ان کا یہ بیان حاضر ہے۔

''پھر ایک دن وہ آیا جب میں نے اپنی بیاض پھاڑ کر پھینک دی۔اور شعر

گوئی کی جگہ شعر کا ترجمہ کرنے کو اپنا طرز قرار دیا.....انگریزی کی بہت سی شاعری پڑھتے، کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے اور اس سے بہت متاثر ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دل میں ترجمے کی ہوک اٹھی۔لہٰذا میں نے آؤن ایلیٹ اور ان کے علاوہ کئی چھوٹے موٹے شعرا کے نثری ترجمے شروع کر دیے.....مجھے اب تک یاد ہے کہ آؤن کی ایک نظم (Its no use Raising a shout) کا نثری ترجمہ مجھے بہت اچھا لگا تھا کیونکہ میں نے اپنے خیال میں آؤن کی نظم کی کمزوری اور کلباتی (Cyrical) لیکن ایک حد تک المناک آواز اپنے نثری آہنگ میں حاصل کر لی تھی۔''۳

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاروقی نے محض تفنن طبع کی خاطر ترجمہ نگاری شروع کی تھی۔لیکن ایسا نہیں ہے رفتہ رفتہ وہ پوری توجہ کے ساتھ ترجمہ کرنے لگے انہوں نے اس فن میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے لیے مغربی ادیبوں سے بھی استفادہ کیا جیسا کہ اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں۔

''ترجمے کے بارے میں سوالات اور مسائل کا گہرا تعلق زبان کی اصل اور نوعیت کے بارے میں سوالات سے ہے۔اگر کوئی ایسی واحد قدیمی زبان نہیں تھی جسے ہم ''امّ الآمنہ'' کہہ سکیں اور اگر ہر زبان اپنی جگہ بے عدیل و بے نظیر ہے تب تو ترجمہ نا ممکن ہے چونکہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی نہ کسی طرح کا ترجمہ ممکن ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کبھی کوئی قدیمی، آفاقی امّ الآمنہ تھی جس نے اپنے نشان بعد کی تمام زبان میں چھوڑے ہیں اور اسی باعث یہ ممکن ہوسکا کہ انسان اپنے تجربات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔اور اپنے خیالات کی ترسیل دوسروں تک کر سکتے ہیں۔''۴

فاروقی نے براہ راست انگریزی زبان سے یا بالواسطہ کسی اور غیر ملکی زبان سے اردو میں جو ترجمے کیے ہیں ان کی تعداد خاصی ہے جیسا کہ ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں اور مضامین کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے۔جہاں تک نثری تراجم کا سوال ہے ان کے بھی کافی نمونے موجود ہیں۔آیئے اب ہم فاروقی کے قلم سے ہوئے ترجمے کی عملی شکل پر بھی نظر ڈالیں یہ نمونہ ارسطو کی شعریات سے (Potics) ماخوذ ہے۔جس کا عنوان ہے (رزمیہ، حصہ دوم) ارسطو کہتا ہے۔

''ہومر تمام پہلوؤں سے قابل ستائش ہے لیکن اس کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ تنہا اس بات کا نکتہ شناس ہے کہ شاعر کی حیثیت سے خود اسے نظم میں کتنا حصہ لینا چاہئے، شاعر کو چاہئے کہ وہ اپنی شخصیت اور آواز میں کم سے کم کلام کرے کیونکہ

اپنی آواز میں گفتگو کر کے کوئی شخص نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔'' ۵

ارسطو کی (Poetics) مشہور زمانہ کتاب کا آج سے چالیس سال قبل فاروقی نے اردو میں شعریات کے عنوان سے عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ فاروقی نے جو ترجمہ کیا ہے ان پر ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد کا گمان ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے ترجمہ کرنے میں معنی کی رعایت کے ساتھ لفظی رعایت کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ ترجمے میں انہوں نے جہاں ضروری سمجھا اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اور کہیں کہیں مفید حواشی بھی لکھ دیا ہے وہ خود رقم کرتے ہیں۔

''میرا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ترجمہ حتیٰ الامکان لفظاً اور معناً دونوں طرح اصل سے قریب رہے چنانچہ میں نے زیر نظر رسالے میں بھی نہ تو محض خیال کو اپنے لفظوں میں ڈھال دیا ہے اور نہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے بلکہ ترجمہ اور ترجمانی دونوں کی کوشش کی ہے۔'' ۶

ارسطو کی کتاب بوطیقا کا جس اعلیٰ درجے کا ترجمہ فاروقی نے کر دیا آج تک اس کے کسی ایک لفظ کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں اٹھ سکا۔ کیونکہ ایسی تکنیکی کتابوں کا ترجمہ، ترجمہ نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اعلیٰ پائے کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ اس میں دل و دماغ کو جس حد تک جلانا پڑتا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ ظاہر ہے جس چیز میں اتنی عرق ریزی کی جائے وہ تخلیق کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ بوطیقا ارسطو کی وہ تصنیف ہے جس کا اثر آج تک جاری و ساری ہے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ آیا موجودہ صورت میں بوطیقا ارسطو کی اپنی تصنیف ہے یا یہ ارسطو کی اصل تصنیف کا خلاصہ ہے جسے کسی اور نے کیا یا پھر یہ وہ اشارات ہیں جنہیں ارسطو کے خطبات کے دوران کسی شاگرد نے اپنی یادداشت کے لیے قلمبند کر لیا ہو۔ بوطیقا کا پہلا باقاعدہ تنقیدی ایڈیشن روبورٹیلی نے ۱۵۴۸ء میں مرتب و شائع کیا۔

بوطیقا میں اظہار کی وہ وحدت نہیں ملتی جو ارسطو کی دوسری تصانیف کا طرۂ امتیاز ہیں لیکن اس میں فن شاعری کا ایک مکمل و مربوط نظریہ موجود ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ارسطو نے بوطیقا میں اپنے استاد افلاطون کا نام لیے بغیر نہ صرف فن شاعری کا جواز پیش کیا ہے بلکہ افلاطون کے اس دعوے کو بھی باطل قرار دیا ہے جس میں اس نے شاعروں کو اپنی مثالی ریاست سے نکال باہر کیا تھا۔ افلاطون نے ڈرامے کے اثرات پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈراما ذہن انسانی کو مضمحل اور کمزور کر دیتا ہے اور انتشار کا اثر پیدا کرتا ہے۔ ارسطو نے کہا یہ اثرات دراصل ذہنی صحت کے لیے نہایت شفا بخش ہیں۔ ڈراما اور شاعری دراصل ذہن انسانی کا کتھارسیس کرتے ہیں۔ کتھارسیس کی بوطیقا میں وضاحت کی گئی ہے۔ ٹریجڈی کا مقصد روح کا تزکیہ ہے۔ ٹریجڈی کے واقعات روح کو برانگیختہ کر کے دہشت اور رحم کے جذبات کو ایسے مقام پر لے آتے

ہیں کہ وہ نہ صرف تھک کر ختم ہو جاتے ہیں بلکہ امید اور ہمت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے شاعری کی ہمیشہ ضرورت رہے گی لیکن اس کے باوجود بوطیقا کوئی جوابی تصنیف نہیں ہے اس میں جو ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ پوری تصنیف ہم تک نہیں پہنچی۔ خصوصیت کے ساتھ وہ حصہ جس میں کامیڈی کے بارے میں ارسطو نے اظہار خیال کیا تھا، جبکہ بوطیقا میں ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ کامیڈی کے بارے میں بعد میں بات کروں گا۔ بوطیقا کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شعر و ادب کے بارے میں اس نے کچھ اور بھی لکھا تھا۔ ارسطو نے نقل، نیچر، شاعری کی اصل، شاعری کی اقسام، ٹریجڈی کے اصول وغیرہ پر بحث کی ہے اور شاعری کا ایک آفاقی نظریہ پیش کیا ہے۔

نقل فن جمالیات کی ایک بنیادی اصطلاح ہے۔ ارسطو اس لفظ کا اطلاق شاعری پر کرتا ہے پروفیسر بوچر کے الفاظ میں ارسطو کے ہاں نقل کا مطلب ہے حقیقی خیال کے مطابق پیدا کرنا، تخلیقی کرنا اور خیال کے معنی ہیں اشیاء کی اصل جو عالم کی مثال میں موجود ہے، جس کی ناقص نقلیں اس دنیا میں نظر آتی ہیں۔ عالم حواس کی ہر شے عالم مثال کی نقل ہے۔ ارسطو کے نزدیک انسان حواس کے ذریعہ کسی شے کا ادراک کرتا ہے۔ ہر شے کے اندر ایک مثالی ہیئت موجود ہے لیکن خود اس شے سے اس ہیئت کا ادھورا اور نامکمل اظہار ہوتا ہے۔ یہ ہیئت فنکار کے ذہن پر حسی شکل میں اثر انداز ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے بھرپور اظہار کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس عالم مثال کو سامنے لاتا ہے جو دنیائے رنگ و بو میں نامکمل طور پر ظاہر ہوا ہے۔ حواس کے ذریعہ جس دنیا کو محسوس کیا جاتا ہے وہ اصل حقیقت کے نامکمل اور ادھورے مظاہر ہیں۔ طبعی دنیا کی مختلف شکلیں جدائی اور مثالی شکلوں کی نقلیں تھیں، جنہیں اس مادی دنیا میں ہونے والے حادثات نے مسخ کر دیا ہے۔ فلسفی کا کام یہ ہے کہ وہ ان اتفاقی اور مسخ شدہ شکلوں کے اندر ''اصل حقیقت'' کو دریافت کرے اور ان قوتوں کو تلاش کرے جو ساری ہستی کا سبب ہیں اور اسے حرکت میں لاتے ہیں۔ یہی کام شاعر کا ہے۔ ارسطو کے اس ''شاعرانہ نقل'' کے نظریے نے شاعر کو فلسفہ کے اعلیٰ منصب میں ایک اہم مقام عطا کر دیا ہے اس نظریے کے مطابق نقل تخلیقی عمل ہے۔

بوطیقا کے ترجمے کے ذریعہ غالباً لاشعوری طور پر فاروقی نے کلاسیکی ادب اور اس کے لیے مروج تنقید کی نشاندہی آج سے چالیس سال پہلے کر دی تھی کہ آگے جا کر انھیں بھی تنقیدی فکر کو اپنانا پڑے گا۔ اور وہ اس کے سب سے بڑے راوی کے ساتھ ساتھ مفسر بھی بن کر ابھریں گے۔ میں نے جہاں فاروقی کی بحیثیت مترجم ہونے کا تذکرہ کیا ہے وہیں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ انہوں نے انگریزی میں اردو سے زیادہ، اردو سے انگریزی میں ترجمے کیے ہیں اور بہت سے اپنے تنقیدی مضامین براہ راست انگریزی میں بھی لکھے ہیں۔ پوری دنیا کو کما حقہ اردو ادب اور شاعری سے متعارف کرانے کے لیے شاید فاروقی سے پہلے کوئی

ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو نہ صرف اردو بلکہ اردو زبان کے توسط سے دوسری زبان کے قاری کو بھی یہ سمجھا سکے کہ شعر کسے کہتے ہیں، نثر کسے کہتے ہیں اور غیر شعر کسے کہتے ہیں۔ اس ضمن میں عرض کرتا چلوں کہ آپ کی انگریزی کتاب (The Secret mirror) جدید کلاسیکی ادب پر انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اہم کتاب (Modern indian literature and anthology) تین جلدوں پر مشتمل ہے جسے ساہتیہ اکادمی نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ جس میں اردو کا حصہ فاروقی نے لکھا اور ترتیب دیا ہے۔ (The shadows of a bird in flight) کے عنوان سے فارسی کے چنندہ اشعار کا بھی فاروقی نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے کچھ کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جس میں ارسطو کی مشہور زمانہ کتاب (Poetics) کا اردو ترجمہ ''شعریات'' کے نام سے ایس ایچ بچر کی انگریزی کتاب کے متن کا اردو ترجمہ مع تفصیلی تعارف اور متوفی حواشی کے ساتھ ۱۹۷۶ء میں مکمل کیا تھا۔ جس کا تیسرا توسیع شدہ ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا اور بے حد مقبول ہوا۔

اس کے علاوہ اردو کی مشہور زمانہ کتاب ''آب حیات'' کا انگریزی ترجمہ (Ab-e-Hyat: shaping The canon of urdu literature) کے عنوان سے ادبی تاریخ اور تنقیدی اصولوں سے متعلق ترجموں پر مشتمل کتاب جو فاروقی نے کولمبیا یونیورسٹی کی پروفیسر (Frances w.pritchette) کے اشتراک سے مکمل کیا۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی نے ۲۰۰۱ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں نہ صرف اس جدید اردو نثر کی کلاسیکی اور ادبی تاریخ کا زیادہ تر حصہ انگریزی میں ترجمہ کیا بلکہ ادبی اصطلاحات کی فہرست اور شرح بھی مرتب کی ہے۔ فاروقی نے اس کتاب میں ترجمے کی معتبری کی ضمانت مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بسیط تعارف بھی لکھا ہے جبکہ ڈاکٹر پریچٹ نے اپنا تعارف لکھا ہے۔ فاروقی کی انگریزی میں ایک اور کتاب (Early urdu literary culture and history) ہے جس کا اردو ترجمہ ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' کے نام سے خود فاروقی نے کیا ہے۔ فاروقی کی فضیلت ولیاقت کا یہ شاہکار اس وقت وجود میں آیا جب شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) نے اپنے ایک ادارے (National endowments for huminities) نامی ادارے کے تعاون سے ایک وسیع وعریض منصوبہ بنایا جس کے تحت یہ طے پایا کہ ہندوستان کی سبھی بڑی زبانوں کی ادبی تہذیب، ادبی اور ثقافتی تاریخ سے ان کے رشتوں، ان کے آپسی روابط اور ادب کے بارے میں ان زبانوں میں رائج تصورات کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں فاروقی کو دعوت دی گئی کہ وہ (Early urdu) پر مضمون لکھیں۔ تین چار سال کی محنت کے نتیجے میں موصوف کا مضمون بڑھ کر ایک کتاب کی

صورت میں سامنے آیا۔ جس کا آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی نے انگریزی ترجمہ ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ جو کہ اردو میں ''اردو کا ابتدائی زمانہ، تہذیب وتاریخ کے پہلو'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس کتاب میں اردو زبان وادب سے متعلق کچھ پوشیدہ حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے، خالص علمی رنگ کی اس وقیع تصنیف میں فاروقی کا انداز واسلوب نہایت دلکش ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''پرانے زمانے میں ''اردو'' نام کی کوئی زبان نہیں تھی۔ جو لوگ ''قدیم اردو'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ لسانیاتی اور تاریخی اعتبار سے نادرست اصطلاح برتتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ''قدیم اردو'' کی اصطلاح کا استعمال آج خطرے سے خالی نہیں۔ زبان کے نام کی حیثیت سے لفظ ''اردو'' نسبتاً نوعمر ہے۔ اور یہ سوال کہ قدیم اردو کیا تھی، یا کیا ہے، ایک عرصہ ہوا تاریخ کے میدان سے باہر نکل چکا ہے۔''[۷]

فاروقی نے اردو میں کئی افسانے لکھے۔ ان کا مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' کے عنوان سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''کئی چاند تھے سر آسماں'' جیسا ضخیم ناول اور ''قبض زماں'' کے نام سے ایک ناولٹ بھی لکھا ہے۔ ان سب کی ادبی دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی۔ مترجم کی عدم دستیابی کی وجہ سے انھیں اپنی کتاب کا ترجمہ از خود ہی کرنا پڑا۔ اردو سے اپنے فکشن کو انگریزی میں منتقل کرنے کا کام بھی بذات خود انجام دیا۔ بلکہ ترجمہ کرنے پر آئے تو ناول پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے افسانوں کا ترجمہ بھی کر دیا۔ فاروقی کا اردو ناول ہی نہیں بلکہ اس کے ترجمہ نے بھی انگریزی زبان کے اہل علم وہنر سے داد وصول کی۔ انہوں نے ۲۰۱۳ء میں اپنے مشہور زمانہ ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا انگریزی ترجمہ (The mirror of beauty) کے نام سے کیا، جو پنگوئن بکس نئی دہلی سے شائع ہوا۔ کئی چاند تھے سر آسماں تاریخ، تہذیب وتمدن، شعر وادب معاشرت کے آداب، عام زندگی کی جزئیات کے سچے اور زندہ بیان کی وجہ سے آنے والی نسلوں کے لیے ایک تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اس ناول میں فاروقی نے زبان وبیان پر کافی توجہ صرف کی ہے۔ اٹھارویں انیسویں صدی کی مستعمل زبان کو ہی ناول میں جگہ دی ہے جو اس عہد میں رائج تھی۔ انھوں نے ترجمے میں خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ترجمے میں کوئی بھی ایسا لفظ نظر نہ آنے پائے جو اس دور میں رائج نہ تھا، ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا کہ حسن بیان اور طرز نگارش بھی شایان شان ہو۔ ناول میں زبان و بیان کا حسن، مکالمہ کی برجستگی، واقعات اور زبان کے ہم آہنگ ہونے کا احساس ہر صفحے پر نمایاں ہے۔ افسانوی مجموعہ ''سوار اور دوسرے

افسانے'' کا اردو سے انگریزی ترجمہ(Sun that rose from the earth) کے نام سے کیا جو ۲۰۱۳ء میں پنگوئن بکس نئی دہلی سے شائع ہوا۔

ابن صفی کو بڑے پیمانے پر انگریزی زبان کے قارئین تک پہنچانے میں بھی فاروقی کا اہم رول ہے۔ ابن صفی کے مشہور چار ناولوں، جاسوسی دنیا سیریز(Dr Dread series) کا انگریزی ترجمہ فاروقی نے کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کام آسان نہیں تھا۔ جب مجھ سے ان ناولوں کے ترجمے کے لیے رابطہ کیا گیا تو پہلی بات جو ذہن میں آئی وہ یہی تھی کہ یہ پوری طرح مقامی رنگ میں رنگے ہوئے ناول ہیں۔ ان کا شاید انگریزی زبان میں ترجمہ ممکن نہیں۔ اس میں اردو کے محاورے ہیں، اردو کے لطیفے اور ایسے حوالے ہیں جو شاید انگریزی پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے بہر حال میں نے ناولوں میں کوئی چیز بدلی نہیں۔ فاروقی کے مطابق ابن صفی کے ناولوں کا سلسلہ بھی ترجمے سے ہی شروع ہوا تھا اس وقت بازار میں جاسوسی کتابوں کے ترجمے بہت مقبول تھے اور اسی مانگ کو پورا کرنے کے لیے جاسوسی دنیا کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کا پہلا ناول کم وبیش ایک انگریزی ناول پر مبنی تھا۔ جسے ابن صفی نے مقامی رنگ میں ڈھال دیا تھا، جو بہت مقبول ہوا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اوریجنل ناول لکھے۔ عمران، فریدی اور حمید جیسے رنگا رنگ دلچسپ اور طاقتور کردار تخلیق کیے جو ہندوستان اور پاکستان میں گھر گھر مشہور ہوئے۔ اگر چہ کہ ابن صفی تقسیم کے بعد کراچی چلے گئے تھے لیکن ہندوستان میں ان کے ناولوں کی اشاعت اور مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اردو میں جاسوسی ناول لکھنے والوں میں شاید ابن صفی سے بڑا کوئی نام نہیں ہے۔ انہوں نے بڑی تعداد میں جاسوسی ناول لکھے۔ فاروقی نے ابن صفی کے جن چار ناولوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا، وہ چاروں ناول ڈاکٹر ڈریڈ سیریز کے نام سے مشہور ہوئے۔ جن کو دو ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، جن میں پہلے کا نام(Bleft Publication pvt ltd chennai) اور دوسرے کا نام(With Tran grebarpress chennai) ہے جہاں سے ان کے تراجم کردہ ناول شائع ہوئے۔ جن میں پہلا ناول(Poisoned arrow) دوسرا ناول(Smoke water) تیسرا ناول(The laughing corpse) اور چوتھا ناول(Dr.Dread) کے نام سے شائع ہوا جن کو اردو زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کا کام فاروقی نے بحسن خوبی انجام دیا۔

میں نے اس مختصر سے مضمون میں بحیثیت مترجم، فاروقی کے کارناموں کی ایک جھلک ہی پیش کی ہے جب کہ ان کے ہر کارنامے پر آج کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔ ان کی علمی شخصیت اتنی ہمہ جہت ہے کہ جب بھی کوئی ان کا احاطہ کرنے بیٹھتا ہے تو ان کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی پہلو چھوٹ ہی جاتا ہے۔ اردو

سے انگریزی میں چند نہایت اہم ترجمے جن سے ان کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملتی، جن میں ان کی اپنی انگریزی تحریریں (مضامین) بھی شامل ہیں، مضمون کے طوالت کے خوف سے ان پر بات نہیں ہوسکی جس کی تشنگی کا مجھے شدت سے احساس ہے۔ بہر کیف درج ذیل انٹرنیٹ لنک پر ان کے طویل انگریزی کارناموں نیز ادبی مضامین، کتابیں اور ان کے انگریزی تراجم وغیرہ سے مکمل استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ انٹرنیٹ لنک پیش خدمت ہے۔

www.columbia.edu/itc/mealac/pritchet/oofwp/srf/

حوالہ جاتی کتب

- ۱۔شمس الرحمٰن فاروقی۔سوار اور دوسرے افسانے،شب خون کتاب گھر، الہ آباد،۲۰۰۳ء۔ص۔۱۵
- ۲۔ایضاً۔ص۔۱۵
- ۳۔روشنائی۔جلد۴، شمارہ۱۴، نشری دائرہ، کراچی، پاکستان، جولائی تا ستمبر۲۰۰۳ء۔ص۔۱۱۰
- ۴۔ایضاً۔ص۔۱۱۱
- ۵۔شمس الرحمٰن فاروقی۔شعریات(ترجمہ وتعارف) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔دہلی ۱۹۹۸ء ۔ص۔۱۱۸ء
- ۶۔شمس الرحمٰن فاروقی۔شعریات(ترجمہ وتعارف) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔دہلی ۱۹۹۸ء۔ص۔۱۰
- ۷۔اردو کا ابتدائی زمانہ۔شمس الرحمٰن فاروقی۔آج کی کتابیں۔کراچی پاکستان ۲۰۰۹ء تیسرا ایڈیشن۔ص۔۱۱

(DIET Lecturer ,District institute of Education training , Maharajganj)
Village Dhanewa Dhanei, Near police line
District Maharajganj Uttar Pradesh
Pin code 273303 Mob No 7985449717

● محمد اقبال لون

شمس الرحمٰن فاروقی کی فکشن شعریات.....اتفاق واختلاف

چند مباحث

کسی بھی فن پارے کی تخلیق وتفہیم کے لیے جو اصول لازمی قرار دیے جاتے ہیں جن کے تحت فن پارہ وجود میں آتا ہے یا جن اصولوں کی روشنی میں کسی تحریر کی معنویت اور فنی وادبی تقاضے مکمل نظر آتے ہوں ان اصولوں کو اس صنف کی شعریات کہا جاتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''شعریات کی مختصر تعریف یوں ہے کہ یہ ان اصولوں کا نام ہے (چاہے وہ اصول تحریری ہوں یا زبانی) جن کی روشنی ہم عام طور پر فیصلہ کرتے ہیں کہ کون سی چیز ادب ہے اور کون سی چیز ادب نہیں ہے اور پھر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کون سا شعر یا نظم یا شاعری یا افسانہ اپنی طرح کی کن دوسری چیزوں سے بہتر ہے؟ فن کی دنیا میں کیا چیز بہتر ہے اور کون سی کم بہتر اور کون سی بالکل خراب، اس کو طے کرنے کے اصول بھی شعریات کہلاتے ہیں اور وہ کیا بنیادیں ہیں جن پر کسی متن کی اچھائی مبنی ہے؟ یہ بھی شعریات ہی طے کرتی ہے''

محولہ اقتباس اور شعریات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فن پارہ ادب ہے کہ نہیں، اگر ہے تو کس درجہ کا ہے۔ کیا فن پارہ شہکار ہے یا اوسط درجہ کا؟ کیا فن پارہ فنی تقاضوں اور ادبی بنیادوں کے اعتبار سے معیاری ہے یا غیر معیاری۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی تحریر فنی تقاضوں اور ادبی بنیادوں کے مطابق بامعنی تحریر ہوسکتی ہے یا متعلقہ تحریر بالکل خراب اور مہمل تحریر ہے اور صرف لفظوں کا گورکھ دھندہ ہے۔ اسی طرح کسی بھی فن پارے کی مکمل تفہیم وتحسین اسی شعریات سے ممکن ہے جس کی رو سے وہ فن پارہ بامعنی ہوتا ہے اور یہ شعریات ہی ہے جو فن پارے کی اچھائیوں یا خامیوں اور فن پارے کے معیار کو طے کرنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''شعریات صرف ان اصولوں کا نام نہیں جن کی روشنی میں ہم کسی تحریر کو فن پارہ قرار دیتے ہیں اس کی صنف متعین کرتے اور اس کی اچھائی برائی کے

بارے میں بات کرتے ہیں۔ شعریات ان اصولوں کا بھی نام ہے جن کی روشنی میں کوئی تحریر بامعنی ہوتی ہے۔''

جہاں فاروقی شعریات کو ٹھوس اور مستقل اصولوں کا مجموعہ ماننے سے انکار کرتے ہیں لیکن کسی بھی تحریر کی تخلیق کے لیے ان اصولوں کو ناگزیر قرار دیتے ہیں جن کے تحت فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ وہیں گوپی چند نارنگ بھی شعریات کو زمانے کے مزاج ومعیار کے تابع عارضی اور تغیر پذیر علم قرار دیتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ شعریات کو کسی بھی ٹھوس، حتمی اور مستقل اصول کے طور پر منضبط نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہر لمحہ تغیر سے دوچار ادب کو اصول وقوانین کے حصار میں بند کرنا ادب کی موت کے مترادف ہوگا۔ درجہ بالا دلائل کی روشنی یہی کہا جاسکتا ہے کہ فکشن شعریات ان تمام لازمی اصولوں اور قواعد کا نام ہے جن کے تحت کوئی فکشن تحریر وجود میں آتی ہے اور جن کی روشنی میں کوئی فکشن تحریر بامعنی ہو اور فنی اور ادبی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔ فکشن شعریات ان اصولوں کا بھی نام ہے جن کے تحت کسی فکشن تحریر کا تعین قدر اور قدر سنجی کی جاتی ہے۔ یعنی فکشن پارہ میں کیا فنی خوبیاں ہیں، اُسلوب یا Diction کیسا ہے؟ تکنیکی امتیازات کیا ہیں اور وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اس فکشن تحریر کو اس طرح کی دوسری فکشن تحریر سے الگ کرتی ہے۔ یا بقول فاروقی ''وہ کیا صفت ہے جو کسی تحریر کو فکشن بناتی ہے؟'' دراصل فکشن کی شعریات کا سفر زندگی اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ جاری تو رہتا ہے لیکن بقول پروفیسر قدوس جاوید ''یہ سفر خطِ مستقیم کا نہیں خطِ منحنی کا سفر ہے''۔ اس لیے فکشن شعریات کی آگہی کے لیے فکشن کے ابتدائی اور ارتقائی مرحلوں میں ثقافت کے بدلتے ہوئے سروکاروں اور ان کی معنویت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اردو فکشن شعریات کی تشکیل اور تعمیر میں شمس الرحمٰن فاروقی کا کلیدی رول رہا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی ایک ایسے ہمہ جہت تخلیق کار ہیں جنھوں نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز فکشن نگار اور ناقد کی حیثیت سے کیا ہے اور تنقید نگاری کا میدان انھوں نے بہ وجہ ضرورت چُنا۔ چوں کہ فاروقی خود لکھتے ہیں کہ وہ فطرتاً فکشن نگار ہیں اس لیے افسانے بھی لکھے ''شب خون'' میں فرضی ناموں سے یکے بعد دیگرے کئی افسانے لکھے جنھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور بعد میں ''سوار اور دوسرے افسانے'' کے عنوان سے اپنا افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ انھوں نے دو ناول لکھے جن کو اردو دنیا میں قدر ومنزلت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اُردو دنیا کے اہم ترین عروضیوں میں سے گردانا جاتا ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں شمس الرحمٰن فاروقی جیسی کثیر الجہت ادبی شخصیت کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے کوئی چالیس سال تک اُردو کے مشہور ومعروف ماہنامہ ''شب خون'' کی

ادارت کی اوراس کے ذریعے اُردوادب کے متعلق نئے خیالات اور برصغیراوردوسرے ممالک کے اعلیٰ ادب کی ترویج کی۔شمس الرحمٰن فاروقی کوان کی چالیس سے زائد اُردوانگریزی تصانیف اور کارناموں پر ہندوستان کی کم وبیش سبھی اکیڈمیوں اورادبی اداروں نے انعامات سے سرفراز کیا ہے۔خدائے سخن میرتقی میر کے کلام کے بارے میں ان کی کتاب شعرشورانگیز'' چار جلدوں میں کئی بار چھپ چکی ہے۔اس کتاب کو برصغیر کے سب سے بڑے ادبی اعزاز''سرسوتی سمان'' سے ۱۹۹۶ میں سرفراز کیا جاچکا ہے۔فاروقی نے تنقید، شاعری، فکشن، لغت نگاری، داستان شناسی، عروض، ترجمہ، ادارت یعنی ادب کے ہر میدان میں تاریخی اہمیت کے کارنامے انجام دیے ہیں۔ان کے علمی وادبی کارناموں کے اعتراف میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں اعزازی ڈی لٹ ڈگری سے نوازا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بیس سال کی طویل مدت کے مطالعے کے بعد داستان شناسی کے باب میں ایک معیار قائم کیا۔چنانچہ ادبی تھیوری کے بنیادی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے مستند ناقدین اور مفکرین سے استفادہ کرتے ہوئے اردوادب میں اور بالخصوص داستانوی متن میں ادبی تھیوری کے مختلف پہلوؤں کا اطلاق کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ان کے مایہ ناز تحقیقی اور تالیفی کارنامے''ساحری، شاہی اور صاحب قرآنی.....داستان امیرحمزہ کا مطالعہ'' جیسی ضخیم اور شہکار تصنیف کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان کے بقیہ تمام علمی اور ادبی کارنامے فراموش کر بھی دیئے جائیں تو بھی داستان شناسی کے باب میں ان کا یہ کارنامہ انہیں تاریخ ادب اردو میں زندہ وجاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔انہوں نے منصبی اور سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود تن تنہا جو کام کیے ہیں۔وہ اداروں کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔

اردوفکشن بالخصوص افسانہ/ ناول کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی جو تنقیدی تحریریں ہمارے سامنے ہیں وہ کمیت کے لحاظ سے ان کی دیگر تنقیدی تحریروں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ چند متفرق مضامین کے علاوہ ان کی ایک کتاب''افسانے کی حمایت میں'' ہے جس کا بڑا حصہ ایسے مضامین پر مشتمل ہے جس میں افسانے کے فن پر گہری اور اصولی بحثیں کرتے ہوئے افسانے کی شعریات مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان مباحث کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج جب اردو افسانے پر کوئی سنجیدہ گفتگو ہوتی ہے تو فاروقی کے خیالات حوالہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات نے اردو افسانے میں بالکل نئی طرح کے مباحث کا آغاز کیا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ اردو تنقید میں زیادہ تر عمومی اظہارِ خیال سے ہی کام لیا گیا ہے۔لہٰذا فکشن کی تنقید میں بھی اکثر وبیشتر ایسے مباحث ہی قائم کیے گئے جن کا تعلق یا تو فکشن نگار کے ذاتی خیالات سے رہا یا افسانہ/ ناول میں

بیان کردہ کہانی کے موضوع میں جو موضوع اور کرداروں وغیرہ کے شخصی، طبقاتی، سماجی اور نفسیاتی کوائف سے رہا ہے۔ترقی پسند تنقید نے فکشن کا مطالعہ زیادہ تر ایسے امور کی روشنی میں کیا کہ کہانی میں جو موضوع پیش کیا گیا ہے وہ سماجی حقیقت سے کتنا قریب ہے اور کرداروں کے ذریعے کہانی میں مختلف طبقات کی کشمکش کو کس طرح دکھایا گیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے فکشن کی تنقید میں پہلی بار ایسے سوالات اُٹھائے جن کا تعلق نہ صرف افسانے کے فنّی امور سے ہے بلکہ افسانے کی وجوہات بھی دائرہ سوال میں آگئی ہیں۔انہوں نے اس پہلو پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے کہ اپنی نوع کے اعتبار سے افسانے کی حیثیت شاعری سے کم تر ہے۔ان کا خیال ہے کہ اردو میں فکشن کی جو روایتی تنقید رائج رہی ہے وہ اس لیے بہت کارآمد نہیں کہ اس کے ذریعے افسانہ/ ناول کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوسکتا۔ یہ تنقید افسانہ/ ناول کے مطالعے میں پلاٹ، واقعات اور کردار وغیرہ کا وہی روایتی تصور سامنے رکھتی ہے، جواب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں'' افسانے کی تنقید سے متعلق چند مباحث'' کے عنوان سے مضمون میں فاروقی نے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جن سے ان کے تصورات کی نشاندہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ''پلاٹ کا قصّہ'' اور''افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ'' جیسے مضامین میں بہت سے روایتی تصورات کی خامیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ فاروقی چوں کہ جدید تنقید کے سب سے اہم نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے جدید افسانے پر جو اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں، اُن کا جائزہ لینا اور ان کے بارے میں صحیح صورتِ حال کو پیش کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل رہا ہے۔ چنانچہ جدید افسانے کی امتیازی خصوصیات کو اُنہوں نے پہلے نظریاتی بنیادیں فراہم کیں، پھر انہیں بنیادوں پر ان کا دفاع کیا۔جدید افسانے کے اصولوں پر بحث کرتے ہوئے فاروقی نے بیانیہ اور اس کی قسموں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔اسی ضمن میں افسانے میں راوی کی نوعیت بھی زیرِ بحث آئی ہے۔ انہوں نے یہ اصول پیش کیا کہ راوی کی نوعیت افسانے میں بیانیہ کی صورت حال کو لازمی طور پر متاثر کرتی ہے اور اس سے افسانے کی معنویت پر بھی اثر پڑتا ہے۔مثلاً اگر کسی افسانے کا بیانیہ حاضر راوی، جو متکلم کی صورت میں ہوتا ہے، کے ذریعے بروئے کار لایا گیا ہے تو وہ اس افسانے سے مختلف ہوگا جس کا بیانیہ غائب راوی پر مبنی ہے۔اس طرح دونوں افسانے اپنی تفہیم اور معنویت کے لحاظ سے مختلف صورتِ حال پیش کریں گے۔جدید افسانے پر ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جدید افسانہ کہانی پن کی صفت سے عاری ہے۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فاروقی صاحب پہلے افسانے میں کہانی پن کی حقیقت کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر یہ ثابت کرتے ہیں کہ معترضین نے کہانی پن سے جو کچھ مراد لیا ہے وہ کہانی پن کا ناقص تصور ہے یا کم

ازکم اس قدر محدود تصور ہے کہ اسے مختلف طرح کے افسانوں پر بیک وقت منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح داستان کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شمس الرحمٰن فاروقی سے پہلے اردو میں داستان کی تنقید لکھی ہی نہیں گئی۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فاروقی کے مطالعۂ داستان کے بعد اس تنقید کی جو کمیاں تھیں وہ بہت واضح صورت میں سامنے آ گئی ہیں۔ فاروقی سے پہلے داستان کے نقادوں میں کلیم الدین احمد اور گیان چند جین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان ناقدین نے جس زاویے سے داستان کا مطالعہ کیا اس سے داستان تنقید عمومی طور پر منفی رخ اختیار کر گئی۔ ان نقادوں کے علاوہ اردو داستانوں کے بارے میں جو دیگر مطالعے ہوئے ان کی صورتِ حال بھی کم وبیش ایسی ہی ہے۔ چنانچہ ان تمام تنقیدی مطالعات کی بنیاد پر اردو داستانوں کے تعلق سے جو خیالات بہت عام اور مقبول ہوئے، ان کا لبِ لباب یہ ہے کہ اردو میں داستان کی اگرچہ شاندار روایت ہے لیکن اب وہ روایت ہمارے لیے کوئی خاص معنویت نہیں رکھتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داستان اپنی نوع کے اعتبار سے بہت اوائلی اور غیر ترقی یافتہ صنف ہے اور اس کی جدید اور ترقی یافتہ شکل ناول ہے۔ لہٰذا ناول کے ہوتے ہوئے داستانوں کو کیوں پڑھا جائے۔ داستانوں میں دنیا اور انسان سے متعلق ایسے حقائق نہیں ملتے جو ہمارے لیے بامعنی اور کارآمد ہوں۔ ان میں محض تخیلات کے عالم سے سروکار رکھا جاتا ہے اور مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایک ہی واقعہ بار بار بیان کیا جاتا ہے جس سے نہ صرف غیر ضروری تکرار کا عیب پیدا ہوتا ہے بلکہ اس سے داستانیں بوجھل اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ اردو داستانوں کے بارے میں یہ ایسے خیالات ہیں جو اگرچہ غلط ہیں لیکن داستان کی بیشتر تنقید کے مرکز میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک عرصے تک ان خیالات کی شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور سے داستان کے فن کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، بلکہ اسے اپنی ادبی روایت کی نہایت فضول اور غیر ضروری صنف کی حیثیت سے نظر انداز کیا گیا۔ اس ضمن میں یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو داستانوں کا جب بھی ذکر ہوا ہے، عموماً اس کی خامیوں اور نقائص پر ہی زیادہ گفتگو ہوئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اس حیثیت سے بھی بہت ممتاز ہیں کہ انہوں نے داستان کی تنقید کو بالکل نئی سمت عطا کی۔ چھیالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ''داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ'' کے گہرے مطالعے کے بعد انہوں نے داستان کے فن اور روایت کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ داستان کی تنقید میں غیر معمولی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اس سلسلے کی پہلی کتاب ''ساحری، شاہی، صاحبِ قرآنی، داستانِ امیر حمزہ'' کتاب کی پہلی جلد اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں داستان کے بارے میں فاروقی صاحب کے تمام بنیادی خیالات سمٹ آئے ہیں۔

فاروقی نے داستان کی عام تنقیدی صورت حال سے اپنی بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے ان اسباب کی نشان دہی بھی کی ہے جن کی بنا پر داستانوں کا عام مطالعہ صحیح رخ اختیار نہ کر سکا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایسے اصول ونظریات بھی وضع کیے ہیں، جن کی روشنی میں داستانوں کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ داستان پر لکھی گئی عام تنقید کی کوتاہیوں سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں ''داستان کی شعریات'' کا دیباچہ قابل ذکر ہے جس میں ساختیاتی تھیوری کے تحت فکشن کی تنقید عمل میں لائی گئی ہے۔ فاروقی کا یہ مطالعہ اردو ادب میں ایک رجحان ساز رویے کے بطور قبول کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر فکشن کے ناقدین نے حوصلہ افزائی پائی۔ داستان کے فنی امور پر بحث کرتے ہوئے فاروقی زیادہ تر ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کی پیش رو تنقید میں نظر نہیں آتیں۔ انہوں نے داستان کے ایک ناگزیر فنی پہلو یعنی بیانیہ پر نہایت مفصل اور کارآمد گفتگو کرتے ہوئے اس حقیقت کو بہت زور دے کر بیان کیا ہے کہ داستان کا بیانیہ ناول کے بیانیہ سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی نوع کے اعتبار سے ناول تحریری بیانیہ کا مظہر ہے جب کہ داستان اپنی فطرت کے لحاظ سے زبانی بیانیہ کے ذریعہ ظہور میں آتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تحریری اور زبانی بیانیہ کا اختلاف اس لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا ہے کیوں کہ اس کے دور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ تحریری اور زبانی بیانیہ کی حرکیات (Dynamics) ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہوتی ہے بلکہ اس کے جو نتائج سامنے آتے ہیں اور جن صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی بسا اوقات بے حد مختلف یا متضاد ہوا کرتی ہیں۔ چوں کہ تحریری اور زبانی بیانیہ الگ الگ طرح کے عناصر کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس لیے ناول اور داستان میں شکل وصورت کی سطحی مماثلت کے باوجود ایسے مختلف پہلو تلاش کیے جا سکتے ہیں جن کی وجہ سے دونوں کا مطالعہ ایک ساتھ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ایک صنف کے ہیئتی اور تکنیکی اصول وضوابط کی بنیاد پر دوسری کو پڑھا، جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ فاروقی نے تحریری اور تقریری بیانیہ کی بحث اس وقت چھیڑی جب دریدا کے صوت مرکزیت (Phonocentricism) اور لفظ مرکزیت (Logocentricism) جیسے تصورات ادبی تھیوری کی سطح پر علمی اور ادبی حلقوں میں غلطاں اور پیچاں تھے۔ عین ممکن ہے کہ فاروقی نے دریدا کے تصورات سے استفادہ کر کے اردو داستان کی تنقید پر بحث کرتے ہوئے تحریری اور تقریری یا زبانی بیانیہ کی اصطلاحات وضع کی ہوں۔ یہیں فاروقی اس حقیقت سے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ نقادوں نے عام طور پر داستان کا مطالعہ چوں کہ ناول کے اصولوں کی روشنی میں کیا اس لیے جو نتائج سامنے آئے ان کی رو سے داستان کا فن ناقص قرار دیا گیا۔ وہ اصرار کرتے ہیں کہ داستان کا مطالعہ انہیں اصولوں کی روشنی میں کیا جانا چاہئے جن اصولوں پر داستانیں تخلیق ہوئی ہیں۔ ان کی فنی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے

جب فنِ داستان گوئی کے تمام لوازمات کو سامنے رکھا جائے۔

یوں تو اردو فکشن میں پر تنقید لکھنے والوں میں پروفیسر وقار عظیم سے لے کر مرزا حامد بیگ تک کے نام شمار کیے جاتے ہیں لیکن کیا واقعتاً ہم ان لوگوں کو فکشن نقاد کہہ سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت غور کرنے پر بھی اثبات میں نہیں ملتا۔ اردو فکشن پر لکھنے والوں میں صرف کچھ نام ایسے ہیں جن کو فکشن ناقد کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ دراصل اردو میں فکشن ناقدین اس قدر قلیل ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ ابھی فکشن مغرب میں ڈھائی سو برس کی عمر کو پہنچ سکا۔ جب کہ شاعری اور اس کی اصناف کو صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس کمی کی دوسری بڑی اہم وجہ فکشن کا اسلوب ہے۔ فکشن کی ہیت تو اس طرح تبدیل نہیں ہوتی لیکن اس کے اسلوب میں اس رفتار سے تبدیلی ہوتی رہی ہے کہ فکشن تنقید کے اصول ترتیب پاتے ہی پرانے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ صنف مسلسل ارتقاء اور تبدیلیوں کی زد میں ہے اور یہی ایک کامیاب صنف کی پہچان بھی جو ہر وقت ارتقائی سفر میں رہے۔ ایسی صورت حال میں فکشن پر تادیر باقی رہنے والی تنقیدی تحریریں لکھی کیسے جا سکتی ہیں۔

جب اُردو فکشن کا آغاز ہوا۔ تو اس کی تنقید کا نقطۂ آغاز بھی اسی کے آس پاس شروع ہوا کیونکہ کہ تنقید، تخلیق کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ فکشن تنقید کے مٹتے مٹتے، آدھے ادھورے نقوش دیگر اصناف کی طرح اردو کی مختلف تصانیف اور تذکروں کے دیباچوں، خطوط، تقریظوں اور اشتہاروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے اردو میں افسانہ جاتی ادب کی تنقید کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انیسویں صدی کے اختتام تک اردو میں فکشن کی تنقید روز افزوں روبۂ ارتقا ہے۔ اس صدی کے آخر میں ''ناول نویسی'' پر سب سے پہلا طویل مضمون سید سجاد حیدر کا ملتا ہے جس میں ناول کی مقبولیت کے اسباب، اردو کا ناول تجزیہ، ناولوں کی فنی خصوصیات اور ناولوں کے موضوعات وغیرہ پر تفصیلی بحث ہے۔ ان ابتدائی کوششوں اور ہلکے اشاروں نے ہی فکشن تنقید کے لیے راہیں ہموار کیں۔

اس کے بعد انیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے آغاز میں مولوی کریم الدین کی ''خط تقدیر'' کے مقدمہ پر نظر ٹھہرتی ہے جس کی روشنی میں کریم الدین، اردو میں افسانہ جاتی ادب کے پہلے نقاد بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جس نے داستان اور قصہ کوئی کی پرانی روش پر تنقید کی اور اس سے انحراف کیا اور اردو میں پہلی بار ادب برائے زندگی کے رجحان کو منطقی طور پر بیان اور قایم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد اردو فکشن کی مختلف طرزوں پر ناقدین نے اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ داستان کی تنقید پر جن ناقدین نے اپنی نگارشات منصۂ شہود پر لائیں، ان میں کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر مسعود حسین خان، نیر مسعود، سہیل احمد خان، سہیل بخاری، آغا سہیل اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح ناول کی تنقید میں اویس احمد ادیب، علی عباس حسینی، احسن فاروقی، نورالحسن ہاشمی، سہیل بخاری، پروفیسر عبدالسلام

، پروفیسر یوسف سرمست اور ڈاکٹر خالد اشرف قابل ذکر ہیں۔ داستان اور ناول کے ساتھ ساتھ ناقدین اور دانشوران ادب نے افسانے کی تنقید میں اس کے روز اول سے ہی دلچسپی ظاہر کی۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے ان ناقدین میں پروفیسر عبدالقادر سروری، مجنون گورکھپوری، ممتاز شریں، پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر سلیم اختر، گوپی چند نارنگ، پروفیسر صادق، مہدی جعفر، فرمان فتحپوری، انور سدید، شہزاد منظر، مرزا حامد بیگ، شمیم حنفی، اختر انصاری، رام لعل، مسعود رضا خاکی، انوار احمد، قمر رئیس، وارث علوی، وہاب اشرفی، حامدی کاشمیری، محمد شاہد حمید وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح فکشن کی مختلف طرزوں یعنی داستان، ناول اور افسانہ کی تفہیم وتنقید کے حوالے مذکورہ بالا ناقدین اور دانشوروں نے اہم کارنامے انجام دیے اور فکشن تنقید میں ان کے کارنامے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے برعکس شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک الگ راہ اختیار کی ہے ۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی فکشن تنقید میں بھی شاعری کی تنقید کی طرح بڑی توانائی، رنگا رنگی اور وسعت نظر شامل ہے۔ وہ اپنے نظام فکر کو فطری انداز میں پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور دلائل اور تاویلیں دے کر قائل ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ فاروقی داستان کے فنی اور تکنیکی لوازمات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ فاروقی ہی نے ہمیں سب سے پہلے داستان کی شعریات سے روشناس کرایا ہے۔ داستان کی تنقید میں فاروقی راوی کی جگہ بیان کنندہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور قاری کے بجائے سامعین کا ذکر کرتے ہیں۔

چوں کہ داستان کا فن اصلاً زبانی سنانے اور سننے کا فن ہے اس لیے راوی اور قاری کے بجائے بیان کنندہ اور سامعین کے الفاظ زیادہ مناسب کہے جا سکتے ہیں۔ ان الفاظ کو بطورِ اصطلاح استعمال کرتے ہوئے فاروقی نے فنِ داستان گوئی کے بے حد اہم پہلو پر توجہ صرف کی ہے۔ ان میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ داستان کا کوئی مصنف نہیں ہوتا۔ فاروقی نے پہلی بار اردو داستان کی مہتم بالشان روایت کا حقیقی احساس دلایا اور داستان کے فنی مطالعے کے لئے از سر نو اصول ونظریات وضع کیے۔ انہوں نے اس بات کو بھی ثابت کیا کہ عام تنقید جن چیزوں کو نقص قرار دیتی ہے وہ دراصل داستان کی امتیازی صفات اور اس کی خوبیاں ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کے حوالے سے چند بنیادی سوالات قائم کئے اور اس صنف کو درپیش چیلنجز کے تعلق سے ایک جاندار بحث چھیڑی۔ ان کی متنازعہ فیہ مگر اہم کتاب ''افسانے کی حمایت میں'' جب منظر عام پر آئی تو اس کی مخالفت ومخاصمت میں طویل بحث ومباحثوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے خلاف سب سے پہلے وارث علوی کمر بستہ ہو گئے اور ''افسانے کی حمایت میں'' پیش ہوئے معروضات کو ''ناقدانہ خون خرابہ'' کہا ہے اور ساتھ ہی اپنے مخصوص انداز میں فاروقی کی فکشن تنقید کو ان کی لاعلمی سے تعبیر کرتے ہوئے اس قسم کے ناقدانہ اپروچ کو نہ صرف مضحکہ خیز قرار دے دیا بلکہ یہ بھی لکھا کہ فکشن ان

کے بس کا روگ نہیں۔اپنے جارحانہ لہجے میں یہ بھی کہہ دیا کہ دراصل فکشن میں ''وہ ڈوبے نظر آتے ہی نہیں تو تیریں گے کیا؟ ڈوبے اور وہ بھی افسانے کے چلو بھر پانی میں۔''اس طرح وارث علوی افسانے کی تنقید کے تئیں فاروقی کے خیالات کو کچھ علمی اور کچھ ذاتی استدلال سے رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔حالانکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ''فکشن تنقید کا المیہ''میں شمس الرحمٰن فاروقی کے خلاف سنگ و تیر برسانے والے وارث علوی اپنی ایک اور کتاب ''غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین'میں سرنیدر پرکاش کے افسانوں پر مشتمل مضمون میں افسانہ تنقید کے باب میں فاروقی کی فہم کی داد دیتے ہیں جو افسانوی تنقید کے باب میں ان کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ وارث علوی کی طرح وہاب اشرفی سے بھی رہا نہ گیا تو انھوں نے فاروقی کے رد میں ''افسانے کا منصب'' کے عنوان سے مضمون لکھا جو ''شب خون'' کے ہی شمارہ ۶۴ میں شائع ہوا اور جس میں موصوف نے عالمی ادب کے حوالے سے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''افسانہ نہ تو معمولی صنف ادب ہے اور نہ تو کسی اچھے افسانہ نگار کو عظمت کے حصول کے لیے اس صنف کے علاوہ کسی دوسری صنف کا سہارا لینا ضروری ہے،اس ضمن میں انھوں نے اپنے مطالعے کی گہرائی اور بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک صنف (جو غیر اہم بھی ہوسکتی ہے) کی بنا پر کئی فنکار عظمت کے آسمان پر پہنچ گئے۔ اسی طرح عابد سہیل نے بھی فاروقی کے ان خیالات جن میں فاروقی نے افسانہ کو درجہ دوم کی صنف کہا ہے، کی بھرپور مخالفت کی ہے لیکن ان کی یہ مخالفت برائے مخالفت نظر نہیں آتی کیوں کہ وہ کئی ایک باتوں میں فاروقی کی تعریف بھی کرتے ہیں اور افسانہ کے اوزاروں (Tools) پر تو گہرائی سے بات کرنے والا پہلا شخص فاروقی کو ہی قرار دیتے ہیں۔اگر چہ وہ بھی اُن کے بیشتر خیالات سے اتفاق کرنا مشکل سمجھتے ہیں لیکن اس بات کو بھی کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ افسانوی ادب کی فاروقی کی تحریروں کے بعد کی تقریباً ساری ہی تنقیدی کاوشوں پر فاروقی کے خیالات کی چھاپ نمایاں ہے، چاہے وہ انحراف کی صورت ہی کیوں نہ ہو۔فاروقی کے ردِعمل کی تنقید میں محمد حمید شاہد کا نام بھی قابل توجہ ہے کہ جنھوں نے فاروقی کے تقریباً تمام مباحث کی وضاحت اپنے طور پر کرنے کی کوشش کی ہے اگر چہ ان کا مجموعی رویہ تو فاروقی کی ''حمایت'' ہی نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی بات اپنے ڈھنگ سے بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور فاروقی کی کئی ایک باتوں کو رد کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔اس طرح ان لوگوں سے تحریک پا کر بعض اور اصحاب بھی فاروقی کی فکشن فہمی کے خلاف صف آرا ہو گئے اور مذکورہ بالا ناقدین کی آواز سے آواز ملانے لگے ہیں کہ افسانہ تنقید فاروقی کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ فکشن کی عام تنقید جس دائرے میں گھومتی رہی ہے اس میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ، منظر کشی اور ضمنی

طور پر زبان و بیان کا ذکر ہوتا رہا ہے فاروقی نے فکشن کی تنقید میں پہلی بار ایسے سوالات اُٹھائے جن کا تعلق نہ صرف افسانے کے فنّی امور سے ہے بلکہ افسانے کے وجوہات بھی دائرہ سوال میں آ گئے۔دراصل افسانے کی حمایت اس وقت منظر عام پر آئی جب فاروقی نے نظم کی برتری اور فوقیت ثابت کرنے کی شعوری کوشش کی جس پر ادبی حلقوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔جس نے آگے چل کر فاروقی کو افسانے کی حمایت کے لئے کمر بستہ کر دیا۔''افسانے کی حمایت میں''میں پہلی بار پلاٹ کا قصہ، بیان، بیان کنندہ، راوی اور بیانیہ وغیرہ زیر بحث آ گئے۔معروف ناول نگار خالد جاوید اس حوالے سے لکھتے ہیں ''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اُردو تنقید میں پہلی بار فاروقی ہی نے افسانے اور ناول میں ''بیانیہ کا ڈسکورس'' قائم کیا ہے۔اُردو والوں کو سب سے پہلے فاروقی ہی نے بتایا کہ ''بیانیہ'' آخر ہوتا کیا ہے ورنہ ایک عرصے تک ہم بیان اور بیانیہ میں کوئی فرق قائم کرنے کے قابل نہ تھے۔'' فکشن شناسی کا ہنر اردو میں کم ہی کو لوگوں آتا ہے یوں تو پیشہ ور ناقدین کی بے التفائی سے بد دل ہو کر ناول اور افسانہ لکھنے والوں نے خود ہی ایک دوسرے پر تنقیدی مضامین لکھنے کی کوششیں کی ہیں جن میں اس دور کے عبدالصمد، غضنفر، ذکیہ مشہدی، رحمٰن عباس وغیرہ اہم نام ہیں لیکن ان کی تنقیدیں سخن فہمی سے زیادہ غالب کی طرفداری کی دلالت کرتی ہیں، اس ماحول میں فاروقی ایک اہم تخلیق کار ہیں جنھوں نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز فکشن نگاری اور فکشن ناقد کی حیثیت سے ہی کیا اور ''افسانے کی حمایت میں'' جیسی اہم کتاب لکھ کر افسانے کی شعریات وضع کرنے کی مستحسن کوشش کی۔

فاروقی ایک فطری فکشن نگار ہیں۔یہی وہ خوبی ہے جو کسی تخلیق کار کو بار بار پڑھے جانے کے لئے مجبور کرتی ہے۔فکشن بذات خود ہماری اجتماعی، ثقافتی زندگی کا ایک اہم حوالہ ہے۔فاروقی کا فکشن صرف قاری کو مسرت بہم پہنچاتا ہے یا بصیرت بھی؟ یہ بات ادب کے تعلق سے عالمگیر سطح پر قبول عام کا درجہ رکھتی ہے کہ ادب عالیہ نہ صرف مسرت انگیزی کا حامل ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے وقت کے قارئین کو دانشورانہ بصیرت اور حیات افروز تجربات سے بھی سرفراز کرتا ہے۔ناول نگاری کے میدان میں فاروقی نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔۲۰۰۶ء میں ان کا مشہور زماں ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' منصۂ شہود پر آیا۔اس ناول کو معدودے چند کو چھوڑ کر مجموعی طور پر اردو ادب کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔فاروقی کا یہ ناول مغلیہ عہد کی تاریخ کو فنی اور جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اٹھارویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کی تاریخی اور تہذیبی بازیافت کا بہترین محاکمہ ہے۔یوں بعض معترضین کا خیال ہے کہ فاروقی کا یہ ناول سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندستان کی تاریخ ہے۔اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ یہ تین سو سال کے زمانے کی تاریخ کے اہم حوالوں کو انگیز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے جلو میں وہ تمام خصوصیات

رکھتا ہے جوایک بہترین ناول کے لئے ناگزیر ہیں۔

حال ہی میں ان کا ایک اور شہکار ناول ''قبض زماں' منظر عام پر آچکا ہے جو بے حد فنکارانہ اور دلچسپ ہے۔اس ناول کے حوالے سے اردو کے معروف ناول نگار اور ادیب خالد جاوید یوں رقم طراز ہیں''قبض زماں کو صرف فاروقی ہی لکھ سکتے تھے فاروقی کا ذہن پراسرار ہے۔وہ انتہائی شگاف اور معروضی تنقید لکھتے ہیں مگر ان کی تخلیقیت کے سوتے پراسرار ہیں۔فاروقی کی علمیت میں بھی ایسے رمز پوشیدہ ہیں جن تک معمولی تخلیقی ذہن کی رسائی نہیں ہوسکتی۔''

اردو میں چند ہی لوگ ایسے گزرے ہیں جو بیک وقت تخلیق کار بھی تھے اور باضابطہ تنقید نگار بھی۔فاروقی کی ذات میں یہ دونوں خوبیاں نظر آتی ہیں۔اب یہ الگ بحث ہے کہ وہ بڑے تخلیق کار ہیں یا تنقید نگار،لیکن یہ بات طے ہے کہ ان کی ادبی شخصیت میں قوس قزح کے سارے رنگ اپنی تمام تر چمک دمک کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ان کی تنقیدی اور ادبی خدمات اس قدر جامع اور وقیع ہیں کہ انہیں تحقیق وتنقید کی گرفت میں لانے کے ایک جامع انسائیکلوپیڈیا درکار ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بِیکراں کے لیے

کتابیات

۱۔تعبیر کی شرح شمس االرحمٰن فاروقی ۲۔ افسانے کی حمایت میں شمس الرحمٰن فاروقی
۳۔فکشن تنقید ارتضی کریم ۴۔ اردو فکشن اور تیسری آنکھ وہاب اشرفی
۵۔ اردو افسانہ۔صورت ومعنی۔محمد شاہد حمید ۶ گوپی چند نارنگ فکشن شعریات
۷۔فکشن کی تنقید کا المیہ وارث علوی ۸۔ فکشن کی تنقید چند مباحث عابد سہیل
۹۔سہ ماہی اردو ادب ایڈیٹر اطہر فاروقی (شمس الرحمٰن فاروقی نمبر)
۱۰۔سہ ماہی فکر وتحقیق ارتضٰی کریم افسانہ نمبر

Urdu section
J&KCultural Academy
Lal Mandi
Srinagar(Kashmir)-190008

● ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ

شمس الرحمٰن فاروقی اور عملی تنقید

شمس الرحمان فاروقی کو اردو تنقید کے میدان میں غیر معمولی اعتبار حاصل تھا، وہ جدید دور کے سب سے ممتاز نقاد تسلیم کیے جاتے تھے۔مولانا الطاف حسین حالی سے لے کر آج تک اردو تنقید نے جو سفر طے کیا ہے اس میں شمس الرحمان فاروقی کی تنقیدی خدمات شاید سب سے زیادہ اہم ہیں۔اس غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر آج سے بہت پہلے اردو کے بڑے نقاد محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ لوگ اب فاروقی کا نام حالی کے ساتھ لینے لگے ہیں۔شمس الرحمان فاروقی کی علمی وادبی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر پہلو سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں تنقید کا بہت بڑا حصہ شاعری کی تنقید پر مشتمل ہے اور شاعری کی بیشتر تنقید براہ راست یا بالواسطہ غزل کے اصولوں سے کلام کرتی ہے، ایسا شاید اس لیے ہے کہ اردو شاعری کی پوری روایت میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہر ادبی مطالعے کے میدان میں نظریاتی تنقید اور عملی تنقید کا کام تقریباً ایک ساتھ ہوتا رہتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ نظریاتی تنقید کی ذیل میں جو مطالعے ہوتے ہیں ان میں نئ اصولی اور نظریاتی تنقید روز روز اور بہت جلد سامنے نہیں آتیں جب کہ عملی تنقید کی صورت میں نئے نئے انداز واسلوب اور نئے خیالات اکثر وبیشتر سامنے آتے رہتے ہیں۔نظریاتی تنقید جن اصولوں سے بحث کرتی ہے عام طور سے انہیں کی روشنی میں ادب پارے کی جانچ پرکھ ہوتی ہے اور انھیں کی بنیاد پر ادب پارے کے حسن وقبح کا تعین ہوتا ہے، یہی عمل دراصل عملی تنقید کہلاتا ہے۔

کسی بھی شاعر وادیب کا مطالعہ کرتے وقت نقاد عام طور پر انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھتا ہے جو بہت مقبول اور مروج ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہر نقاد عموماً نظریہ ساز نہیں ہوتا، اس لیے اسے یہ ضرورت بھی نہیں ہوتی کہ کسی شاعر وادیب کا مطالعہ اپنے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں کرے، وہ تو اکثر انھیں اصولوں کا سہارا لیتا ہے جو نظریہ ساز نقاد وضع کر چکے ہیں، اور جنھیں عام طور پر قبولیت حاصل ہو چکی ہوتی ہے۔اردو تنقید کا بیشتر سرمایہ اسی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔اس کے برخلاف شمس الرحمان فاروقی کی عملی تنقیدوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو بہت مختلف صورت حال سامنے آتی ہے۔فاروقی صاحب کے عملی تنقیدوں کی ایک عام خصوصیت

یہ ہے کہ انھوں نے بہت شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں پہلے سے رائج تصورات کو پوری طرح سے رد کیا ہے یا ان تصورات کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ جہاں جہاں انھوں نے مروج اور مقبول خیالات کی تردید کی ہے وہاں اپنے موقف کو نہایت مضبوط دلیلوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے دلائل ایسی اصولی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں کہ ان کی تردید بہت مشکل ہوتی ہے۔

شمس الرحمان فاروقی کے وہ مضامین جن میں اردو کے بڑے اور اہم ترین شعراء پر اظہار خیال کیا گیا ہے اردو کی عملی تنقید کو بالکل نئی جہت عطا کرتے ہیں۔ ہم سب کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اقبال ایسے شاعر ہیں کہ جن کے بارے میں شاید سب سے زیادہ تنقید لکھی گئی ہیں لیکن فاروقی صاحب اقبال کے عام تنقیدی مطالعات سے مطمئن نہیں ہیں۔ اقبال پر انہوں نے کئی مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان کے مضمون ''اقبال کا لفظیاتی نظام'' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ''اقبال بڑے شاعر تھے'' اس میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن وہ بڑے شاعر کیوں تھے اس سوال کا کوئی مفصل اور قرار واقعی جواب نہیں مل سکا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس سوال کے جواب میں عام طور پر جو مختلف باتیں کہی گئی ہیں، ان باتوں سے مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے سلسلے میں یہ سوال اس قدر اہم اور بنیادی ہے کہ اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بقول فاروقی صاحب اس سوال کے جواب میں زیادہ تر جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کا تعلق عام طور سے اقبال کی شعری ہنرمندی سے بہت کم اور ان کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں مثلاً ان کے فلسفیانہ افکار، قوم پرستی اور انسان دوستی کے تصورات وغیرہ سے بہت زیادہ رہا ہے۔ فاروقی صاحب یہ اصول بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بڑا مفکر اور بڑا شاعر ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں، بعض اوقات تو یہ متضاد اور متغائر اصطلاحات کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔'' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لیے عموماً ان کے فلسفیانہ افکار اور ایسے تصورات کو بنیاد بنا دیا گیا ہے، جن کا وجود شاعری یا بڑی شاعری کے لیے لازمی نہیں سمجھا جاتا۔ فاروقی صاحب کے تنقیدی تصورات جن بنیادوں پر قائم ہیں ان میں ادب پارے کے فنی لوازم کی حیثیت مرکزی ہے۔ وہ ادبی مطالعے میں زبان کے تخلیقی استعمال کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کے بارے میں بھی ان کا یہی خیال ہے کہ اقبال کی جو بڑائی اور عظمت ہے وہ ان کی شاعرانہ ہنرمندی اور زبان کو انتہائی تخلیقی طور پر بروئے کار لانے کا نتیجہ ہے۔

وہ اقبال کو اردو کے بدنصیب شعراء میں سرفہرست اسی لیے رکھتے ہیں کہ اقبال کے فنی کمالات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے ان کا مطالعہ زیادہ تر غیر فنی امور کی روشنی میں کیا گیا، جس سے ان کی حقیقی عظمت کا احساس و عرفان نہیں ہو سکا ہے۔

میر تقی میر کا مرتبہ اردو شاعروں میں سب سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف ہر دور میں ہوا ہے۔ اردو کے ہر قابل ذکر شاعر یہاں تک کہ غالب نے بھی میر کے آگے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد سے لے کر بیسویں صدی کے بڑے عرصے تک میر کا مطالعہ جس نہج پر ہوا ہے اس میں یہ بات تو تکرار کے ساتھ کہی جاتی رہی ہے کہ میر سب سے بڑے شاعر ہیں اور ہر لحاظ سے ان کی شاعرانہ عظمت مسلم ہے لیکن ان کی حقیقی عظمت کا اصل راز کیا ہے اس کی طرف عام طور سے کسی نے خاطر خواہ توجہ نہ کی چنانچہ میر کے بارے میں اس طرح کی باتیں بہت مشہور ہوئیں کہ میر جذبات کے شاعر ہیں ان کے یہاں فکر کی کمی ہے ان کا کلام نہایت سادہ سلیس ہے۔ ان کا پست کلام بے حد پست ہے اور بلند کلام بے انتہا بلند ہے۔ میر اپنی شاعری میں اپنے ذاتی غم کا بیان کرتے ہیں اور یہ کہ ان کی شاعری دل اور دلی کا مرثیہ ہے وغیرہ۔ ان میں سے زیادہ تر باتیں سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں کہیں اور جیسے جیسے ''آبِ حیات'' کی شہرت بڑھتی گئی یہ باتیں بھی مشہور و مقبول ہوتی گئیں۔ جن میں ان کی زبان و اسلوب اور فنی امور سے بحث کی گئی لیکن کچھ اسباب کی بنا پر ان مطالعات کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

مذکورہ بالا پس منظر کی روشنی میں شمس الرحمان فاروقی کا مطالعۂ میر غیر معمولی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ انہوں نے ''شعر شور انگیز'' کے عنوان سے میر کے ایک ہزار سے زیادہ منتخب اشعار کی نہ صرف مفصل شرح کی ہے بلکہ میر کے بارے میں مقبول لیکن بے بنیاد تصورات کی حقیقت واضح کر دی ہے۔

فاروقی صاحب کہتے تھے کہ میر کی شاعری کی سچی تفہیم اور اس کی خوبیوں کا حقیقی اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان کی ادبی اور شعری تصورات سے ہمیں پوری آگہی نہ ہو جو مشرق کی ادبی تہذیب بالخصوص فارسی اور اردو کی ادبی تہذیب میں جاری و ساری رہے ہیں۔ ان تصورات کو وہ کلاسیکی ادبی تصورات سے موسوم کرتے ہیں۔ چونکہ یہ تصورات مشرقی ادبی تہذیب کے زائیدہ ہیں اس لیے ان میں وہ عربی اور سنسکرت کے قدیم ادبی تصورات کو بھی شامل کرتے ہیں۔ انہوں نے اس نظریے کو بہت زور دے کر بیان کیا ہے کہ ہر ادبی تہذیب کے کچھ مخصوص تصورات ہوتے ہیں جن کا اظہار اس تہذیب کے مظاہر میں ہوتا ہے چونکہ ادب و شعر تہذیب کا نہایت پُر قوت مظہر ہے اس لیے ادب میں ان تصورات کی بھرپور کارفرمائی ہوتی ہے۔

اسی طرح نظیر اکبر آبادی کے بارے میں شمس الرحمان فاروقی جو خیالات پیش کیے ہیں وہ بھی مقبول عام خیالات سے بہت مختلف ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی میں نظیر کو قابل ذکر شاعر نہیں سمجھا گیا لیکن بیسویں صدی میں جب شعر و ادب کے بارے میں نئے تصورات رائج ہوئے اور خاص طور سے اردو میں نظم کی صنف کو اہمیت اور اعتبار حاصل ہوا تو نظیر اکبر آبادی کو بھی خاصی شہرت ملی اور نظیر اردو نظم کے نہایت اہم شاعر کی

حیثیت سے سامنے آئے پھر رفتہ رفتہ ان کی شاعرانہ اہمیت کا ذکر اس شد و مد کے ساتھ کیا گیا کہ لوگوں نے سمجھا کہ نظیر بھی میر، غالب اور اقبال کے مرتبے کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری بھی ان شعرا کی طرح عظیم شاعری ہے۔ چنانچہ نظیر کو بھی عام طور سے بڑا شاعر کہا جانے لگا ہے۔ فاروقی صاحب اس خیال سے شدید اختلاف کرتے تھے کہ نظیر اکبر آبادی بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ان کا یہ اختلاف محض اختلاف نہیں بلکہ اس کی بنیاد مستحکم دلائل پر ہے جن کا بیان فاروقی صاحب نے اپنے مضمون ''نظیر اکبر آبادی کی کائنات'' میں بہت واضح سورت میں کیا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ میں یہ بات شروع میں ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نظیر کو بڑا شاعر نہیں سمجھتا۔ اچھا شاعر بھی نہیں سمجھتا۔ وہ ایک اہم دلچسپ اور لائق مطالعہ شاعر ضرور ہیں لیکن اچھی اور بڑی شاعری ان کے دائرے سے باہر ہے۔ اس بیان سے جو اصولی بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی شاعر کا اہم دلچسپ اور لائق مطالعہ ہونا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ اچھا اور بڑا شاعر بھی ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص اچھا اور بڑا شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اہم دلچسپ اور لائق مطالعہ شاعر ہو سکتا ہے۔ فاروقی صاحب نے مذکورہ مضمون میں اسی نکتے کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ وہ نظیر کو اہم اور لائق مطالعہ شاعر اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے بقول نظیر نے مختلف شعرا کو براہ راست یا بالواسطہ نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اگر نظیر نہ ہوتے تو ہماری قومی حسیت کے بہت سے ایسے پہلوؤں کا اظہار جو محض نظیر کے یہاں ہوا ہے تشنۂ وجود رہ جاتا ہے۔ فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ نظیر کے یہاں موضوعات کی کثرت تو ہے لیکن انھیں جس طرح برتا گیا ہے اس میں تنوع کا بے حد فقدان ہے۔ ان کے یہاں الفاظ تو بہت استعمال ہوئے ہیں لیکن وہ نئی نئی شکلیں نہیں اختیار کرتے اور نئے نئے معنی کے حامل نہیں بنتے یعنی نظیر الفاظ کو محض ایک سطح پر برتتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اچھی شاعری کے مرتبے تک بھی نہیں پہنچ پائی۔

اسی طرح میر کے بارے میں شمس الرحمان فاروقی کا خیال ہے کہ میر کی شاعری کو بھی کلاسیکی ادبی تصورات کی روشنی میں پڑھنے کے بجائے مغرب کے ادبی تصورات کی روشنی میں پڑھا گیا یا پھر لوگوں نے اپنے مخصوص تعصّبات کی روشنی میں کلاسیکی شاعری یا بالخصوص میر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہمارے یہاں شاعری کے بارے میں جو تصورات عام ہوئے اور جن کی روشنی میں کلاسیکی شعراء کو پڑھنے کی تلقین کی گئی ان کا تعلق اردو کے کلاسیکی تصورات سے نہیں تھا اور چونکہ میر کی شاعری کلاسیکی اردو تہذیب میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے اور میر کا مرتبہ بھی سب سے بلند سمجھا گیا ہے، ان کا بیسویں صدی میں ناقص اور گمراہ کن تنقیدی مطالعہ کے نتیجے میں سب سے زیادہ نقصان بھی میر کو اٹھانا پڑا۔ یعنی میر کی عظمت کے گیت تو سب نے گائے لیکن یہ عظمت جن بنیادوں پر قائم ہے ان

نہ تو واضح احساس لوگوں کو ہوا اور نہ ہی ان کا مدلل بیان کیا جا سکا۔ یہ ایسی کمی تھی جس کا ازالہ اسی صورت مین ممکن تھا کہ میر کی شرح کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شعری تصورات اور ان سے متعلق امور پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جاتا۔ چنانچہ فاروقی صاحب ''شعر شور انگیز'' کی چاروں جلدوں میں جو نہایت مفصل دیباچے لکھے ہیں ان میں یہی کوشش کی ہے کہ مشرق کی شعری تصورات کے جتنے اہم اور بنیادی پہلو ہیں وہ واضح صورت میں سامنے آ جائیں۔ اس عمل کو فاروقی صاحب کلاسیکی شعریات کی بازیافت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کلاسیکی شعریات سے مکمل آگہی اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر میر ہی نہیں بلکہ کلاسیکی دور کے کسی بھی قابل ذکر شاعر کو اچھی طرح نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کی خوبی اور خامی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کا مطالعۂ میر اس لحاظ سے خاص انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں نظریاتی اور عملی دونوں طرح کی تنقیدیں بیک وقت بروے کار لائی گئی ہیں۔

''شعر شور انگیز'' کے دیباچوں میں پہلے کلاسیکی شاعری بالخصوص غزل کے بارے میں اصولی اور نظریاتی بحثیں کی گئی ہیں اور پھر انھیں کی روشنی میں اشعار کی شرح کر کے میر کی عظمت کا حقیقی احساس و عرفان کرایا گیا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ میر کے بارے میں مقبول عام خیالات کو دلیلوں اور مثالوں کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔ مثلاً معنی آفرینی جو غزل کی شعریات کی اہم ترین صفات میں سے ایک ہے، اسے عام طور سے غالب کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے اور اسی بنا پر غالب کو تہہ دار شاعر ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن فاروقی صاحب نے ثابت کیا ہے کہ معنی آفرینی کو محض غالب کے ساتھ منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ میر کی بیشتر شاعری معنی آفرینی کی حامل ہے اور چونکہ کیفیت کی صفت میر کے یہاں مستزاد ہے اس لیے میر بیک وقت جذبہ و احساس کے ساتھ ساتھ فکر و خیال بھی متاثر کرتے ہیں۔ معنی افرینی کے ذریعہ میر کے کلام میں جو معنی کی کثرت اور تہہ داری پیدا ہوتی ہے وہ عام طور سے شعر کی اوپری سطح پر نظر نہیں آتی جیسا کہ غالب کے یہاں ہوتا ہے اسی لیے لوگوں کو میر کے یہاں سادگی اور معنی کے اکہرے پن کا دھوکہ ہوتا ہے۔

فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ میر کا بیشتر کلام کیفیت اور معنی آفرینی کا ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جس کی مثال دوسرے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ غالب کا کلام بھی اس صفت سے عاری ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شعراء کے مطالعے میں شمس الرحمان فاروقی نے میر تقی میر کے بعد سب سے زیادہ توجہ غالب پر صرف کی ہے۔ غالب پر کئی مضامین کے علاوہ انہوں نے ان کے ۱۳۸ اشعار کی شرح بھی کی ہے جو ''تفہیم غالب'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور ''یادگارِ غالب'' میں

بہت سے اشعار کی شرح کرتے ہوئے کئی ایسے نکات بیان کیے ہیں جو غالب فہمی میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔ حالی سے اب تک غالب کی متعدد شرحیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی موجودگی میں شمس الرحمان فاروقی نے اپنی شرح غالب کا جو مقصد بیان کیا ہے۔وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی شرح کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔دوسری طرف ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شارحین غالب سے عموماً کیا کیا کوتاہیاں ہوئی ہیں۔اس سلسلے میں فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ غالب کے تمام شارح مغربی ادب سے مرعوب تھے۔لیکن مغربی اصول نقد بیان کی واقفیت واجبی تھی۔جو کچھ وہ مغربی ادب جانتے تھے اس کی روشنی مین ان کو غالب کے یہاں بعض کمزوریاں نظر آتی تھیں اور غالب کی بعض خوبیاں انہیں عیب معلوم ہوتی تھیں۔

فاروقی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ مشرقی شعروادب کے ساتھ ساتھ مغربی شعروادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے،لیکن وہ مغرب سے مرعوب نہیں ہوتے۔انہوں نے غالب کی شرح کا جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود کہتے تھے کہ سب سے پہلے اس بات سے سروکار رکھتا ہوں کہ مشرقی شعریات کی رو سے کسی شعر میں کیا خوبیاں ہیں، پھر یہ دیکھتا ہوں کہ مغربی شعریات کی رو سے اور کیا کہا جانا ممکن ہے۔ظاہر ہے یہی طریقہ کار انہوں نے غالب کے علاوہ میر اور اردو کے دیگر شعراء کے مطالعے میں روا رکھا ہے۔دیگر نقادوں کے برخلاف وہ مغربی تنقید کے اصولوں کو ترجیحی حیثیت نہیں دیتے۔لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ان سے چشم پوشی کرتے ہوں۔غالب کلام چونکہ مشرقی شعریات کا پیدا کردہ ہے اس لیے یہاں بھی مشرقی شعریات کی روشنی میں ہی اس کی خوبیوں اور خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے۔البتہ جہاں جہاں غالب کا کلام میں ایسے پہلو نکلتے ہیں جن کا تعلق مغربی تصورات سے بھی قائم ہوسکتا ہے وہاں ان کا ذکر بھی خصوصیت سے ہوا ہے۔"تفہیم غالب" کے علاوہ شمس الرحمان فاروقی نے غالب پر جو مضامین لکھے ہیں ان میں "غالب کی مشکل پسندی"، "غالب اور جدید ذہن" اور "خیال ہند غالب" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔اول الذکر مضمون میں فاروقی صاحب غالب کی مشکل پسندی کے تعلق سے کئی بنیادی باتیں کہتے ہیں۔پہلی بات یہ ہے کہ غالب کا مزاج ہی چونکہ مشکل پسند تھا اس لیے ان کا سارا کلام از اول تا آخر اس صفت کا آئینہ دار ہے۔یہاں وہ لفظ مشکل کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ غالب کے یہاں جس صفت کو لوگ عام طور سے اشکال سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل ابہام ہے۔اشکال اور ابہام میں جو باریک فرق ہے اس کی طرف عموماً توجہ نہیں کی جاتی۔فاروقی صاحب اس خاص معنی میں مشکل کی صفت کو شعر کا عیب سمجھتے ہیں اور ابہام کو شعر کا حُسن قرار دیتے ہیں۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے تھے کہ میں نے غالب کے کلام کے ساتھ مشکل کی صفت عام معنوں میں استعمال کی ہے،ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام کو مشکل نہیں بلکہ مبہم سمجھتا ہوں اور ابہام کو اشکال سے زیادہ بلند منصب کی چیز سمجھتا ہوں۔ابہام کی وضاحت انہوں نے اس طرح کی ہے کہ اس میں معنی کم وبیش پوری طرح اپنے وجود کا استحکام کرتا ہے جس سے شعر کثیر

المعنی ہوجاتا ہے اور یہ شعر کی بڑی خوبی کا ضامن ہے اس کے برعکس مشکل شعر کی حیثیت ایک معمے کی سی ہوتی ہے جس کے حل ہوتے ہی شعر میں معنی کے امکانات کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔اس اعتبار سے غالب کے یہاں مشکل کا لفظ اپنے اندر وہ صفت رکھتا ہے جسے بقول فاروقی مبہم کہنا زیادہ صحیح ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کی شاعری کو جدید ذہن سے حد درجہ ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں غالب کے کلام کا بنیادی اسلوب استفہامی ہے۔غالب انسان اور کائنات سے متعلق تسلیم شدہ حقائق کے بارے میں بار بار سوال قائم کرتے ہیں۔ان کا یہ انداز جدید دور کے انسانی مزاج اور اس کی بیچینی کو ظاہر کرتا ہے۔بیسویں صدی میں دنیا جن غیر معمولی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ان کے اثرات غالب کے زمانے میں ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ان اثرات کو غالب نے نہ صرف شدت سے محسوس کیا بلکہ انھیں اپنے تخلیقی مزاج کا حصہ بنا کر پیش بھی کیا۔

یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں غالب کا رشتہ نئے ذہن ومزاج سے قائم ہوا اور اس طرح کلام غالب کی نئی نئی معنویتیں سامنے آئیں۔شمس الرحمان فاروقی اردو ادب کے ٹی۔ایس۔ایلیٹ تھے اور اردو ادب پر ان کے اثرات بہت گہرے تھے ادبی تخلیق اور ادبی تنقید میں ایلیٹ کی طرح ہی انھوں نے خود کو سب سے ممتاز ومنفرد رکھا۔ایلیٹ کی طرح انھیں کئی علوم پر عبور حاصل تھا اور انہوں نے ثبوت واعتماد کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اردو کے دیگر ناقدین کے برعکس فاروقی صاحب نے الفاظ رائیگاں کیے بغیر تجزیاتی انداز میں لکھا۔ان کی ادبی تخلیقات ان کی گہری سیاسی سماجی وتاریخی شعور کا عکاس ہیں۔ان کا نقد وتبصرہ،تحقیق میں محنت ولگن اور دیدہ ریزی کا ثبوت ہے جس کے باعث علم وادب کی دنیا میں قومی وبین الاقوامی سطح پر ان کی قدر ومنزلت بہت بلند ہے۔شمس الرحمان فاروقی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔خیال کی ندرت اور اوریجنلٹی ان کا خاصہ تھی اور اردو اور انگریزی کے ساتھ ہندی کی ادبی دنیا بھی اس سے خاطر خواہ متعارف تھی۔انھوں نے ادب،تنقید،ترجمہ نگاری اور متعدد دیگر میدانوں میں اعلیٰ پایہ کی تخلیقات پیش کر کے اعلیٰ مثال قائم کی۔

◂◂ ● ▸▸

Depatment of Urdu
Dehli University
Mobile No 8826506315
Mail id nasrasultanadu@gmail.com

● ڈاکٹر سیفی سرونجی

شمس الرحمٰن فاروقی: ادب پر موت کا شب خون

کسی بھی ادبی رسالہ کی اہمیت اور اس کا معیار ایڈیٹر کی قابلیت اور صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ نیاز فتحپوری کا دبدبہ صرف اس لیے تھا کہ نیاز فتح پوری ایک عالم فاضل اور نہایت ہی قابل شخصیت کے مالک تھے۔ ادبی دنیا میں جو چند معتبر ادبی رسائل ہیں ان میں شب خون کی اہمیت اور معیار اعلیٰ درجہ کا صرف اس لئے تسلیم کیا جاتا تھا کہ اس کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی جیسے دانشور نقاد نکالتے تھے۔ جس طرح ہر پرچہ میں ایڈیٹر کی بھی کچھ مختلف تحریریں شائع ہوتی ہیں اور ان تحریروں کو پڑھ کر اس کی شخصیت، علمیت اور قابلیت اُجاگر ہوتی ہے، اس کے تبصروں سے، اداریوں سے اور دیگر ادبی و تحقیقی مضامین سے، اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کی قابلیت، شخصیت اور علمیت ان کے ہر مضمون اور ہر تحریر میں نمایاں نظر آتے تھے، چاہے وہ اداریے ہوں یا وہ کسی اور نوعیت کے مضامین ہوں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے ان کی ساری علمیت اور قابلیت نمایاں ہوجاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کا رعب اور ان کی قابلیت کی دھاک اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی چھوٹے موٹے شاعر ادیب اور نقاد کا تو ان کے دربار میں گذر تک نہیں ہوتا تھا اور ان کے سامنے کسی کو منہ کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی، اس لیے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی عالمانہ نظر اتنی گہری تھی کہ کوئی بھی ادبی موضوع ہو، کوئی واقعہ ہو، یعنی تاریخی، ادبی اور زبان سے متعلق کوئی بھی لسانی خامیاں یا کوئی پہلو ہو، اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا اس لیے کہ وہ کئی زبانوں پر نہ صرف یہ کہ عبور رکھتے تھے، بلکہ ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ باریک سے باریک اور نازک سے نازک معاملات میں بھی وہ اپنے علمی دلائل سے اس طرح بحث کرتے تھے جیسے اس موضوع پر انہوں نے برسوں تحقیق کی ہو۔ شب خون میں چند کالم ایسے ہوتے تھے جو دیگر ادبی رسائل میں نظر نہیں آتے تھے، مثلاً سوانحی گوشوں کا انتخاب اور کسی بھی شعری یا ادبی موضوع پر ان کے مدلل جواب جو وہ شب خون کے مکتوبات کے کالم میں دیتے تھے جنہیں پڑھ کر بڑے سے بڑے نقاد شاعر ادیب نہ صرف حیران رہ جاتے تھے، بلکہ ان کی قابلیت کے آگے سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں۔ اگر کسی شعر پر کسی نے غلطی سے کوئی اعتراض کردیا تو اس کے جواب میں شمس الرحمٰن فاروقی سو دو سو سال پرانے شاعروں کے درجنوں اشعار اردو کے ہی نہیں فارسی کے بھی سند کے طور پر پیش کردیتے تھے اور اعتراض کرنے والے

کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑ دیتے تھے اور وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے سوائے شرمندگی کے کچھ نہیں کر پاتا۔ شب خون کے یہی چند صفحات فاروقی صاحب کی قابلیت اور شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت ہوتے تھے۔ ورنہ شب خون کی عام تحریریں مثلاً غزلیں، نظمیں، افسانے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ قاری بجائے حظ اٹھانے کے بور ہوکر انھیں ایک طرف رکھ دیتا تھا۔ جہاں ایک طرف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تحریروں نے ''شب خون'' کو اعلیٰ معیار بخشا ہے وہیں دوسری طرف ایسے ایسے خشک مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے چھاپ کر قاری کو بھی الجھن میں مبتلا کردیا تھا، اس لیے شب خون کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسالہ پڑھے لکھے شاعروں، ادیبوں کے لیے ہی وجود میں آیا تھا اور ویسے بھی بڑے بڑے لوگوں نے ادب کو بھی مخصوص پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہی قرار دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک بار لکھا تھا کہ میرؔ، غالبؔ کچھ نہیں بلکہ عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی بڑا شاعر ہے لیکن چند برسوں میں ہی پتہ چل گیا کہ میرؔ، غالبؔ کیا ہیں اور نظیر اکبرآبادی کیا ہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ادب پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہی زیادہ سمجھا گیا ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی اسی نظریے کو پیش کرنے میں کوشاں تھے۔ ان کے نزدیک ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والے کو پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری تھا اور شب خون اس کی زندہ مثال تھا۔ شب خون کے وہ کالم جن میں فاروقی صاحب کی علمیت اور ان کے گہرے مطالعہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں، وہ کالم ہیں شب خون کے خطوط اور ان میں فاروقی صاحب کے ریمارکس جوان کے رسالہ شب خون میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے سب سے زیادہ معلوماتی ہوتے تھے۔ دوسرا کالم سوانحی گوشے جن میں وہ دنیا کی ان عظیم ہستیوں کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کرتے تھے جن سے اردو والے ناآشنا ہیں اور شب خون کے وہ اداریے جن میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوتی ہے جسے اگر اردو والے پڑھتے رہیں تو ان کی شاعری ان کی سوچ اور ان کی تحریروں میں یقیناً ایک نمایاں تبدیلی آجائے مثلاً شب خون کے شمارہ نمبر ۲۱۵ میں Kinfried Noth 1995 کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس کی چند سطریں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

> ''(علامت) ''بشری علوم کے میدان میں علامت ایک ایسی اصطلاح ہے جس پر معنی اور معنویت کے بہت سے بوجھ لاد دیئے گئے ہیں۔ اگر وسیع ترین مفہوم میں دیکھا جائے تو علامت یعنی Symbol اور نشان یعنی Sign میں کوئی فرق نہیں۔ اس مشکل کے باوجود کہ علامت کی اصطلاح بذات خود ایک مبہم اصطلاح ہے لیکن اس کی جو تعریفیں باریکی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ان کو تین شقوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ علامت رسومیاتی قسم کا نشان ہے۔ دوسرے یہ کہ علامت

تصویری قسم کا نشان ہے اور تیسری شق یہ کہ علامت معنی خیز اور معنی کی طرف اشارہ کرنے والا نشان ہے۔ آخری دو تعریفوں کی روشنی میں علامت کو جمالیات اور ثقافتی مطالعات کے میدانوں میں کلیدی تصور کی حیثیت حاصل ہے۔ اِن میدانوں میں علامت کا مفہوم کچھ اور معنی کو بھی محیط ہے۔ مثلاً لفظی نشان کے طور پر علامت یا علامتی نشان کے طور پر علامت (مثلاً 0 علامت ہے عدم کی) یا ٹریڈ مارک کے طور پر علامت (کوئی Logo) ہے۔ جھنڈے (Banner) اور مہر (Signet) کے طور پر علامت اور پھر آیت (Emblem) کے طور پر علامت۔ یعنی علامت اس تصویر کو بھی کہیں گے جس سے کوئی مخصوص معنی مستفاد ہو سکتے ہیں۔ (مثال کے طور پر اگر کسی تصویر میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہاتھ میں ہنسیا لئے ہوئے دکھایا گیا ہے تو یہ علامت ہے موت یا موت کے فرشتے کی) علامت کی ایک اور شق تمثیل (Allegory) بھی ہے۔''

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فاروقی صاحب اپنے شب خون کے لیے کیسا قاری چاہتے تھے۔ اس میں چھپنے والے شاعروں، ادیبوں کی بات تو دوسری ہے شب خون کے قاری کو کتنا ذہین ہونا چاہیے۔ یہ بات فاروقی صاحب کے اداریوں میں، ان کے مضامین اور مکتوبات کے جوابات میں محسوس کی جا سکتی تھی کہ شب خون کے قاری کو علامت، استعارات اور دنیا کے دیگر علوم فنون کی پوری معلومات ہونا چاہیے۔ وہی ادب کی بات کریں، وہی مضامین اور دیگر علمیات، لسانیات یا دیگر موضوعات پر گفتگو کریں ورنہ شاعری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر بلاوجہ لادنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں۔ ان کے اسی نظریے کو دیکھتے ہوئے بیشتر کم پڑھے لکھے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ مخالفت پر اُتر آتے تھے لیکن ان سے مقابلہ کرنے کے لیے جس قابلیت کی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی میں نظر نہیں آتی تو گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں حالانکہ ان تمام باتوں سے شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ویسے بھی وہ ہر کس و ناکس کا نوٹس نہیں لیتے نہ کسی کو جواب دیتے۔ یہی اُن کی علمیت اور قابلیت کی نمایاں پہچان تھی۔ ویسے حسب ضرورت شب خون میں اس طرح کے خطوط کے جواب میں وہ ایک دو سطروں میں ہی اتنا کچھ کہہ دیتے تھے کہ پھر کسی کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کچھ لکھ سکے۔ وہ سامنے والے کو اپنے علمی دلائل سے اس طرح مطمئن کرتے تھے کہ اسے ان کی بات تسلیم کرنا پڑتی تھی۔ چاہے وہ مسئلہ زبان کا ہو یا کسی پرانے سے پرانے شاعر کے شعر کا ہو یا کسی افسانے یا مضمون کا ہو۔ شب خون کے شمارہ نمبر ۲۱۷ میں گیان چند جین کا ایک خط شائع ہوا ہے۔

''فروری ۱۹۹۸ء کے شب خون میں آپ نے مجھ صغر الشعرا کی غزل کو سب سے پہلے جگہ دے کر مجھے نوازا بھی اور محجوب بھی کیا۔ میں اس مقام کے لائق نہیں۔ غزل

میں کتابت کے چند سہو در آ گئے ہیں۔ ساتویں شعر میں ''مغلوب'' دراصل ''مفلوج'' اور آخری شعر میں ''زمن'' کی جگہ ''چمن'' ہونا چاہیے۔ آپ نے عنوان دیا ہے ''جنت سے جنت تک''، ''قیامت سے قیامت تک'' کی یاد آ گئی۔ میرے نزدیک نہ ہندوستان جنت ہے نہ امریکہ۔ میں نے اس غزل کا ایک مصرع اصلاً یوں کہا تھا:

ہوئی ہے جنتِ ارضی بھی میرے واسطے دوزخ

لیکن نئے مستقر کو دوزخ کہنا ناشکرا پن معلوم ہوا۔ اسے بدل کر ''بے رس'' کر دیا۔

میں نے اس قماش کی ایک اور غزل میں یہ دو شعر کہے ہیں:

یہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، سمجھتا تھا دل سادہ
یہاں آ کر طبیعت رہتی ہے افتادہ افتادہ
دکھائے سیمیاگر کی طرح کیوں سبز باغ اتنے
نئی دنیا! فقط اک خواب ہی نکلا ترا وعدہ

بریں وجوہ یہ عنوان میرے عندیے کا عکاس نہیں۔

آپ نے اپنے تجزیے کے آخر میں لکھا ہے:

''معائب سخن کی وہی اہمیت ہے جو مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری کی یعنی ان کتابوں سے اختلاف ممکن، بلکہ ضروری ہے۔ لیکن.....الخ.....(ص ۳۳)

آپ کی سیر چشمی سے شہ پا کر میں بھی آپ کے عالمانہ مضمون سے کہیں کہیں اختلاف رکھتا ہوں لیکن ایسے مقامات کم ہیں۔''

گیان چند جین

یہ خط مشہور نقاد گیان جین کا ہے جن کا مقام و مرتبہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس خط میں گیان چند جین نے ایک چھوٹے سے عنوان سے متعلق صرف اتنا لکھا تھا کہ آپ نے جنت سے جنت تک کا عنوان کیوں لگایا جب کہ یہ عنوان میرا لکھا ہوا نہیں ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے گیان چند جین صاحب کو بہت خوبصورت طریقے سے اس عنوان کی اہمیت کو سمجھا دیا اور ساتھ میں نوٹ بھی لگا دیا وہ لکھتے ہیں:

''عنوان ہمارا لگایا ہوا تھا، اُسے ہم نے ایک طرح سے شاعر کی طرف سے طنزیہ اشارہ بتایا تھا، ہندوستان کو جنت نشان کہتے ہی تھے اور امریکہ خاص کر کیلیفورنیا کو دنیا میں جنت کہا جاتا ہے۔''

اس طرح کے سینکڑوں مسائل علمی، ادبی، لسانی اور دیگر علوم وفنون سے متعلق فاروقی صاحب کے جوابات ایسے ہوتے تھے کہ بڑے سے بڑے عالم فاضل کو بھی ان کی بات تسلیم کرنا پڑتی تھی۔ اردو دنیا میں ایسے کتنے ایڈیٹر ہیں جو فاروقی صاحب جیسی صلاحیت رکھتے ہوں؟ اب ظاہر ہے جس رسالہ کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی ہوں گے اس کا معیار کیسا ہوگا اور کیسا ہونا چاہیے۔ آج ہندوستان میں درجنوں اردو رسائل نکلتے ہیں اور ان رسائل میں چھپنے والے مضامین، اداریے، تبصرے پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اردو رسائل کی ان دنوں ایک ایسی ہوڑ جاری ہے کہ ہر ایڈیٹر جلد سے جلد شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں کئی ایڈیٹروں کی صلاحیتوں کا بھانڈا ابھی پھوٹ جاتا ہے۔ اس لیے کہ صرف رسالہ نکالنے سے ہی بڑا شاعر ادیب نہیں ہوجاتا لیکن آج کل ہر ایڈیٹر کے پاس تبصرے کے لیے درجنوں کتابیں آتی ہیں اور وہ ان پر چھوٹے موٹے مضامین اور تبصرے لکھ کر نقادوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہتا ہے اور دو چار سال ادھر ادھر سے قرض لے کر یا اپنی ذاتی پونجی لگا کر ایڈیٹروں کی فہرست میں شامل ہوجاتا ہے لیکن ایک اچھے رسالہ کے لیے ایڈیٹر کو اتنی معلومات ہونا چاہیے کہ وہ کسی کے ادبی مقام ومرتبہ کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب پر بھی اس کی گہری نظر ہو، تاکہ وہ یہ دیکھ سکے، سمجھ سکے کہ اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب میں کیا کچھ لکھا جارہا ہے اور کیسا لکھا جارہا ہے اور پھر اس میں تجزیہ کرنے کی یہ صلاحیت ہونا چاہیے کہ یہ اچھا ہے، یہ برا ہے اور یہ ساری صلاحیتیں مل کر شمس الرحمٰن فاروقی میں یکجا ہوگئیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رسالہ 'شب خون' میں عالمی ادب سے متعلق مضامین اور دیگر تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں اور فاروقی صاحب کے اداریے ان کے مضامین اور مخصوص شخصیات پر گوشوں کی اشاعت اس کا ثبوت ہیں۔ کبھی وہ کسی اداریے میں لکھتے تھے کہ انگریزی ادب میں جس طرح تبصرے کتابوں پر آتے ہیں اگر اس طرح کے تبصرے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر آنے لگیں تو لوگ تبصروں کے لیے کتابیں پہنچانا ہی بند کردیں، اس لیے کہ ان میں سچ کو برداشت کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ ہر مصنف، شاعر، ادیب اپنی کتاب پر صرف اپنی تعریف پڑھ کر خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ خوشی کتنی عارضی ہوتی ہے اس بات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فاروقی صاحب سوانحی گوشوں کے کالم میں سینکڑوں برس پرانے انگریزی عربی، فارسی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں کی مختلف اور بڑی معنویت لیے ہوئے پوشیدہ گوشوں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ شب خون کے شمارہ نمبر ۲۱۷ میں جیمس جوائس اور سیموئل بیکٹ کا ایک مختصر واقعہ شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو:

''جیمس جوائس جن دنوں پیرس میں مقیم تھا اور اپنے ناول Fennegans wake پر کام کررہا تھا۔ سیموئل بیکٹ وہاں پہلے سے موجود تھا اور بیکٹ کا اس سے ربط ضبط کسی عقیدت مند شاگرد اور حاضر باش کی طرح کا تھا۔ جوائس

کی آنکھیں اس وقت بہت خراب ہوچکی تھیں اور وہ اپنا ناول روزانہ بیکٹ کو املا کراتا تھا۔ ایک دن املا کے دوران کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بیکٹ اپنے انہماک کے باعث دستک کو سن نہ سکا تھا لیکن جواب میں جب جوائس نے اسی عام املائی لہجے میں کہا ''آجاؤ'' (Come in) تو بیکٹ نے گمان کیا کہ یہ بھی املا کا حصہ ہے اور اس نے وہ فقرہ یعنی Come in بھی ویسے ہی لکھ دیا۔ بعد میں جب جوائس نے املا کئے ہوئے اوراق بیکٹ کی زبانی سنے اور بیکٹ نے Come in پڑھا تو جوائس نے چونک کر پوچھا ''یہ کیا ہے''؟ بیکٹ نے جواب دیا کہ آپ ہی نے لکھوایا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ فقرہ Come in جوائس نے کس وقت بولا تھا۔ جوائس کچھ دیر تک چپ چاپ غور کرتا رہا، پھر بولا ''ٹھیک ہے اسے رہنے دو۔''

لکھنے کو تو یہ واقعہ ایک معمولی واقعہ ہے کہ املا بولتے وقت ایک لفظ (Come in) تھا جو بے خودی میں لکھنے والا لکھ گیا۔ لیکن اس واقعہ کی تہہ میں کتنی معنویت اور کتنی گہرائی چھپی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بادشاہ کو ایک اچھے منشی کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اپنی پڑوسی ریاست سے ایک منشی کو بلوانے کے لیے اس کی تحریر نمونے کے طور پر منگوائی۔ اتفاق سے جس منشی کو بلوایا گیا تھا وہ اتنا تنگ دست تھا کہ اپنے نمونے کی تحریر میں بھی ایک لفظ ایسا لکھ گیا کہ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ نمونے کی تحریر لکھتے وقت اس کے گھر میں فاقہ تھا اور بچے اس سے یہی کہہ رہے تھے کہ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ وہی تحریر اس نے نمونے کے طور پر اس بادشاہ کو بھیج دی۔ یہ تحریر پڑھ کر اس بادشاہ نے لکھا کہ جب تمہارا منشی ہی خوش حال نہیں ہے تو تمہاری رعایا پر کیا گذرتی ہوگی۔ بعد میں کیا ہوا اس تفصیل میں نہیں جانا، کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح ایک لفظ آٹا نہیں ہے اور جس طرح جیمس کا بولا ہوا لفظ Come in آگے چل کر ایک تاریخ بن گیا اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے اداریے، ان کے پیش کیے ہوئے سوانحی گوشے اور خطوط کے کالم میں دیئے گئے مختصر نوٹ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی فاروقی صاحب نے غلط لکھ دیا تو وہ مستند تسلیم کرلیا جاتا ہے جس طرح جیمس کے ناول میں لفظ Come in غلطی سے لکھ دیا گیا تھا لیکن وہی مستند بن گیا اس لیے کہ یہی تو اہل زبان ہوتے ہیں جن کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ برسوں پہلے شاید میر تقی میرؔ نے ان کے لئے ہی یہ شعر کہا تھا:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

لیکن آج شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے بیچ نہیں رہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ ان کے جانے سے اردو دنیا میں جو خلاء پیدا ہوئی ہے اور جو نقصان ہوا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں ذاتی صدمہ بھی پہنچا ہے، چونکہ 'انتساب عالمی' کو ہمیشہ سے ہی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

◂◂ ● ▸▸

Quarterly"Intesab Aalami",Sironj(464228)MP
Mob-9425641777
Email-saifi.sironji2015@gmail.com

نام کتاب: شکست کی آواز صنف: ناول مصنف: عبدالصمد سن اشاعت: ۲۰۱۳ صفحات: ۳۸۴ قیمت: ۳۰۰/روپئے		نام کتاب: آتش رفتہ کا سراغ صنف: ناول مصنف: مشرف عالم ذوقی سن اشاعت: ۲۰۱۳ء صفحات: ۲۰۷ قیمت: ۷۰۰/روپئے
نام کتاب: لے سانس بھی آہستہ صنف: ناول مصنف: مشرف عالم ذوقی سن اشاعت: ۲۰۱۳ء (دوسرا ایڈیشن) صفحات: ۴۸۰ قیمت: ۴۰۰/روپئے		نام کتاب: ادھورے چہرے صنف: افسانہ مصنف: دیپک بدکی سن اشاعت: ۲۰۱۴ء (تیسرا ایڈیشن) صفحات: ۱۵۲ قیمت: ۱۷۵/روپئے
نام کتاب: چنار کے پنجے صنف: افسانہ مصنف: دیپک بدکی سن اشاعت: ۲۰۱۴ (دوسرا ایڈیشن) صفحات: ۱۶۸ قیمت: ۲۰۰/روپئے A-102,S G Impresion, Sector -4/B,Vasundhara Ghaziabad-201012(UP) Mob:+91-9868271199		نام کتاب: ویدک ادب اور اردو صنف: تحقیق مصنف: ڈاکٹر اجے مالوی سن اشاعت: ۲۰۱۲ء (پانچواں ایڈیشن) صفحات: ۱۷۶ قیمت: ۳۰۰/روپئے 1278/1Malviya Nagar,Allahabad-211003(UP) Mob:+91-9451762890

● ابو محمد

جدیدیت کا علم بردار: شمس الرحمٰن فاروقی

ادبی دنیا میں شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک الگ نام ہے۔ انفرادیت ان کی شناخت ہے۔ وہ قدآور ناقد، اعلیٰ پایہ کے محقق، مستند تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور نامور فکشن نگار بھی ہیں۔ چالیس برسوں تک ایک معیاری رسالہ کی سرپرستی اور ادارت سنبھال کر اپنے آپ کو صف اول کے مدیر ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا۔ ان کی شخصیت اپنے آپ میں ایک انجمن تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی پیدائش 1934ء میں اتر پردیش کے آدم خیز بستی پرتاپ گڑھ میں ہوئی۔ بُنیادی طور پر وہ انگریزی ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیمی فراغت کے بعد پہلی کوشش میں ہی سول سروسز کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور 1958ء میں پوسٹل ڈپارٹمنٹ میں ملازمت شروع کی اور ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ سرکاری ملازمت اور انگریزی سے لگاؤ کے باوجود اردو کو ہی اپنی ادبی زندگی کا محور بنایا۔ ملازمت میں رہتے ہوئے انہوں نے ایک بڑا کام کیا۔ مرزا غالب، فراق گورکھپوری اور مولانا حسرت موہانی کے نام سے ٹکٹ جاری کروایا۔ یہ ان کی اردو سے محبت کی نشانی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد آزادی کا سورج لہو کی گنگا میں نہا کر سیاسی اُفق پر نمودار ہوا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ حالات بدل گئے۔ فضا بدل گئی۔ گنگا جمنی تہذیب کے سارے بندھن، رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔ نئی نسل نئے ماحول میں بے چینی، غیر یقینی اور خوف دہشت کی شکار تھی۔ سماج کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہونے لگے۔ ترقی پسند تحریک کی سانسیں ڈوبنے لگیں۔ ترقی پسند تحریک کی اکھڑتی سانسوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا تخم پاشی شروع ہوگئی۔ خودرو پودوں کی طرح یہ رجحان پروان چڑھنے لگا۔ تخلیق کی سمتیں بدلنے لگیں۔ ادب کی سرخی زائل ہونے لگی۔ مخصوص عقائد اور نظریات سے انحراف کر کے ادباء اور شعراء اجتماعیت پر انفرادیت پر فوقیت دینے لگے۔ فلک شگاف نعروں، سیاسی پروپگینڈا اور مخصوص خیال کی ڈفلی بجانے کو معیوب سمجھا جانے لگا۔ ادب کی سمت کروٹ بدل کر زندگی کے مختلف مسائل کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اس وقت ہندوستان میں رسائل اور جریدوں کی تعداد کافی کم ہوگئی تھی۔ نگار اور مخزن پاکستانی ہو گئے۔ ہندوستان میں آج کل، شاعر، سب رس، نیا دور، سوغات، کتاب نما چند رسالے رہ گئے۔ جن کو

انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا تھا۔اس مایوس کن ماحول میں فاروقی صاحب نے جون 1966ء میں الہ آباد سے ''شب خون'' کا اجراء کیا۔ چونکہ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اس لئے مدیر کے حیثیت سے کسی دوسرے صاحب کا نام ہوا کرتا تھا۔''شب خون'' کا تدوین وتزئین خود ہی کرتے تھے۔ پہلے شمارہ کے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین تھے۔''شب خون'' ایک معیاری رثالہ ثابت ہوا۔اور بلا ناغہ چالیس برسوں تک شائع ہوتا رہا۔ پہلے ہی شمارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی، رام لعل، سلیمان اریب، سید احتشام حسین، حبیب صدیقی اور عمیق حنفی جیسے اہلِ قلم کی تخلیقات نے اردو کے شیداؤں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ پہلا ہی شمارہ اتنا زوردار تھا کہ ادبی دنیا میں ایک جھما کے ساتھ جدیدیت کا چراغ جل اٹھا۔اگلے شمارے میں جمیل مظہری، راجندر سنگھ بیدی، رفیعہ منظور الامین، واجدہ تبسم کی تخلیقات نے اور جلا بخشی۔ یہ رسالہ جدیدیت کا علم بردار بن گیا اور فاروقی صاحب اُس کے روح رواں۔شمس الرحمٰن فاروقی ایک تحریک کا نام بن گیا۔انہوں نے کہنہ مشق ادیبوں کو جوڑ کر رکھا اور نئے قلم کاروں کی بھر پور ہمت افزائی کی۔صحت مند مشورے دے۔اس طرح سیکڑوں ادباء اور شعراء کے Mentor بن گئے۔شب خون کی ابتدائی شماروں نے ہی اردو دُنیا کی ادبی فضا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔اس نے ادبی جمود اور تعطل کو توڑا۔ادب کو ترقی پسند تحریک کے بھنور سے نکالا۔ اُن کی رہنمائی میں نئی زبان، نئے استعارے، نئی تشبیہات اور نئی علامتوں کے ساتھ شاعری شروع ہوئی۔فکشن میں بھی نئے تجربات ہوئے۔تنقیدی رویوں میں بھی تبدیلی آئی۔دراصل اس رسالے نے مارکسی نظریات پر شب خون مارنے کی کامیاب کوشش کی۔ڈاکٹر انیس صدیقی لکھتے ہیں۔

''شب خون نے قلم کاروں کو تعطل، جمود، نظریاتی حصار بندی، فارمولا بازی، مینوفیسٹو کی کال کوٹھری سے نکال کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے مواقع فراہم کیے۔''۱

بہر کیف شب خون اپنے معیار و مزاج کے لحاظ سے ایک منفرد رسالہ ثابت ہوا۔

فاروقی صاحب کا تخلیقی دائرہ بہت ہی وسیع ہے، ان کے تنقیدی اور تحقیقی کارنامے بہت ہی اہم ہیں۔انہوں نے بڑی عرق ریزی سے میر تقی میرؔ سے متعلق ''شعر شور انگیز کی تخلیق کی جو چار جلدوں پر مُشتمل ہے۔اس کے علاوہ تفہیم غالب، تنقیدی افکار، شعر، غیر شعر اور نثر، لفظی و معنی، عروج آہنگ اور بیان، اردو غزل کے اہم موڑ، معرفت شعر نو، خورشید کا سامان پیدا کر، درس بلاغت، افسانے کی حمایت میں، اکبر الہ آبادی پر ایک نظر، لغات روزمرہ، تعبیر کی شرح، گنج سوختہ (شعری مجموعہ)، آسماں محراب (مجموعہ کلام) سوار اور دوسرے افسانے (افسانوی مجموعہ)، کئی چاند تھے سر آسماں (ناول) اُن کے اہم تخلیقات ہیں۔کئی چاند تھے سر آسماں ہندی اور انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔انگریزی میں اس ناول کو The mirror of

"beauty" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بے شمار مضامین میں مختلف رسالوں اور جریدوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

ابتدائی دور میں اُن کی تنقید نگاری مغربی ادب سے متاثر ضرور ہی لیکن بعد میں وہ مشرقی شعر یات اور زبان و ادب کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ ہوئے۔میر و غالب سے متعلق اُن کی تحقیقی اور تنقیدی نمونے ''شعر شور انگیز'' اور ''تفہیم غالب'' شاہکار مانے جاتے ہیں۔دراصل یہ میر غالب کی بازیافت ہے اور عملی تنقید کا نمونہ بھی ہے۔انہوں نے تنقید کے قدیم رویوں سے انحراف کیا اور اپنے نظریات وخیالات کو مضبوط دلائل کے ساتھ ادبی دُنیا کے سامنے رکھا۔قدیم تنقید نگاری میں سادگی، روانی، برجستگی اور عام فہمی شعر کے محاسن میں شمار کیے جاتے ہیں۔فاروقی صاحب نے اس کی تردید کی انہوں نے اپنی تصنیف ''شعر، غیر شعر اور نثر'' میں اِن کے واضح فرق کو دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کیا۔ وہ اشعار کی تعبیر وی تشریح اس طرح پیش کرتے ہین کہ اکثر مضامین معدوم و گمشدہ گوشے ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اُن کے تنقیدی رویے میں ہر جگہ انفرادیت موجود ہے۔ن۔م۔راشد کی نظم ''اے غزال شب'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''بات یہ ہے کہ جدید شاعری اور خاص کر جدید نظم کی حد تک یہ ممکن ہی نہیں کہ شاعر کے اپنے محسوسات اور تجربات وکوائف کو نظم میں کہیں نہ کہیں مافیہہ نہ بنیں اور اگر سراسر مافیہہ نہ بنیں تو بھی کم سے کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ نظم کے مافیہہ میں شاعر کی شخصیت اور اس کے محسوسات جھلک اُٹھتے ہیں.....زبان کی مثال خوبصورتی، پیکروں کی تجریدی، پیچیدگی اور کلام کی روانی اپنا جواب آپ ہیں۔لیکن یہ تو راشد صاحب کی عام خصوصیات ہیں۔اُن کی شاید ہی کوئی نظم زبان کی غیر معمولی چمک دمک اور لفظوں کے جرأت مندانہ استعمال کی صفت سے خالی ہو۔''

سلطان اختر کے شعری اُسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اُسلوب کی سطح پر دیکھئے تو سلطان اختر نے کھردرے فارسی آمیز نفاست اور روزمرّہ کی گفتگو کے آہنگ کا ایسا امتزاج ایجاد کیا ہے جس میں کوئی اُن کا شریک نہیں۔ یہ ایسا اُسلوب ہے جس میں ظفر اقبال جیسی طباعی اور منہ زوری نہیں اور نہ شہریار جیسی لطافت ہے۔نئی غزل کے نئی غزل کے مختلف اسالیب کی ایک حد پر ظفر اقبال ہیں اور ایک حد پر شہریار لیکن سلطان اختر دونوں حدود اور اُن کے درمیان واقع خطّے سے دامن کشار ہنا چاہتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زبان سے زیادہ پیکر کی سطح پر دریافت اور ایجاد کا عمل

کرتے ہیں اور اپنی آواز کو بے تکلف مگر محتاط بنائے رکھتے ہیں۔''۳

فاروقی صاحب کا مطالعہ وسیع ہے۔اُن کا ایک خاص وصف اُن کی تنقیدی زبان ہے۔جو تنقید کے لیے نہایت موزوں ہے۔اُن کی رائے میں سائنس جیسی قطعیت ہوتی ہے۔بغیر لاگ لپیٹ اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔اُن کے یہاں اختصار کا وہی وصف دیکھنے کو ملتا ہے جو کلیم الدین احمد کی تحریروں میں موجود ہے۔تنقید کی زبان کے لیے ایجاز و اختصار اور صفائی، شستگی لازمی عنصر ہے۔دراصل فاروقی صاحب کی نگاہ مغربی ادب پر گہری رہی ہے اور اُن کی تنقید نگاری پر اس کا اثر بھی رہا ہے۔وہ شکاگو اسکول کی ''نئی تنقید'' سے بھی متاثر ہیں۔اردو ادب میں جدیدیت شکاگو اسکول سے ہی آئی۔اور صرف شمس الرحمٰن فاروقی ہی نہیں بلکہ گوپی چند نارنگ۔محمد حسن عسکری، شمیم حنفی، وہاب اشرفی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، سلیم احمد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ اسی نئی تنقید کو بُنیاد بنا کر فن پاروں کی جانچ پرکھ شروع کی۔

فاروقی صاحب نے فن پارے کی متن (Text) کو ہی اپنی تنقید کی بنیاد میں رکھا۔اُن کی نظر میں تنقید ایک ادبی ذوق ہے۔تنقید کا دائرہ صرف تخلیق کار کے حالاتِ زندگی، اس کے نفسیات یا اُس کے عصری سماجی و سیاسی اور معاشرتی مسائل تک ہی محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فن پارہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا نقاد کا اصل فریضہ ہے۔اُن کا خیال ہے کہ نئی شاعری دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتی ہے۔آج معاشرے میں جو بے چینی اور اضطرابی کیفیت ہے وہ فن کار کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے فن پارے مین اُس کی عکاسی کرے۔یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری فصاحت اور بلاغت سے زیادہ زندگی کے مسائل پر زور دیتی ہے۔فاروقی صاحب کی تنقید پر جدّت کا احساس ہوتا ہے۔اُس میں ایک نیا پن ہے۔انہوں نے فن پارے کو اسلوبیات اور لسانیات کے نظریے سے بھی پرکھا۔ان کی تنقید میں اسلوب کا رچاؤ کے ساتھ ساتھ ایک منظّم فکر بھی ہے۔تنقید میں انہوں نے پرانے رائج تصورات سے انحراف کرتے ہوئے ایک الگ زاویہ نگاہ سے فن پارے کا تجزیہ کرنا شروع کیا جو جدید تھا۔فضیل جعفری لکھتے ہیں:

> ''تنقید میں شمس الرحمٰن فاروقی کی کاوشیں اور اُن کے نتائج نہ صرف قابل صد تحسین بلکہ قابل صد رشک ہیں۔یہی سبب ہے کہ محمد عسکری نے انہیں لکھا تھا کہ لوگ اب آپ کا نام حالی کے ساتھ لینے لگے ہیں۔یعنی یہ کہ جس طرح حالی نے اپنے زمانے میں تنقید کو چند رسوم و قیود سے نکال کر نئی آگہی بخشی۔اسی طرح شمس الرحمٰن میں ایک ایسا نقاد نظر آتا ہے جس نے تنقید کی ایک نئی بوطیقا ترتیب دینے کی کوشش کی۔''(۴)

شمس الرحمٰن فاروقی مضمون کے صحت الفاظ کا بھی خوب خیال رکھتے ہیں۔الفاظ کے معنی اور اس کے استعمال پر اُن کو عبور حاصل ہے۔عروض و بلاغت اور صرف و نحو سے اُن کی واقفیت اور علمیت لاجواب ہے۔محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال پر اُن کی گرفت لائق تحسین ہے۔نومبر 2006ء سے ''اردو دنیا'' نے ایک کالم جاری کیا تھا جس کا عنوان ''اچھی اردو، روزمرّہ، محاورہ صرف'' تھا۔اس کالم میں قاری الفاظ کے تعلق سے اس کے استعمال اور روزمرّہ کی زندگی میں اُن کے صرف اور معنی کے بارے میں سوال پوچھتے تھے جس کا جواب فاروقی صاحب دیتے تھے۔ایک مثال دیکھئے۔

''قاری کا سوال:۔حضور و حضرت میں کیا فرق ہے؟ حضرت مولانا اور حضور تاجدار ملت جیسے فقروں کا استعمال کس حد تک صحیح ہے؟

جواب:۔اردو میں معنی کے لحاظ سے حضور اور حضرت میں کوئی فرق نہیں ہے۔روزمرہ اور محاورے میں استعمال کی بنا پر اُن میں کہیں کہیں فرق آ گیا ہے۔حسب ذیل جملوں پر غور کیجئے:۔

(1) آج حضرت نے توحید پر تقریر کی۔

(2) آج حضور نے.....

(3) حضرت غالب کا قصیدہ بہتر ہے۔

(4) حضور غالب کا قصیدہ بہتر ہے۔

یہاں ایک اور تین بالکل ٹھیک ہیں۔لیکن نمبر چار درست مگر خلاف محاورہ ہے۔اکثر فقروں کے الفاظ متعین ہو گئے ہیں کہ حضور کہاں بولیں گے اور حضرت کہاں بولیں گے۔لیکن تاجدار ملت غلط نہ ہوگا۔اسی طرح حضرت مولانا اور حضور مولانا دونوں صحیح ہیں لیکن یہ صرف استعمال عام پر ہے، جہاں جس طرح چل جائے، وہی ٹھیک ہے، صرف ایک بات ہے کہ اردو میں حضرت کا لفظ بعض بزرگ شخصیات کے نام کے پہلے لگاتے ہیں۔حالانکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔اسی طرح مذہبی رہنماؤں کو ہم حضور کہہ دیتے ہیں۔چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔مثلاً حضور خواجہ معین الدین صاحب، بی بی حضور صاحب، حضور رادھا سوامی وغیرہ لیکن غیر ہندوستانی پیغمبروں کے لیے حضور نہیں کہتے۔مثلاً حضور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کہنے میں کوئی غلطی نہیں، لیکن یہ خلاف محاورہ ہے۔''

دیکھا انہوں نے کس تفصیل اور صراحت سے حضرت اور حضور کے فرق کو واضح کیا ہے۔اس جگہ فاروقی صاحب کے لیے عرفان صدیقی کا یہ شعر لکھنا نامناسب نہ ہوگا۔

حرف کو حُسن نظر سے معتبر کیا
کوے معنی میں عجب کار ہُنر اُس نے کیا

فاروقی صاحب کا شعری سرمایہ گو کہ زیادہ نہیں ہے مگر اُن میں اتنی زیادہ گہرائی و گیرائی اور تہداری ہے کہ اُس کی تہہ تک پہنچنا عام قاری کے بس کا نہیں ہے۔ اُن کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ علمی لیاقت، ذہانت اور عمیق شعرفہمی درکار ہے۔ سطحی علمی لیاقت والوں کے سر سے گزر جاتی ہے۔ سرسری مطالعہ سے بات نہیں بن سکتی ۔اُن کی شاعری نئے نئے خیالات، نئے اسالیب، نئے علامت، نئے استعارے نئی نئی تشبیہوں سے معمور ہے۔ دلکشی و دلبری اُن کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ اکثر غیر مانوس الفاظ اور الفاظ کے نئے نئے معنوں میں میں استعمال کر کے قاری کی شعرفہمی کو چیلنج کرتے ہیں۔ ان شعری اثاثہ کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

غزل کے چند اشعار:۔

لب دریا کو ملانے کا طریقہ کیا ہوگا — دونوں جھکتے ہیں مگر بیچ میں دریا حائل ہے
جھجھکاتی ہے افق پر کوئی نیلی روشنی — یا ہوا پر اڑ رہا ہے تیرے جادو کا دیا
اُس کلی نے خون سارا میرے دل کا لے لیا — کچھ نشاں پھر بھی نہ اپنے رنگ و خوشبو کا دیا

ایک رباعی دیکھئے:۔

جو عقل جھانسے میں نہ آئے وہ ہے دل — جو من مانی کرتے جائے وہ ہے دل
ایک بوند گنہ پر سو قلزم روئے — پھر نا کردہ پر پچھتائے وہ ہے دل

فاروقی صاحب کی ایک نظم ''کالے پھولوں کا رنگ'' کافی مقبول ہوئی۔ ان کی غزل کے اشعار ،رباعیات اور نظموں کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا جس میں اس نظم کو بعنوان The colour of black flower شائع کیا گیا۔ نظم ملاحظہ کیجئے۔

کون تھا
سرد بستر پر پڑا المبا
کسی سائے سے ہرگز کم نہ تھا
کس قدر بھاری وزن کتنا بدن
گول کالا مُنھ چمکتی آنکھیں پھر بھی زرد رو
گھر کے اس دروازے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا
دونوں دیواروں سے ٹکراتے ہوئے ہاتھوں میں
ٹیڑھے کالے پھول
دیو قامت دیوتا

دیو قامت مگر بے وزن دیو
کون سے رُستم کا وہ سُہراب تھا
سنگ بستر پر پڑا
پھولوں کا رنگ
ساری دیواروں کا رنگ کالا کر گیا
میرا سارا جسم نیلا کر گیا۔

کالے پھولوں کے مختلف کیفیات اور رنگوں کے مختلف معنوں کی تہہ میں پہنچنا آسان نہیں ہے۔ اُن کی مشکل پسندی غالب کی یاد دلاتی ہے۔ سادگی اُن کا شیوہ نہیں۔ اس نظم کو جدیدیت کا نغمہ کہا جا سکتا ہے۔ میرے خیال سے ان کی شاعری کو ن۔م۔راشد اور میراجی کی شاعری کے زمرّے میں رکھنا چاہئے۔ اُن کی شاعری کو بڑے بڑے ناقدوں نے سراہا ہے۔ ترقی پسند سردار جعفری ''آسماں محراب'' کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ''آپ اس بات کو ذرا تکلف سے تسلیم کریں گے کہ آپ کی شاعری میں خوشگوار تبدیلی آئی ہے اور شاید وہ میرؔ کے مطالعے کا فیض ہے۔ لیکن تبدیلیکا اظہار اپنی تخلیق کی شکل میں کیا ہے۔ اس کتاب میں شاعری کے کئی رنگ ہیں، اُن کے کئی مزے ہیں۔''٦

گوپی چند نارنگ نے جب جدید شاعری کو Indian Council For Cultural Relations کے زیر عنوان ترتیب دیا تو فاروقی صاحب کی شاعری کو بھی شامل کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کم ہی لکھے مگر وہ عام ڈگر سے ہٹ کر ہی ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' سے زیادہ اُن کی کتاب ''افسانے کی حمایت میں'' مقبول ہوئی۔ یہ کتاب اپنی اشاعت سے زیر بحث رہی ہے۔ انہوں نے افسانے کی ہیئت، تکنیک اور اس سے متعلق مسائل کا بھر پور جائزہ لیا ہے۔ آج افسانے Plotless بھی لکھے جا رہے ہیں اور Anti.Story بھی۔ افسانے غیر مربوط طریقے سے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ واقعات کا ہونا بھی کوئی ضروری نہیں ہے۔ بعض دفعہ افسانہ نگار کسی احساس یا کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنا کر افسانہ بنا رہے۔ علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں گویا شتر بے مہار کی طرح افسانہ نگار صفحہ قرطاس پر اشہب قلم دوڑا رہے ہیں۔ اولاً اولاً ممتاز شیریں نے اپنے مضمون ''تکنیک کا تنوع'' میں افسانے کی اجزائے ترکیبی سے متعلق سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اُن کے

بعد فاروقی صاحب نے افسانے کے تشکیلی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ موضوع، پلاٹ، کردار نگاری، فضا بندی اور راوی اور راوی وغیرہ سے متعلق گفتگو کی ہے۔ انہوں نے افسانے میں کہانی پن کے مسئلے پر پُر مغز اور فکر انگیز بحث کی ہے۔ جب وہ افسانے سے زیادہ اہم ناول کو ٹھہراتے ہیں اور شاعری اور افسانے کا موازنہ کرتے ہوئے شاعرے کو افسانے پر مقدم قرار دیتے ہیں اُن کے خیالات پر اعتراضات بھی کئے گئے اور مخالفت بھی ہوئی۔ ان اعتراضات کے باوجود یہ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے فن افسانہ نگاری کے اسرار و رموز کو جس گہرائی سے سمجھا ہے وہ دوسروں کے لیے ممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی باتوں کے پیچھے مضبوط دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

فاروقی صاحب نہ صرف تحقیق و تنقید میں ہی نہیں بلکہ فکشن کے میدان میں اپنی علمی لیاقت کا علم بلند کیا ہے۔ ''کئی چاند تھے سر آسماں'' ان کا مشہور ناول ہے، جو ادبی دنیا میں شاہکار ثابت ہوا۔ اس کا موضوع ہندوستان کی اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے مُغلیہ سلطنت کے زوال کی تاریخ ہے۔ انہوں نے اس دور کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی اور اقتصادی حالات کو افسانوی زبان میں پیش کیا ہے شعر و شاعری کی محفل بھی سجائی ہے۔ محرم کے نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ رقص و سُرود کی مجلس بھی قائم کی ہے۔ جیوتش، مولوی، پنڈت، ملازم، دربان، سپاہی سب وہاں موجود ہیں۔ اُس دور کے لوگوں کے قیام و طعام، ملبوسات، عقائد، رسم و رواج کو حُسن خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انگریزوں اور درباریوں کی سازشوں، ٹھگوں کی ٹھگی، پیر و مرشد اور اُن کے مُریدوں کے حالات، بادشاہوں اور امراء کی سخاوت، روہیلے اور جاٹوں کی بغاوت، قتل و غارت گری گویا ناول نگار نے جزئیات کے ساتھ مغل سلطنت کو ایک بڑے کینوس پر ابھارا ہے۔ ناول کے بیشتر کردار حقیقی ہیں اور اُن کی اپنی تاریخی حیثیت بھی ہے۔ تارسٹن بلیک، نواب شمس الدین احمد خان، ولیم فریزر، فتح اللہ بیگ، مرزا آغا تراب، مرزا فخرو، بہادر شاہ ظفر، نواب ضیاء الدین حقیقی کردار ہیں۔ اُن کی اپنی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ مرزا غالب، ذوق، داغ دہلوی، امام بخش صہبائی، حکیم احسن اللہ خاں کا بڑا ہی جاندار خاکہ کھینچا ہے۔ سارے کرداروں کے مرکز میں وزیر خانم ہے جو نہایت خوبصورت ہے۔ وہ کسی سے مرعوب ہونے والی عورت نہیں ہے۔ فطرت نسوانی کی مکمل تصویر ہے۔ ناول نگار نے اُس کی فوٹو گرافی نہیں کی ہے کہ صرف عکس نظر آئے بلکہ ریشم جیسے الفاظ کو برش بنا کر مصوری کی ہے۔ وزیر خانم کو اپنے حُسن کا احساس ہے۔ وہ خواہش کے مطابق زندگی جینا چاہتی ہے۔ وہ نڈر و بے باک ہے۔ وہ جس کو چاہتی ہے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور جس کو نہیں پسند کرتی ہے اُس کو کبھی جگہ نہیں دیتی۔ یہ اور بات ہے مغلیہ حکومت کی طرح اس کی انفرادی زندگی میں بھی زوال پذیر ہے۔ امراؤ جان ادا کی زندگی میں کئی مرد آئے۔ کوئی نہ رہا، وزیر خانم کی زندگی میں

بھی مارسٹن بلیک، نواب شمس الدین احمد خاں، مرزا آغا تراب اور مرزا فخرو آئے لیکن اس کی بدنصیبی کے سب سب ایک کے بعد ایک ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔

''کئی چاند سر آسماں'' کے سارے کردار فعال ہیں اور اپنی فطری ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں۔ ای۔ ایم۔ فورسٹر کی زبان میں سارے کردار Round ہیں یہ سارے کردار ناول کو مکمل کرنے میں معاون ہیں۔ فاروقی صاحب کی زبان عمدہ ہے۔ اُن کے پاس الفاظ کے کئی سمندر ہیں۔ محاورے، تشبیہات اور استعارات دست بستہ ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ جب جو دل کو پسند آیا اور چُن لیا اور جملوں میں نگینے کی طرح جڑ دیا۔ دراصل اس ناول کی کامیابی کا راز اس کے انداز بیاں میں مضمر ہے۔ ناول کا کینوس بہت ہی وسیع ہے مگر فاروقی صاحب کا کمال ہے کہ ناول کے ہر گوشے کو سنبھال کر رکھا ہے۔

بہر کیف فاروقی صاحب نے تنقید نگاری میں Legend کی حیثیت اپنی حیات ہی میں حاصل کر لی تھی، ناول نگاری میں بھی صف اول میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ ناول اردو زبان و ادب کی گنگا جمنی تہذیب کی بازیافت ہے۔ وزیر خانم کو امراؤ جان ادا، گوتم نیلمبر، آنگن کے صفدر اور ٹیڑھی لکیر کے شمن کے زمرے میں شامل کر لینا نامناسب نہ ہوگا۔

فاروقی صاحب نے اردو ادب کے دامن کو ادبی موتیوں سے بھر دیا۔ افسوس کہ آسمان اردو ادب کی کہکشاں کا یہ تابناک ستارہ 25 دسمبر 2020ء کو ٹوٹ کر فضا میں بکھر گیا۔

حواشی:۔

1۔ شب خون کا توضیحی اشاریہ۔ جلد اوّل ص 22
2۔ ن۔ م۔ راشد اور اے غزال شب۔ اثبات شمارہ نمبر 7 ص 23
3۔ جدید اردو آشنا۔ روح ادب ص 43
4۔ فن تنقید اور تنقید نگاری۔ پروفیسر نور الحسن نقوی ص 176
5۔ اچھی اردو: روز مرّہ، محاورہ، صرف۔ اردو دنیا، ماہ جنوری 2008ء
6۔ شب خون شمارہ نمبر 203۔ 1997ء

◂◂ ● ▸▸

White House‹Shah Colony
Munger 7484054886

● ڈاکٹر عرشیہ اقبال

آہ! شمس الرحمٰن فاروقی

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

''آہ! شمس الرحمٰن فاروقی نہ رہے'' ۲۵؍دسمبر ۲۰۲۰ء سہ پہر الٰہ آباد سے یہ شور برپا ہوا جس کی گونج پوری دنیا میں پھیل گئی۔ ادب کا اتنا بڑا خسارہ جس کی بھرپائی شاید ممکن ہی نہیں۔ فاروقی صاحب کے داغ مفارقت دے جانے سے ایک پورے عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ سال ۲۰۲۰ء نے اردو ادب سے بہت کچھ چھین لیا۔ اسی سال مجتبیٰ حسین، عرش صہبائی، فراغ روہوی، مظفر حنفی، اشوک ساحل اور ہر دل عزیز شاعر راحت اندوری کو ہم سے جدا ہو گئے۔ اور جاتے جاتے آخری ماہ میں فاروقی صاحب نے بھی ہم سب کو الوداع کہہ دیا۔ فاروقی صاحب کے چلے جانے سے اردو ادب کی کمر خمیدہ ہوگئی ہے۔ اتنا بڑا ناقد، عالم، دانشور، محقق، مترجم، صحافی، مؤرخ اور معلّم صدیوں میں پیدا ہوا کرتا ہے۔

فاروقی صاحب کی زندگی کا سفر ۳۰؍ستمبر ۱۹۳۵ء اعظم گڑھ کے کوڑیا پار نامی گاؤں جس کا موجودہ نام ضلع مؤ ہے، سے شروع ہوا۔ فاروقی صاحب نے بچپن سے ہی اپنے غیر معمولی ہونے کا ثبوت دینا شروع کر دیا تھا۔ جب غالباً ۷ یا ۸؍برس کے تھے تو اپنے گھر کے قریب ایک جلد ساز کی دکان پر بیٹھ کر اردو کی ان تمام کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے جو جلد سازی کی غرض سے اس دکان پر آیا کرتی تھیں اور دکان کے کھلنے سے اس وقت تک مطالعہ میں غرق رہتے، جب تک سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ ان کے اندر خداداد صلاحیتیں موجود تھیں، جن کا انہوں نے اپنی پوری زندگی میں ثبوت پیش کر دکھایا ہے۔

ان کے والد کا نام مولوی خلیل الرحمٰن فاروقی تھا، جو عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ علم عروض و بلاغت کے بڑے عالم تھے۔ ان کا عظیم کارنامہ 'دارالسلام' کی تعمیر ہے جو انہوں نے محلّہ راجا پور میں ایک عمارت کی صورت میں قائم کی، جہاں عبادت و ریاضت اور تبلیغ دین کے فرائض تا عمر انجام دیتے رہے اس کے علاوہ انہوں نے خود نوشت اپنی سوانح حیات جس کا نام 'قصص الجمیل فی سوانح الخلیل' رکھا، جسے ان کے فرزند شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ۱۹۷۳ء میں شائع کروایا بڑا کارنامہ ہے۔ فاروقی صاحب

کے آباواجداد ہندوستان میں فاروقی شیوخ عبداللہ ابن حضرت عمر فاروق ابن خطاب کی نسل سے تھے۔ ان کا ننہال بھی اعلیٰ تھا جو حضرت چراغ دہلوی سے ملتا ہے۔ علم کے ساتھ مذہب کا چرچا ان کے گھرانے کی شان تھی۔ دادا حکیم مولوی محمد اصغر فاروقی بھی معلّم تھے جو علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور فراق جیسے بڑے اعلیٰ پایہ شاعر کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نانا محمد نظیر بھی علم کی روشنی بکھیرنے میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے اپنی حیات میں ایک چھوٹا سا اسکول قائم کیا تھا جو اب ایک بڑے کالج میں تبدیل ہو چکا ہے۔

موصوف کی تعلیمی زندگی کا آغاز ان کے گھر سے شروع ہوا۔ محمد اشرف صاحب ان کے پہلے معلّم تھے، جنھوں نے انہیں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم دی۔ اس کے بعد ان کا داخلہ ویسلی ہائی اسکول میں درجہ پنجم میں کروایا گیا، جہاں سے انہوں نے نویں جماعت تک کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں ان کا داخلہ گورنمنٹ جبلی ہائی اسکول گورکھپور میں ہوا اور انہوں نے ۱۹۴۹ء میں میٹرک کا امتحان بڑے شاندار نمبروں سے پاس کیا۔ بی-اے کی سند گورکھپور کے بیاں صاحب جارج اسلامیہ کالج سے ۱۹۵۳ء میں حاصل کی۔ یہاں انہوں نے جغرافیہ، اقتصادیات اور مغربی فلسفے کی تاریخ پڑھی۔ کانٹ، ہیگل اور افلاطون نیز فرائڈ کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں ایم-اے (انگریزی) میں اول درجہ سے پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر پانے والے طالب علم بنے جس کا چرچا خوب ہوا۔ روزنامہ 'امرت بازار پتریکا' میں ان کی اس عظیم کامیابی کی خبر بھی چھپی جس سے پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ ان کے شفیق اساتذہ میں غلام مصطفیٰ خاں صاحب رشیدی، مسٹر پی-آئی-کورئین، حامد علی خاں اور منظور علی صاحب کے نام خاص قابل ذکر ہیں۔

تعلیم سے سرفراز ہو کر فاروقی صاحب نے تدریسی شعبے سے خود کو منسلک کر لیا مگر ساتھ ہی مقابلے کے امتحان کی تیاری میں بھی منہمک ہو گئے۔ انہوں نے مرکزی سول سروس کا امتحان پہلی مرتبہ میں ۱۹۵۷ء میں پاس کر لیا اور ان کی پوسٹنگ پوسٹل سروس میں ہوگئی۔ ان کا تبادلہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوتا رہا اور بیرونی ممالک کے سفر کا بھی ان کو موقع کئی بار ملا۔

فاروقی صاحب کی ازدواجی زندگی کا آغاز ۱۹۵۵ء سے ہوا۔ ۲۶؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو ان کی شادی ضلع الٰہ آباد کے قصبہ پھول پور کے ایک معزز زمیندار گھرانے کی دختر جمیلہ خاتون سے ہوئی۔ جمیلہ خاتون الٰہ آباد یونیورسٹی کی ایک اچھی طالبہ رہ چکی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ وہ ایک ذمہ دار اور خوش اخلاق، باحوصلہ خاتون بھی تھیں، جنھوں نے اپنے شوہر کا ہر موڑ پر ساتھ نبھایا۔ ان سے دو بیٹیاں تولد ہوئیں۔ مہر افشاں اور باراں رحمٰن، جنھوں نے تعلیم کے بڑے زینے طے کئے ہیں اور اعلیٰ مقام پا چکی ہیں۔

فاروقی صاحب ایک پیدائشی فنکار ہیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں۔ ان کے اندر خداداد صلاحیتیں موجود تھیں اور بیک وقت کئی فن کے ماہر اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ ادب کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں، جہاں انہوں نے اپنی چھاپ نہیں چھوڑی۔ فاروقی صاحب نے اپنی زندگی میں تحریر کا آغاز اس زمانے میں کیا، جب وہ بہت کمسن تھے۔ انہوں نے ایک قلمی رسالہ 'گلستان' کے نام سے ترتیب و اشاعت کی۔ یہ رسالہ چند صفحات پر مشتمل غالباً بیس یا چوبیس اوراق پر محیط، ان کی زندگی کا پہلا تخلیقی کارنامہ تھا۔ میٹرک کے زمانے میں افسانے لکھے مگر کون سا پہلا افسانہ ہے، اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۹ء یا غالباً ۱۹۵۰ء میں ایک ناولٹ 'دلدل سے باہر' لکھا جو 'معیار' میرٹھ میں چار قسطوں میں شائع ہوا اور اس طرح انہوں نے نثر نگاری کو اپنا خاص میدان بنالیا۔

فاروقی صاحب کا ایک عظیم کارنامہ 'شب خون' رسالے کا آغاز ہے جو ۱۹۶۶ء سے جاری ہوا اور ۲۰۰۵ء تک مسلسل پابندی کے ساتھ ۳۹/ برسوں تک ہر ماہ شائع ہوتا رہا۔ ایک رسالے کو اتنے برسوں تک قائم رکھنا بڑی بات ہے۔ 'شب خون' کے پہلے شمارے میں مدیر کی حیثیت سے جو نام آیا، وہ فاروقی صاحب کا نہیں بلکہ ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین کا تھا، نائب مدیر جعفر رضا اور مرتب و منتظم کی حیثیت سے جمیلہ فاروقی کا نام نظر آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زمانے سے ہی فاروقی صاحب کے تنقیدی مضامین اور تراجم شائع ہونا شروع ہوئے۔ ان کی تحریر و تقریر نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ یہی وہ وقت تھا، جب ترقی پسند ادبی تحریک اپنے آخری مرحلے میں دم توڑنے کی چوکھٹ پر تھی۔ ترقی پسندوں نے فاروقی صاحب کو جدیدیت اور ادب برائے ادب کا علم بردار سمجھ کر انہیں اپنا حریف بھی سمجھ لیا تھا مگر فاروقی صاحب نے ان کی اس غلط فہمی کو جلد ہی دور کر دیا۔ جب ترقی پسند ادیبوں نے ان کو پڑھا تو ان کی علمیت اور وسعت مطالعہ جو حیران کن تھا، واقفیت حاصل کی اور ان کے گرویدہ ہو گئے۔ ایسے شیدائی ہوئے کہ آخری عمر تک ان کے پیروکار بنے رہے۔ فاروقی صاحب کی غیر معمولی علمیت، تجربہ اور ان کا اندازِ گفتار ایک منفرد اور متوجہ کن تھا، جو ہر خاص و عام کو اپنی طرف راغب کرتا۔ ان کا اخلاق بھی ان کی شخصیت کی ایک خاص خوبی تھی۔ جب کبھی کسی محفل یا مجلس میں شرکت کرتے یا کسی ملاقات کی گھڑی ہوئی تو سلام کرنے میں پہل کرتے اور بڑے خلوص سے لوگوں سے ملتے اور گفتگو کیا کرتے تھے۔ فاروقی صاحب جس محفل میں موجود ہوتے، گویا شمس کی طرح مرکز بن جایا کرتے اور تمام لوگ ان کے اردگرد گشت کرتے نظر آتے۔ لوگ ان کی گفتگو کے شیدائی تھے۔ ان کو سننے کے لیے شہر در شہر مسافت طے کر کے چلے آتے۔ ان کی ایک جھلک کے لیے اسکا لر حسرت کیا کرتے۔ گویا میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کی شخصیت ایک مقناطیسی کشش رکھتی تھی جس کی قوت نے لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

فاروقی صاحب کی تنقیدی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے۔ جدید اردو ادب میں ان کی تصانیف نے ایک نئی روشنی پیدا کی ہے اور ایک نیا انداز فکر پیش کیا ہے۔ انہوں نے 'لفظ و معنی' ۱۹۶۸ء میں تحریر کیا۔ اسی برس 'فاروقی کے تبصرے' کے عنوان سے ان کی ایک غیر معمولی تصنیف منظر عام پر آئی۔ اس سے قبل ۱۹۶۷ء میں ایک مرتبہ 'نئے نام' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ اس مرتبہ میں حامد حسن حامد صاحب نے ان کا ساتھ دیا ہے اور اس کتاب کا انتساب اپنی زوجہ جمیلہ فاروقی کے نام لکھا۔ ۱۹۶۸ء میں 'اثبات و نفی' بھی شائع ہوئی۔ اس کے بعد 'شعر غیر شعر اور نثر' ۱۹۷۵ء میں، 'گنج سوختہ' ۱۹۶۹ء میں، 'سبز اندر سبز' ۱۹۷۴ء میں، 'چار سمت دریا کا' اور 'عروض، آہنگ اور بیان' ۱۹۷۷ء میں، 'شعریات' (ارسطو کی Poetics)، بوطیقا کا اردو ترجمہ ۱۹۷۸ء میں 'تعبیر کی شرح' اور 'درس بلاغت' ۱۹۸۱ء میں 'افسانے کی حمایت میں' ۱۹۸۲ء میں، 'تنقیدی افکار' ۱۹۸۴ء میں، 'اثبات و نفی' ۱۹۸۶ء، 'تحفۃ السرور' ۱۹۸۵ء (مرتبہ)، 'جدیدیت اور ہم'، 'اردو کی نئی کتاب' ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے علاوہ 'تفہیم غالب' ۱۹۸۹ء میں، 'انداز گفتگو کیا ہے' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئیں۔ ان کا سب سے بڑا شاہکار 'شعر شور انگیز' جو خدائے سخن میر تقی میر کے کلام کی شرح ہے، چار جلدوں پر مشتمل ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا اور اس پر فاروقی صاحب کو سرسوتی سمان سے نوازا گیا جو برِصغیر کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے۔ اس کے بعد ۱۹۹۷ء میں 'اردو غزل کے اہم موڑ' کے عنوان سے ان کی تصنیف شائع ہوئی۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'سوار اور دوسرے افسانے' کے عنوان سے ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں وہ تمام افسانے شامل ہیں جو کبھی 'شب خون' میں نامعلوم یا کسی دوسرے کے نام سے چھپے تھے۔ جب وہ تمام افسانے پہلی مرتبہ فاروقی صاحب کے افسانوی مجموعہ میں شامل ہو کر شائع ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان تمام افسانوں کے خالق فاروقی صاحب تھے۔ فاروقی صاحب کا ایک لازوال ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کافی مقبولیت کا حامل ہے۔ محض ایک ناول نے فاروقی صاحب کا نام ناول نگاروں کی فہرست میں صفِ اوّل میں لکھوا دیا ہے۔ یہ ناول پہلے ۲۰۰۶ء میں پاکستان اور پھر ہندوستان سے شائع ہوا۔ یہ ناول کافی ضخیم ہے۔ تقریباً ۸۵۱/ صفحات پر مشتمل یہ ناول کلاسک کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ ہر بڑے نقاد اور فکشن نگار نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی اس کا خوب چرچا ہوا اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس ناول کو مشہور اداکار مرحوم عرفان خان نے بھی مکمل پڑھا اور اس کی خوب پذیرائی کی۔ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ناول پر وہ ایک فلم بنائیں اور اس سلسلے میں فاروقی صاحب سے انہوں نے اجازت بھی لے لی تھی مگر موت نے ان کی اس خواہش کو حسرت میں بدل دیا۔

فاروقی صاحب کو دنیائے ادب نے ان کی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کئی اعزازات سے سرفراز کیا، جن میں حکومت ہند کی جانب سے پدم شری سے ۲۰۰۹ء میں نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ برائے تنقیدی افکار ۱۹۸۶ء میں نوازا گیا۔ ۲۰۱۰ء میں حکومت پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز عطا کیا۔ علاوہ ازیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی-لٹ کی اعزازی سند سے بھی نوازا ہے۔

فاروقی صاحب ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ حکومت ہند کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ ہندوستان کے محکمۂ ڈاک میں مختلف ریاستوں میں یونیورسٹی آف پنسلوانیا کے جنوبی ایشیا علوم کے شعبے میں جز وقتی پروفیسر کی حیثیت سے بھی کار انجام دیتے رہے۔

فاروقی صاحب پر ادبی کام اب بھی جاری ہے۔ ان پر کئی لوگوں نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر صفدر رشید کا نام قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں چند کا ذکر پیش ہے۔ 'جدید اردو تنقید کا تجزیاتی مطالعہ' (ڈاکٹر نشاط فاطمہ)، 'شمس الرحمٰن فاروقی: حیات نامہ' (نجم فضلی)، 'شمس الرحمٰن فاروقی: شعر غیر شعر اور نثر کی روشنی میں' (محمد سالم)، 'شمس الرحمٰن فاروقی: محو گفتگو' (راحیل صدیقی)، 'کئی چاند تھے سر آسماں: ایک تجزیاتی مطالعہ' (رشید اشرف) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسائل اور جرائد فاروقی صاحب کی شخصیت اور فن کے کارناموں سے اپنے صفحات کی زینت بنا چکے ہیں۔

فاروقی صاحب کا اس طرح چلے جانا ہم سب کے لئے غم کا باعث ہے۔ ایک ماہ قبل ہی وہ کورونا سے صحت یاب ہوئے تھے مگر موت کا دن ہر کسی کے لیے معین ہے اور شاید فاروقی صاحب کی زندگی کا وہ دن آ گیا تھا اور وہ ہم سب کو پوری کائنات کو خیر باد کہہ کر اللہ پاک سے جا ملے۔ اتنا نیک انسان، باوقار، پُرخلوص، نیک نیت اور ادبی خدمت گار جس نے تمام عمر دنیا اور دنیائے ادب کی خدمت انجام دی۔ اللہ بے شک اس کی خاطر جنت میں جگہ عطا فرمائے گا۔

راقم اہل مرشد آباد کی جانب سے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی رحلت پر تعزیت پیش کرتی ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ مرحوم کی مغفرت فرما کر انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔

◂◂ ● ▸▸

Chowk Rajabazar
P.O.Dist: Murshidabad(W.B)-742149
9748169901

● ڈاکٹر تسنیمہ پروین

شمس الرحمٰن فاروقی: ایک نابغۂ روزگار شخصیت

شمس الرحمٰن فاروقی وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہیں جن کی ادبی و علمی صلاحیت کا بڑے بڑے نقادوں سے لوہا مانا ہے۔ ان کی عالمانہ نظر اتنی گہری ہوتی ہے کہ کوئی بھی ادبی موضوع ہو کوئی واقعہ ہو، یعنی تاریخی ادبی اور زبان سے متعلق کوئی بھی لسانی خامیاں یا کوئی پہلو ہو ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس لیے کہ وہ کئی زبانوں پر نہ صرف عبور رکھتے ہیں بلکہ ان کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ باریک سے باریک اور نازک سے نازک معاملات میں بھی وہ اپنے علمی دلائل سے اس طرح بحث کرتے ہیں جیسے موضوع پر انہوں نے کافی تحقیق کیا ہو۔ وہ دلائل و شواہد اس طرح دیتے ہیں کہ ان کی بات مستند تسلیم کی جاتی ہے۔

فاروقی صاحب نہ صرف جدیدیت کے علمبردار تھے بلکہ اردو کی قدیم کلاسیکی روایت سے نئے زمانے کا رشتہ مضبوطی اور استحکام سے قائم کیا۔ انہوں نے ادب میں نیا نظریہ بھی دیا کہ کوئی بھی ادب کلاسیکی روایت سے رشتہ جوڑے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی جذبے نے ''شعر شور انگیز'' لکھ کر میر تقی میر کی شاعری کی نئے سرے سے بازیافت کی۔

میر اور غالب کے ساتھ انھوں نے داستانوں کی طرف بھی قدم بڑھائے۔ داستانوں کی شعریات اور ان کے لسانی اور تہذیبی دائرہ عمل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ لغت نویسی اور تاریخ ادب اردو کے حلقے میں پہنچے۔ ایک انسان اور مختلف اصناف سخن پر مکمل دسترس اگر کسی ذات کی خاصہ تھی وہ شمس الرحمٰن فاروقی تھے۔ ایسی کثیر جہات شخصیت صدیوں میں خال خال نظر آتی ہے۔ 20 دسمبر 2020ء کا دن ایک سیاہ دن تھا جب 11.30 بجے الٰہ آباد کے ایک اسپتال میں فاروقی صاحب نے آخری سانس لی۔ ادبی حلقے میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے ادب کا کوئی ستون نہیں پورا آسمان گر پڑا ہے۔ بقول کیفی اعظمی :

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

یوں تو 2020ء کا سال ہی دنیا کے لیے اور خاص طور سے اردو ادب کے لیے ایک مشکل بھرا سال رہا۔ اردو کی بڑی بڑی ہستیاں ایک ایک کر کے چلے گئے۔ لیکن فاروقی صاحب کی موت ادبی دنیا کی ایک ایسی خلا ہے جن کو پُر کرنا تو دور ان پر ایک اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے جو

دلوں میں ہی نہیں ذہنوں میں بھی زندہ رہتے ہیں جب جب ان کے کارنامے سامنے آتے رہیں گے وہ یاد کیے جائیں گے۔

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

وہ اپنی تصانیف میں زندہ ہیں خصوصاً شب خون ان کا ایسا کرنامہ ہے کہ ادب کی دنیا ان کو بھی فراموش نہیں کرسکتی۔ شب خون میں چند کالم ایسے ہوتے تھے جو ان کی وسیع النظری اور منطقی انداز فکر کو ظاہر کرتی ہے مثلاً سوانحی گوشوں کا انتخاب اور کسی بھی شعری یا ادبی موضوع پر ان کے مدلل جواب جو وہ دیتے ہیں جنہیں پڑھ کر بڑے سے بڑے نقاد، شاعر، ادیب نہ صرف حیران رہ جاتے ہیں بلکہ ان کی قابلیت کے آگے سر تسلیم خم کردیتے ہیں۔ اگر کسی شعر پر کسی کو اعتراض ہوا تو اس کے جواب میں وہ سو دو سو سال پرانے شاعروں کے درجنوں اشعار اردو کے ہی نہیں فارسی کے بھی سند کے طور پر پیش کردیتے تھے۔ اب ایسی جلیل القدر ہستی ہمارے بیچ نہیں ہیں جو اپنی بات مدلل انداز میں کہہ سکیں۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

وہ اردو زبان وادب کے مشہور ومعروف مصنف، شاعر، محقق، نقاد اور دانشور تھے۔ ان کا تعلق ایک علمی وادبی گھرانے سے تھا۔ روایتی انداز میں ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد گورکھپور سے بی۔اے۔ کیا اور پھر انگریزی ادب میں ایم۔اے۔ کرنے کے لیے الٰہ آباد آگئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا اور انڈین پوسٹل سروس میں بہ حیثیت آفیسر کام کرنے لگے۔ اپنی ملازمت کے دوران وہ حکومت ہند کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے لیکن ان کی سب سے بڑی شناخت اردو ادب کے محقق اور نقاد کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی۔ ان کی عظمت کی دلیل وہ کتابیں ہیں جنہیں لکھ کر انھوں نے اردو ادب کے خزانہ کو مالا مال کیا۔ ان کی کتابوں میں شعر وشور انگیز، اثبات ونفی، اردو غزل کے اہم موڑ، اردو کا ابتدائی زمانہ ادبی تہذیب وتاریخ کے پہلو، افسانے کی حمایت میں، انداز گفتگو کیا ہے، تعبیر کی شرح، تفہیم غالب، شعر غیر شعر اور نثر، خورشید کا سامان سفر، صورت ومعنی سخن، غالب پر چار تحریریں، گنج سوختہ، لغات روزمرہ، ہمارے لیے منٹو صاحب، لفظ ومعنی، نئے نام، نغمات حریت، عروض آہنگ اور بیان، سوار اور دوسرے افسانے، ناول کئی چاند تھے سر آسماں، شاعری آسمان محراب اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ مشہور ومعروف ادبی ماہنامہ شب وخون ہے جس کی انہوں نے چالیس برس تک ادارت کی اس کے علاوہ انہیں اردو دنیا کے اہم ترین عروضیوں میں سے ایک گردانا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی ادب کی کئی مشہور کتابوں کی تخلیق کی۔ میر تقی میر پر ان کی کتاب شعر شور انگیز جو چار

جلدوں میں مشتمل ہے پر سنہ ۱۹۹۶ء میں سرسوتی سمّان ملا جو برصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ سمجھا جاتا ہے۔ انہیں متعدد اعزاز واکرام سے نوازا جاتا رہا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا سنہ ۲۰۰۹ء میں انہیں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔

فاروقی صاحب اپنے تنقیدی افکار ونظریات کے ذریعہ کئی دہائیوں کو متاثر کیا۔ انہوں نے الٰہ ا؟باد سے شب وخون کا اجراء کیا جسے جدیدیت کا پیش رو قرار دیا گیا۔ ادب میں جس وقت وحدانیت کا تصور ختم ہوتا جارہا تھا اس وقت فاروقی صاحب سے جدیدیت کی آواز کے موجد ہوئے۔ جدیدیت جو کہ ادب میں وحدانیت کا قائل ہے۔ ادب کا وہ کون سا میدان ہے جس میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے قلم کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ تنقید، شاعری، فکشن، لغت نگاری، داستان، عروض، ترجمہ یعنی ادب کے ہر صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی۔ انہوں نے شاعری کی پھر لغت نگاری اور پھر تحقیق کی طرف مائل ہوگئے۔ اس کے بعد افسانے لکھنے کا شوق ہوا تو شب خون میں فرضی ناموں سے یکے بعد دیگرے کئی افسانے لکھے جنہیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ فکشن میں بھی وہ ید طولا رکھتے تھے جس کی زندہ مثال ان کا مشہور ومعروف ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں ہے'' جن کی عنوان احمد مشتاق کے شعر سے لیا گیا ہے۔

کئی چاند تھے سر آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمہاری زلف سیاہ تھی

اسلم فرخی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''کئی چاند تھے سر آسماں، اکیسویں صدی ہی کی نہیں اردو فکشن کی بہترین کتاب ہے۔''

ناول کئی چاند سر آسماں کا جائزہ لیتے ہوئے انتظار حسین رقم طراز ہیں کہ۔

''مدتوں بعد اردو میں ایک ایسا ناول آیا ہے جس نے ہندو پاک کی ادبی دنیا میں ہلچل مچادی ہے۔ کیا اس کا مقابلہ اس ہلچل سے کیا جائے جو امراؤ جان ادا نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی؟ اور یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہے جسے اول اول ہم نقاد اور محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے اور محقق فاروقی یہاں پر ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے۔''

کچھ سال پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوی مجموعہ سوار بھی شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کرچکا ہے۔ انہوں نے ان افسانوں میں ٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کی اردو ادبی تہذیب اور ہندو مسلم تہذیب کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ایک مثبت زاویہ نظر عطا کیا۔ ان کے تمام افسانوں کے بارے عام

طور سے کہا گیا کہ نہ صرف اردو بلکہ سارے برصغیر میں اس طرح کے افسانوں کی مثال نہیں ملتی جن میں تاریخ، ادب، سیاست، تہذیب اور شاعرانہ کردار کو بیک وقت اور اس درجہ خوبی سے پیش کیا گیا۔ اردو زبان و ادب تہذیب و ثقافت اور جدید ادبی تنقید کو نئے زاویۂ نظر عطا کرنے والے کثیر الجہات شخصیت کی مثال ملنی مشکل ہے ان کی زندگی میں ہی ان پر پی۔ ایچ ڈی کی گئی۔ پاکستان سے ڈاکٹر صفدر رشید نے ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے بہت ساری کتابیں منظر عام پر آئیں جیسے جدید اردو تنقید کا تجزیاتی مطالعہ (شمس الرحمٰن فاروقی کے خصوصی حوالے سے) از ڈاکٹر نشاط فاطمہ، شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری از محمد منصور عالم، شمس الرحمٰن فاروقی حیات نامہ از نجم فضلی، شمس الرحمٰن فاروقی ''شعر'' غیر شعر اور نثر کی روشنی میں از محمد سالم، شمس الرحمٰن فاروقی محو گفتگو از رحیل صدیقی، کئی چاند تھے سر آسماں ایک تجزیاتی مطالعہ از رشید اشرف۔ اس کے علاوہ کئی ہندو پاک کے رسائل نے فاروقی اور شخصیت پر نمبر بھی جاری کیے۔

ایک خلا ہے جو پر نہیں ہوتا جب کوئی درمیاں سے اٹھتا ہے

◂◂ ● ▸▸

ALFAGRAPHICS
IqraMasjidComplexB-5
MainRoadRanchi-834001
MobileNo-9608337578/ 7903484544
Email-alfagraphics786@gmail.com

نام کتاب: دل میں رہے مقیم صنف: تاثراتی مضامین مصنف: عبدالصمد سن اشاعت: ۲۰۱۴ء صفحات: ۱۸۴ قیمت: ۲۰۰/روپے رابطہ: 212-A Rajni Gandha,Sadaqat Ashram,Patna-800010 Mob:+91-9304999098		نام کتاب: ایک انجانے خوف کی ریہرسل صنف: افسانہ مصنف: مشرف عالم ذوقی سن اشاعت: ۲۰۱۱ء صفحات: ۳۸۲ قیمت: ۳۰۰/روپے رابطہ: D-304 Taj Enclave,Geeta Colony,Delhi-110031 Mob:+91-9310532452

● **یادِ رفتگاں**

● **اشفاق حسین**

احمد فراز: آخری مشاعرہ، آخری ملاقات

فراز صاحب سے پہلی ملاقات کراچی میں ۱۹۷۵ء میں اس وقت ہوئی تھی جب انہیں یوم مئی کے مشاعرے میں اسلام آباد سے مدعو کیا گیا تھا۔ اُن دنوں کراچی میں ترقی پسند ساتھیوں کی دعوت پر وہ ہر سال اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ ایرپورٹ پر ان کا استقبال کرنے والوں میں اپنے دوست مجاہد بریلوی کے ساتھ ساتھ میں نے بھی زبردستی اپنا نام شامل کروالیا تھا کہ کم از کم ان کو قریب سے دیکھنے کا ایک موقعہ تو ملے گا۔ وہ ان کی شہرت اور مقبولیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن اُن سے اصل شناسائی کا دور ٹورنٹو میں ۱۹۸۲ء سے شروع ہوا جب وہ ایک سیاسی جلاوطن شاعر کی حیثیت سے پہلی بار کینیڈا آئے اور پھر ۱۹۸۸ء کے بعد سے یہاں ان کی میزبانی کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ یہ زمانہ ٹورنٹو کے حوالے سے اپنی ایک علاحدہ ادبی تاریخ رکھتا ہے۔

آخری بار اُن سے واشنگٹن کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی جو اُن کی زندگی کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ امریکہ کے پاکستانی نژاد ڈاکٹروں کی تنظیم 'اپنا' کے زیر اہتمام اس سال واشنگٹن میں چار روزہ کنونشن تھا جس میں سیاسی اور سماجی مذاکرے، پروفیشنل سیمینار، موسیقی کی محفلوں، نمائش اور محفل مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ پاکستان سے مدعوئین کی فہرست میں سیاست، ادب اور ثقافت کے بڑے بڑے اسمائے گرامی شامل تھے جن میں احمد فراز صاحب کے علاوہ ضیا محی الدین، بیرسٹر اعتزاز احسن، جسٹس وجیہ الدین اور دوسرے بہت سے اہم نام تھے۔ مشاعرہ ۲۸/جون ہفتہ کے روز ہونا تھا جس کی صدارت احمد فراز صاحب فرما رہے تھے اور مہمان خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب تھے۔ 'اپنا' کی ادبی کمیٹی نے اس سال مجھے بھی کینیڈا سے مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔

جمعہ ۲۷/جون کی شام جب میں واشنگٹن پہنچا تو وہاں ہال میں بہت سے لوگ نظر آئے جن میں ایک طرف تو پاکستان کے سفیر برائے امریکہ حسین حقانی تھے تو دوسری طرف وکلا تحریک کے روح رواں اعتزاز احسن تھے اور وہ دونوں اپنے اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے لیکن ادبی برادری کا کوئی بھی فرد اس وقت مجھے

وہاں نظر نہ آیا۔ معلوم ہوا احمد فراز اور پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دیگر مہمان دوسرے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو کنونشن کی اصل جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر تھا۔ میری بکنگ بھی وہیں تھی۔ ہوٹل میں چیک ان کرنے کے بعد جب میں نے ان حضرات کو فون کیا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا میں نے ان کے لیے پیغام ریکارڈ کروادیا۔

دوسری صبح ابھی سو کر بھی نہ اٹھا تھا کہ فراز صاحب کا فون آیا کہ فوراً کمرے میں آجاؤ۔ ان کے کمرے میں پہنچا تو وہاں افتخار نسیم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ افٹی نسیم اس سے ایک دن پہلے ہونے والے پنجابی مشاعرے میں شرکت کے لیے شکاگو سے آیا تھا اور واپسی کے لیے اپنا سامان ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے بولا کہ اچھا اب میں چلا اور فراز صاحب تمہارے حوالے، گھنٹے بھر سے میں کہے چلا جارہا ہوں کہ میری فلائٹ مس ہوجائے گی مگر یہ جانے ہی نہیں دیتے کہ میں اکیلا ہوجاؤں گا۔ فراز صاحب نے افٹی کی پیٹھ پر ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ ٹھیک ہے اب تم جاؤ، اب میں اکیلا نہیں ہوں۔

فراز صاحب مجھ سے ہمیشہ کی طرح بڑی محبت سے بغلگیر ہوئے۔ میں ان سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد مل رہا تھا۔ مجھے وہ بہت کمزور نظر آئے۔ کہنے لگے کہ معمولی سا اسٹروک ہوا تھا لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حالانکہ ان کے چہرے پر بالکل ٹھیک والے اثرات بالکل نہ تھے۔ انہوں نے اسلام آباد میں سالِ گزشتہ ہونے والے اپنے اسٹروک کا پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح آدھی شب کے بعد انہیں ہلکا سا اسٹروک ہوا مگر فوراً اسپتال جانے کے بجائے صبح کا انتظار کرتے رہے کہ کون اتنی رات گئے ڈاکٹروں کو تکلیف دے۔ انہوں نے پاکستانی ڈاکٹروں کی دل کھول کر داد دی کہ جنہوں نے بے حد خلوص اور توجہ سے ان کی دیکھ بھال کی۔ کہنے لگے کہ اسلام آباد کے اسپتال میں تین یا چار دن تک میں بیڈ پر ہی تھا کہ پھر اچانک میں نے سوچا کہ یہاں پڑے پڑے بور ہورہا ہوں، کیوں نہ بستر سے اٹھ کر اسپتال کا چکر لگایا جائے۔ سو میں نے ایک خاصا بڑا چکر لگایا اور جب واپس بستر پر آیا تو ڈاکٹروں کو بھی حیرانی تھے کہ یہ سب کچھ کیوں کر ہوا۔ سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ ایسا Few in Millions ہوا کرتا ہے۔ ابھی وہ اپنی بیماری کے واقعے کا ذکر ہی کررہے تھے کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے۔ فراز صاحب نے کہا یار اُن سے کہہ دو کہ وہ بھی یہیں آجائیں۔ نارنگ صاحب نے کمرے میں آنے کے بجائے نیچے لابی میں ملنے کو کہا تاکہ کچھ دیر باہر گھوم پھر لیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نیچے لابی میں نارنگ صاحب کا انتظار کررہے تھے۔ اس دوران بہت سے لوگ جن میں زیادہ تر ڈاکٹر تھے اور اسی کنونشن میں شرکت کے لیے آئے تھے، فراز صاحب سے آآ کر ہاتھ ملا رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنی بیوی سے ملواتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کی بہت بڑی مداح ہیں اور اس کنونشن میں

صرف اور صرف آپ کو سننے کے لیے آئی ہیں۔ خاتون نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور تصویر کھنچوانے کے ساتھ ساتھ ان سے کہنے لگیں کہ آج کی صبح میری زندگی کی بہت خوب صورت صبح ہے، میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کو، رات مشاعرے ہی میں دیکھ سکوں گی مگر حسن اتفاق دیکھیے کہ یہاں آپ کو اتنی نزدیک سے دیکھنے اور آپ سے ملنے کا موقعہ مل گیا۔ اسی دوران نارنگ صاحب بھی ڈاکٹر عبدالرحمان عبد کے ساتھ آگئے اور طے یہ پایا کہ دن بہت خوشگوار ہے باہر نکل کر کسی جگہ چائے پی جائے۔ فراز صاحب نے شرط لگادی کہ ریسٹورنٹ ایسا ہونا چاہیے جس کے باہر بیٹھ کر سگریٹ بھی پی جاسکے۔ وہ شراب کے بغیر تو رہ سکتے تھے لیکن سگریٹ کے بغیر ان کا گزارا مشکل تھا۔ مجھے اچانک دس بارہ سال پہلے کا ٹورنٹو کا ایک واقعہ یاد آگیا جب ان کی ایک مداح نے ان سے کہا فراز صاحب آپ اتنے اچھے شاعر ہیں مگر سگریٹ کیوں اتنا پیتے ہیں؟ فراز صاحب ہنسنے لگے تو خاتون نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ذرا بردباری سے کہا کہ جدید تحقیق کے مطابق ساٹھ فیصد سے زیادہ لوگوں کو سگریٹ کی وجہ سے ہی کینسر ہوتا ہے۔ فراز نے برجستہ جواب دیا کہ تحقیق بالکل ٹھیک ہے اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ان چالیس فیصد لوگوں میں سے ہوں جن کو سگریٹ پینے سے کینسر نہیں ہوتا لہٰذا آپ مجھے سگریٹ پینے دیں۔ خاتون مسکرا کر رہ گئیں۔

فراز صاحب، گوپی چند نارنگ صاحب اور ہم سب لوگ ہوٹل سے نکلے۔ آج واشنگٹن میں موسم بہت اچھا تھا، بہت سارے لوگ جاگنگ کرتے ہوئے نظر آئے۔ لیکن میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ فراز صاحب کو چلنے میں کچھ دشواری پیش آرہی ہے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ان کے بولنے کے انداز میں بھی وہ روانی نہیں تھی جو اُن کی پہچان تھی۔ اب ہمیں کسی ایسے ریسٹورنٹ کی تلاش تھی جہاں فراز صاحب اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ پی سکیں۔ بڑی مشکلوں کے بعد ایک دیسی ریسٹورنٹ میں ایسی سہولت نظر آئی۔ ہم لوگ باہر بیٹھ کر چائے پینے اور گپ شپ کرنے لگے۔ اس دوران بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی ادھر سے گزرتے ہوئے فراز صاحب سے علیک سلیک کرتے رہے۔ فراز صاحب اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھے لیکن ہم لوگ کانفرنس کے اُس سیشن میں ضرور شرکت کرنا چاہتے تھے جس میں ایک ہی اسٹیج پر حسین حقانی، اعتزاز احسن اور جسٹس وجیہ الدین اپنے خیالات کا اظہار کرنے والے تھے۔ لیکن فراز صاحب نے اٹھنے میں اتنی دیر کردی کہ ہم وہاں وقت پر نہ پہنچ سکے جس کا ہمیں بے حد افسوس تھا۔ کانفرنس میں جانے سے پہلے فراز صاحب واش روم میں چلے گئے اور نارنگ صاحب اور میں ان کے انتظار میں باہر کھڑے رہے۔ خلافِ توقع کافی وقت لگ گیا۔ جب پندرہ بیس منٹ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تو نارنگ صاحب نے مجھ سے کہا اندر جاکر دیکھیے خیریت تو ہے۔ اتنے میں فراز صاحب مسکراتے ہوئے باہر آگئے۔ انہوں نے ہم سے کچھ کہا تو نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں گردے کی تکلیف تھی جس کا اظہار بعد میں ہوا۔ ہم لوگوں نے وہیں دوپہر کا کھانا کھایا اور تھوڑی دیر بعد اپنے ہوٹل میں واپس آگئے۔ فراز

صاحب تنہا نہیں رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نارنگ صاحب اور مجھ سے کہا کہ کچھ دیر کمرے میں بیٹھیں مگر ہم دونوں کا خیال تھا کہ رات کو مشاعرے میں دیر تک جاگنا ہوگا لہٰذا تھوڑی دیر آرام کر لیا جائے۔ طے یہ ہوا کہ شام سات بجے ملیں گے مگر میں ابھی کمرے میں سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف احمد فراز، فیض صاحب والے انداز میں کہہ رہے تھے بھئی کہاں رہ گئے؟ اب تو اندھیرا ہونے والا ہے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی شام کے صرف ساڑھے پانچ بجے تھے اور ہم لوگ انہیں چار بجے کے قریب اُن کے کمرے میں چھوڑ کر آئے تھے۔ میں نے کہا فراز صاحب ہمیں تو سات بجے ملنا تھا۔ کہنے لگے ارے چھوڑیں سات بجے کو، بس فوراً آجائیں۔ تیار ہو کر جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ بستر پر آرام کرنے کے بجائے کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے یار یہ کافی میکر یہاں رکھا ہوا ہے مگر مجھے اس کا طریقہء استعمال نہیں معلوم۔ اگر آپ بنا سکیں تو ٹھیک ہے ورنہ روم سروس کو آرڈر کر دیں۔ کافی بنانے کے لیے پانی لینے جب میں واش روم میں گیا تو وہاں ان کے موزے گیلے پڑے ہوئے تھے جن سے پیشاب کی بو سی آ رہی تھی اور شاید انہوں نے سکھانے کے لیے ڈالا ہوا تھا۔ میں نے کافی میکر میں پانی ابالنے کے لیے رکھا اور واپس جا کر ان کے موزے دھوئے اور اس خیال سے کہ رات کو مشاعرے میں جانے تک شاید یہ موزے سوکھ نہ سکیں تو کمرے میں رکھی ہوئی استری آن کر کے اسے سکھانے لگا۔ فراز صاحب وہیں کرسی پر براجمان تھے کہنے لگے کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا موزوں پر استری کر رہا ہوں تا کہ جلدی سوکھ جائیں۔ کہنے لگے نہیں، نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس دوسرے موزے ہیں، میں وہ پہن لوں گا۔ آپ بس ادھر آجائیں۔ میں نے اپنے اور ان کے لیے کافی تیار کی اور کچھ پاکستان کی سیاست کا ذکر چل نکلا۔ فراز صاحب پیپلز پارٹی کی موجودہ سیاسی روش سے خاصے آزردہ تھے۔ کہنے لگے یہ وہ پیپلز پارٹی نہیں جو بھٹو کی پارٹی تھی۔ پھر خود ہی بتانے لگے کہ وکلا کے احتجاجی لانگ مارچ کے اختتام پر جو جلسہ اسلام آباد میں ہوا تھا اُس میں انہوں نے اس شرط پر شرکت کی تھی کہ وہاں جلسہ گاہ میں پیپلز پارٹی کے بھی جھنڈے نظر آنے چاہئیں۔ ان کی رائے کا قطعی علم ہونے کے باوجود میں نے جب ان سے پوچھا کہ کیا پرویز مشرف صاحب اقتدار چھوڑ دیں گے تو انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ ایسا آسانی سے ہرگز نہیں ہوگا۔ فوجی جب ایک بار اقتدار کا مزہ چکھ لیتا ہے تو پھر اس کا نشہ آسانی سے نہیں اترتا۔ اس موقعے پر انہوں نے جنرل ایوب خان کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا جو ۱۹۵۸ء کے مارشل لا سے متعلق تھا۔ کہنے لگے اُس زمانے میں کراچی میں ملک اشرف ایک بڑے بزنس مین تھے۔ ان کے بھتیجے یا بھانجے نے مجھے بتایا کہ ان دنوں جنرل ایوب خان نے ملک اشرف سے ایک میٹنگ کی اور اس سے کہا کہ حکومت کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ وہ شاید اس بار میری ملازمت میں توسیع نہ کرے تو میں سوچتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی کاروبار کروں۔ چنانچہ تم مجھے کوئی مشورہ

دو۔ ملک اشرف نے کہا کہ کاروبار کے لیے تو سرمایہ درکار ہوتا ہے تم بتاؤ کہ تمہارے پاس کتنا سرمایہ ہے؟ ایوب خاں نے حساب کتاب لگا کر جس میں پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اور دوسری جمع پونجی بھی شامل تھی سب گن کر بتایا تو کل رقم تقریباً چار ساڑھے چار لاکھ روپے بنتی تھی۔ (اس وقت یہ رقم بھی خاصی ہوا کرتی تھی) ملک اشرف نے کہا یہ پیسے تو بہت کم ہیں۔ کوئی فیکٹری ویکٹری تو نہیں لگ سکتی البتہ ان پیسوں میں ایک کاروبار ہو سکتا ہے جو آج کل بہت فائدہ مند ہے اور وہ کاروبار گارمنٹ ایکسپورٹ کرنے کا ہے۔ یورپ میں ہمارے ریڈی میڈ گارمنٹس کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ ایوب خان نے کہا تو کیا میں کمانڈر انچیف بننے کے بعد اب کپڑے بیچوں گا؟ بات آئی گئی ہوگئی اور پھر کچھ دنوں ہفتوں یا مہینوں کے بعد پاکستان میں ایوب خاں نے مارشل لا لگا دیا۔ فراز صاحب کہنے لگے جب فوجی جنرل چھاؤنیوں سے نکل کر اقتدار کی چمک دمک دیکھتے ہیں تو ان کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔ وہ ایوب خاں ہو، یحییٰ خاں ہو، ضیاالحق ہو یا جنرل مشرف، اقتدار ملنے کے بعد سب ایک ہی طرح کے ہو جاتے ہیں۔

گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے ان سے ایک اور سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ جب جنرل ضیا الحق نے مارشل لا لگایا تو تمام رائٹ ونگ قوتوں نے جن میں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، تمام مذہبی جماعتوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ، وکلا اور صحافیوں نے غرض یہ کہ جن جن کا بھی تعلق یا جن جن کے بھی نظریات دائیں بازو والوں سے ملتے تھے ان سب ری ایکشنری طاقتوں نے ضیاالحق کی کھل کر حمایت کی اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھایا تو اگر اتفاق سے ایک جنرل خود اپنے ذاتی اقتدار کی وجہ سے یا بیرونی طاقتوں کے دباؤ کے تحت روشن خیالی کی باتیں کر رہا تھا تو لیفٹ ونگ فورسز نے اس کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو مضبوط کیوں نہیں کیا؟ اس پر فراز صاحب نے کہا کہ بھئی ہم لوگوں نے شروع میں تو اس کے لبرل خیالات کو سراہا تھا لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ سب کچھ بدنیتی کی بنیاد پر ہے تو ہم نے تو یہ کہہ کر اپنے اعزازات وغیرہ کو خود ٹھکرا دیا تھا کہ

اُس نے چاہت کے عوض ہم سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے کچھ ڈاکٹر صاحبان فراز سے ملنے آ گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر صاحب فراز کو شام کے وقت ڈرنک اور کھانے کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔ مشاعرہ کمیٹی کے نگراں ڈاکٹر سلمان ظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر شمیم نے مجھے خاص طور سے یہ ہدایت کی تھی کہ فراز کو کہیں ڈرنک وغیرہ کے لیے باہر کسی کے ساتھ نہ جانے دیں۔ چنانچہ فراز کے مداح سے میں نے کہا کہ منتظمین مشاعرہ نے تمام شعراء کے کھانے کا اہتمام دوسرے ہوٹل میں کر رکھا ہے۔ البتہ آپ کو پینے پلانے کا جو

انتظام کرنا ہے وہ یہیں کمرے میں کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے بھلے مانس انسان نکلے کہنے لگے جناب ہم تو فراز صاحب کے قدموں میں کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ شراب و کباب تو صرف ملاقات کی ایک وجہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے کمرے ہی میں وہسکی کی ایک بوتل منگوالی اور تھوڑی دیر کے لیے فراز کا کمرہ ہی میخانے میں تبدیل ہوگیا۔ اس لیے کہ زیادہ تر لوگ جو اُن سے ملنے آرہے تھے وہ ایک دو گھونٹ فراز صاحب کے نام پر ضرور پی رہے تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران صرف اور صرف فراز کے شعر سنے جارہے تھے مگر خود فراز نے اپنا ایک بھی شعر نہیں سنایا۔ ہر شخص کو اُن کے کچھ نہ کچھ اشعار یاد تھے۔ نیویارک سے آئی ہوئی ایک ڈاکٹر صاحبہ نے فراز کی نظم 'کالی دیوار' کی فرمائش کر دی۔ ڈاکٹر عبداللہ کو یہ نظم پوری یاد تھی انہوں نے نظم سنانے سے پہلے اس نظم کی وجہِ تخلیق بتائی کہ فراز صاحب جب پہلی بار واشنگٹن آئے تو ڈاکٹر عبداللہ ان کو شہر کی سیر کرانے لے گئے۔ اور جب انہوں نے ویتنام میموریل دیکھا تو فراز صاحب پر ایک لمبی خاموشی طاری ہوگئی۔ شام کو گھر آنے کے بعد انہوں نے 'کالی دیوار' کے نام سے یہ نظم لکھی۔ 'کالی دیوار' والی نظم اپنی اصل حالت میں ڈاکٹر عبداللہ کے پاس محفوظ رہ گئی تھی۔ انہوں نے وہی نظم سنائی۔ کلیات میں شائع ہونے والی نظم میں کچھ مصرعے تبدیل ہوگئے تھے۔ پروفیسر نارنگ نے ڈاکٹر عبداللہ سے کہا کہ ان دونوں نظموں کو آپ اپنے تبصرے کے ساتھ کہیں شائع کروادیں تاکہ ریکارڈ پہ آجائے۔ غرض اسی قسم کی باتوں میں شام گزر گئی۔ فراز صاحب بھی اپنا گلاس بہت آہستہ آہستہ خالی کررہے تھے کہ یہ شغلِ میکشی کا دور تھا، ہوسِ میکشی کا نہیں۔ بعد میں ہم لوگ پیدل چلتے ہوئے اپنے ہوٹل سے میریٹ ہوٹل میں آئے جہاں کھانے اور مشاعرے دونوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

مشاعرے کی نظامت میرے ذمے تھی جبکہ اس کی صدارت احمد فراز صاحب فرمارہے تھے اور پروفیسر نارنگ اس مشاعرے کے مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرے کی ایک دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ اس میں اعتزاز احسن نے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی اور پورے مشاعرے میں اسٹیج پر بیٹھے رہے۔ شاید یہ ان کا پہلا بین الاقوامی مشاعرہ اور احمد فراز کا آخری مشاعرہ تھا۔ مشاعرے میں سب سے پہلے میزبان ڈاکٹروں نے اس کے بعد واشنگٹن کے شعرا نے اپنا کلام سنایا جن میں خاص طور سے مونا شہاب، ڈاکٹر عبداللہ اور شکیل آزاد شامل تھے۔ اس کے بعد امریکہ اور کینیڈا سے آئے ہوئے شاعروں نے اپنا کلام سنایا جن میں میرے علاوہ حمیرا رحمان، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر شہلا نقوی اور ڈاکٹر محمد شفیق شامل تھے۔ فراز صاحب سے پہلے اعتزاز احسن کو دعوتِ کلام دی گئی۔ ان کی شاعری سننے سے پہلے ہی ان کی شخصیت کا جادو حاضرین پر چڑھ چکا تھا۔ چنانچہ ان کا پرزور تالیوں میں استقبال ہوا اور انہوں نے اپنی طویل نظم 'میرا سفر' سنا کر حاضرین سے خوب داد لی۔ مشاعرے کے صدر احمد فراز صاحب جب اپنا کلام سنانے آئے تو انہیں بھی خوب دل کھول کر داد دی گئی اور تالیوں کی گونج

میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ میں نے ہی نہیں بلکہ سب نے محسوس کیا کہ اب ان کے پڑھنے کے انداز میں وہ روانی اور وہ جوش و ولولہ نہیں تھا جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا اور یادداشت نے بھی کسی حد تک ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کی فرمائش پر جب انہوں نے اپنی مشہور نظم 'محاصرہ' سنائی تو سینکڑوں بار پڑھی ہوئی اس نظم کے بھی وہ کئی مصرعے بھول رہے تھے لیکن انہیں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ اور حاضرین دہرا رہے تھے۔ آخر میں مہمان خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہمیشہ کی طرح شہد کی سی مٹھاس میں ڈوبی ہوئی زبان میں اردو زبان کے موضوع پر تقریر کی اور واقعی تقریر کا حق ادا کر دیا۔ مشاعرہ تقریباً تین بجے صبح ختم ہوا اور وہاں سے نکلتے نکلتے اور لوگوں سے ملتے ملتے چار بج گئے۔ ہم لوگ پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی فراز نے کہا کہ بھوک لگ رہی ہے لہٰذا سونے سے پہلے کچھ کھالینا چاہیے۔ چنانچہ میں اور نارنگ صاحب فراز کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئے اور میں نے فون پر کھانے کی کچھ چیزیں آرڈر کر دیں۔ ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو اچانک سورج کی روشنی سے پورا کمرہ جگمگانے لگا۔ نارنگ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ آپ دونوں تو شاعر حضرات ہیں اور شاعروں کی راتیں تو کالی ہوتی ہی رہتی ہیں مگر اب چل کر کمرے میں تھوڑی دیر سو لینا چاہیے کیوں کہ بارہ بجے چیک آؤٹ کا وقت ہے اور اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ بمشکل تمام فراز صاحب سے اجازت لے کر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے فراز صاحب کہہ رہے تھے کہ بھئی ساڑھے دس بج چکے ہیں ابھی تک آپ سو رہے ہیں؟ بس تیار ہو کر فوراً ادھر آجائیں۔

ان کے کمرے میں جب پہنچا تو وہ اپنا سوٹ کیس پیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا اور ساتھ ہی ساتھ ان کو یاددہانی بھی کراتا رہا کہ انہیں اگلے روز یعنی ۳۰ر جون پیر کے دن کینیڈین سفارت خانے میں ویزا لینے ڈاکٹر عبداللہ کے ساتھ جانا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ اس سال کے شروع میں انہیں میں نے کینیڈا آنے کی دعوت دی تھی مگر وہ اپریل کے مہینے میں جب امریکہ تک آئے تو کینیڈا کا ویزا اُن کے پاس نہیں تھا۔ مجھ سے وعدہ کیا کہ جون کے مہینے میں یہاں پھر آنا ہوگا تو اس وقت ٹورنٹو ضرور آؤں گا۔ مگر اس بار بھی وہ کینیڈا کا ویزا لے کر نہیں آئے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک ویزے وغیرہ کا انتظام پورا نہ ہوجائے مشاعرے کی تاریخ کا اعلان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ان کے پاکستان چلنے سے پہلے وہاں فون کیا تو کہنے لگے کہ میرا لندن میں محسن احسان کی عیادت کرنے کے لیے جانا بہت ضروری تھا اس لیے میں نے پہلے برطانیہ کے ویزے کے لیے اپلائی کیا مگر وہاں سے پاسپورٹ چند دنوں قبل ہی واپس آیا ہے لہٰذا اب آپ واشنگٹن کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آرہے ہیں تو میرے لیے نیا دعوت نامہ وہیں

لیتے آئیں، میں وہیں واشنگٹن میں ویزے کی درخواست دوں گا۔ چنانچہ واشنگٹن پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر عبداللہ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ فراز صاحب کو لے کر کینیڈین سفارت خانے چلے جائیں۔ انہوں نے عدہ کیا کہ وہ ضرور کل صبح ہی جا کر ویزے کے لیے اپلائی کر دیں گے۔

ان کی پیکنگ مکمل ہوگئی تو میں نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان سے رخصت ہونے کی اجازت لی۔ فراز صاحب اُٹھ کر بہت محبت سے بغلگیر ہوئے اور کہنے لگے کہ بس میں بھی ڈاکٹر عطیہ کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ لوگ بھی آتے ہی ہوں گے۔ پھر میں ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے وہیں چلا جاؤں گا اور وہیں پر فون کے ذریعے رابطہ رہے گا۔

نیچے ہوٹل کی لابی میں نارنگ صاحب اور تقی عابدی پہلے سے موجود تھے۔ ہم تینوں کو ایک ہی گاڑی میں ایرپورٹ جانا تھا۔ گاڑی آنے میں کچھ دیر تھی تو ہم لوگ وہیں ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں کافی پینے بیٹھ گئے۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ فراز صاحب بھی اپنا سامان لے کر لابی میں آ گئے۔ میں نے پوچھا کیا ڈاکٹر عطیہ آ گئیں تو کہنے لگے نہیں، بس آتی ہی ہوں گی۔ میں کمرے میں اکیلا تھا، سوچا نیچے آ جاؤں۔ مجھے افٹی کی کہی ہوئی بات ایک بار پھر یاد آ گئی کہ اشفاق، ان دنوں فراز صاحب اکیلے رہنے سے گھبرانے لگے ہیں۔ وہ بزم آرائی کے شوقین تھے اور ہر دم اپنے لوگوں اور مداحوں کے درمیان ہی رہنا چاہتے تھے۔

بہت سے لوگ اکثر کہتے ہیں کہ آخر اس عمر میں فراز صاحب کو اتنا سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ یہی تو ان کی زندگی تھی۔ اچھی شامیں اور اپنی پسند کے لوگوں سے ملاقاتیں ان کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری تھیں۔

بہر حال ڈاکٹر عطیہ تو اس وقت تک نہ آ سکیں مگر ہماری ایرپورٹ شٹل آ گئی۔ ایرپورٹ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ایک بار پھر ان سے گلے ملے مگر وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

کینیڈا واپس پہنچنے کے بعد جب میں نے فون کیا تو فراز صاحب نے بتایا کہ وہ آج کینیڈین سفارت خانے گئے تھے مگر جب وہاں پہنچے تو اس وقت تک ویزا کاؤنٹر بند ہو چکا تھا اب کل صبح سویرے جا کر ویزا لوں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ کل تو پہلی جولائی کی وجہ سے کینیڈا ڈے کی چھٹی ہوگی لہٰذا آپ دوسرے روز ۲/جولائی کو جایئے گا۔ مگر ۲/جولائی کا پورا دن گزر گیا اور ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ دوسرے دن ۳/جولائی کو اُن سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے ان سے ویزے کے بارے میں پوچھا تو فراز صاحب نے ہنستے ہوئے پورا قصہ سنایا۔ معلوم ہوا کہ ویزا لینے کے لیے جب کینیڈین سفارت خانے پہنچے تو ڈاکٹر عبداللہ نے انہیں بالکل دروازے پر اتارا اور یہ کہہ کر گئے کہ گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔ اس دوران فراز صاحب سیڑھیوں سے گر پڑے اور ان کے سر، گھٹنے اور کہنی پر چوٹ آئی اور چہرے پر بھی کئی خراشیں پڑ گئیں۔ ایمبولینس بلوائی گئی اور

انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ کہنے لگے کہ اس وقت میرے پورے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اب ایسی حالت میں تو میں مشاعرہ پڑھنے ٹورنٹو نہیں آ سکتا بلکہ سوچ رہا ہوں کہ جلد از جلد گھر چلا جاؤں۔ مگر یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ جیسے ہی طبیعت بہتر ہوئی تو ٹورنٹو ضرور آؤں گا۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع ملی کہ فراز صاحب تو بہت بیمار ہیں اور وہ شکاگو کے اسپتال میں داخل ہو چکے ہیں تو مجھے بالکل یقین ہی نہیں آیا۔ میرے حساب سے تو انہیں اس وقت پاکستان میں ہونا چاہیے تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ چونکہ ان کی سیٹ فوراً کنفرم نہ ہو سکی تھی لہٰذا وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس شکاگو چلے گئے جہاں ان کی طبعیت زیادہ خراب ہوگئی اور وہ اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ان کے ایک گردے نے بالکل ہی کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ ابھی آئی سی یو میں تھے کہ ان کے انتقال کی خبر پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ تصدیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی مگر ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان کے دوسرے گردے نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور وہ کسی کو پہچان بھی نہیں رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس دوران فراز صاحب سے رابطے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ پھر پتہ چلا کہ ۳/اگست کو وہ ٹورنٹو سے پی آئی اے کے ذریعے اسلام آباد جائیں گے۔

ٹورنٹو میں جب ایک ٹرمینل سے انہیں دوسرے ٹرمینل پر ایمبولینس کے ذریعے انہیں منتقل کیا جا رہا تھا تو مجھے آخری بار انہیں ایرپورٹ پر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان کے ساتھ ایک نرس اور ان کے بیٹے شبلی فراز سفر کر رہے تھے۔ فراز صاحب کسی کو پہچان نہیں رہے ہیں مگر مجھے اس وقت بہت حیرت ہوئی جب اسٹریچر پر لیٹے ہوئے ان کی آنکھوں میں تھوڑی سی جنبش ہوئی اور انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ آہستہ سے اٹھایا۔ کچھ دیر تک وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے رہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ اشفاق دیکھو میں نے ٹورنٹو آ کر تم سے اپنا کیا ہوا وعدہ نبھا دیا۔ یہ اپنے دور کے ایک بہت خوب صورت شاعر سے میری آخری ملاقات تھی۔

◂◂ ● ▸▸

1570 River Road
Ottawa , Ontario,
Canada. K4M 1B4.
Ph 647 588 3499
ashfaqhussaincanada@gmail.com

● یادِ رفتگاں

● ڈاکٹر منظر اعجاز

ظفر عدیم کی چند منظومات و امتیازات

ظفر عدیم کی لازوال جنبش قلم نے ورق سادہ پر جوگل بوٹے اور گلزار کھلائے ہیں، ان میں حرکت وحرارت اور رقص وموسیقی کا آہنگ بے مثال ہے۔ اور یہ کمال ان کے اسلوب سے ظاہر ہے۔ مجاز وساحر کے نظمیہ ڈکشن کے دلدادگان میں ایک وہ بھی تھے لیکن انہوں نے خود کو سب سے الگ رکھا اور اس مقام ومرتبے پر ایستادہ کیا جو متقدمین ہی نہیں معاصرین اور متاخرین سے بھی منفرد اور ممتاز ہے۔ ظفر عدیم منثورات ومنظومات کی مختلف تخلیقی جہات پر زبردست دسترس رکھتے تھے۔ وہ ہم عصروں میں مزاجاً بھی عدیم النظیر اور فقید المثال تھے۔

ظفر عدیم نے درجن بھر نثری اور شعری تصانیف میں اپنے مخصوص تخلیقی وجدان کے ساتھ ساتھ طرز واسلوب کی سطح پر بھی اپنے امتیازات برقرار رکھے ہیں۔ ''لالہ رخ'' طویل منظوم ڈرامہ کے علاوہ بھی انہوں نے منظوم کہانیاں لکھی ہیں۔ غزل کے روایتی دیوان ''دیوان عدیم'' کے علاوہ بہت سی معرکہ آراء نظمیں کہی ہیں۔ میں یہاں ان کے مجموعہ کلام ''بھینی بھینی مہک'' کے باب ''تاثریت'' کے علاوہ اسی نوع کی بعض دوسری تاثراتی نظموں کے حوالے پر اکتفا کروں گا۔

ظفر عدیم کا گھر مظفر پور میں پکی سرائے چوک کے پاس مسجد سے متصل اور مسلم کلب کے سامنے تھا۔ ظفر عدیم کے نوعمری کے زمانے تک مسلم کلب میں بھی شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق اور ملکہ خداداد تھا چنانچہ دوسرے مقامی اور غیر مقامی شاعروں کے علاوہ انہوں نے فراق اور جگن ناتھ آزاد کے علاوہ کئی عظیم المرتبت شاعروں کو قریب سے دیکھا اور سنا بھی تھا اور ان کی ذات وصفات سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد سے مکالمت اور مراسلت بھی تھی چنانچہ ''بھینی بھینی مہک'' کے باب ''تاثریت'' میں ان دونوں سے متعلق نظمیں ہیں۔ تیسری نظم ''آہ پروین شاکر'' ہے یہ نظم ''ادب ساز'' کے لئے غالباً نصرت ظہیر کی فرمائش پر لکھی گئی۔ ''غریب الوطن۔ شین مظفر پوری'' کا محرک کیا تھا، کون تھا، اس کا مجھے علم نہیں۔ ''اردو اداس ہے'' جناب اغفار احمد ناز انصاری کی یاد میں'' ظفر انور کی گزارش پر معرض وجود میں

آئی۔ ''مجذوب صفت شاعر جناب الیاس نجم مظفر پوری'' اس باب کی آخری نظم ہے۔ اس کا محرک ان کے اپنے وجدان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے اس قسم کی کئی نظمیں اور کہیں جو کسی نہ کسی کی گزارش یا فرمائش پر معرض تخلیق میں آئیں۔ ان کا یہ مزاج عجیب وغریب اور حیرت انگیز تھا کہ وہ اپنی تحریر یا تخلیقات خود کسی رسالے یا میگزین میں اشاعت کے لئے نہیں بھیجتے تھے۔ ان کے کئی افسانے میں نے ''گلبن'' اور ''نیا دور'' وغیرہ کو بھیجے۔ نیا دور میں جو افسانہ شائع ہوا اور ان کے افسانوی مجموعہ ''پھول اور خوشبو'' میں شامل ہے، میری ہی تحریک پر مظفر پور کے سفر کے دوران لکھا گیا۔ میں نے ان سے ایک بڑے ناقد کے سلسلے میں تاثراتی نظم لکھوائی جو ''انشاء'' میں شائع ہوئی۔ میں نے فراق کے سلسلے میں مضامین کا مجموعہ ''فراق اور غزل کا اسلوب'' شائع کیا تو ''بھینی بھینی مہک'' کے باب ''تاثریت'' میں شریک نظم ''وحید العصر: جناب رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری'' اپنی مرتبہ اس کتاب میں شامل کرلی۔ اس کتاب کے ساتھ فراق ہی سے متعلق ایک دوسری کتاب کا مسودہ کتابت کے مرحلے میں تھا تو فون کے ذریعے فراق سے متعلق ایک نظم کی گزارش کی اور انہوں نے بلا تاخیر نظم ارسال کردی۔ اس کتاب کا عنوان ''فراق ماسوائے غزل'' ہے اور ابھی یہ شائع نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال وحید العصر: فراق سے متعلق مطبوعہ نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو ے

پرواز یوں جلو میں لیے رنگ و بو گئی   فطرت بہار بن کے برائے نمو گئی
لوح و قلم کو تھام لیا، دست فکر نے   ذات فراق اوج سعادت کو چھو گئی

یہ وضاحت یہاں غیر ضروری نہ ہوگی کہ ظفر عدیم نے فراق کی شاعری بالخصوص غزل کے حوالے سے تاثراتی مضامین بھی لکھے۔ یہ مضامین بھی فرمائشی تھے۔ فراق کا انتقال ۱۹۸۲ء میں فروری کے مہینے میں ہوا۔ میں ''انعکاس'' نکال رہا تھا۔ میں نے فراق نمبر کا اعلان کیا تو ظفر عدیم سے مضامین کی گزارش کی اور انہوں نے مضامین لکھے۔ ان کا خیال تھا کہ فراق کی اکثر وبیشتر راتیں بے خوابی میں گزریں۔ اور اکثر وبیشتر غزلیں ایسی ہی بے خواب راتوں میں تخلیق پذیر ہوئیں۔ متذکرہ نظم کے دوسرے بند میں ایسے ہی تاثرات کا اظہار نظر آتا ہے:

تخلیق لے کے ہاتھ میں قندیل آتی تھی   پہلے پہر، تجلیِ تخئیل آتی تھی
ہوتا تھا پھر فراق پہ اسرار کا نزول   جیسے فلک سے آیت ترتیل آتی تھی

اس نظم کا چوتھا بند بھی اسی خیال سے مربوط ہے:

پیراہن نفس میں عروس سخن ملی   شبنم کی چاندنی سے غزل کی کرن ملی
جب پَو پھٹی، تو نجم سحر بول اٹھا فراقؔ   کس شان سے پیمبریٔ وفکر وفن ملی

شاعر کے تخیّل کی پرواز نے جو تراکیب نکالی ہیں، جو تشبیہیں تراشی ہیں، جو پیکر ڈھالے ہیں وہ متوجہ ہی نہیں کرتے، متاثر بھی کرتے ہیں۔ عظیم المرتبت: جگن ناتھ آزاد میں تو اور بھی کچھ ہے۔ یہ اشعار دیکھیں:

نطق وہ نطق کہ احساسِ بشر بول اٹھے　　درد وہ درد کہ فریاد جسے کہتے ہیں
شعر وہ شعر کہ ساز دل سوزاں جاگے　　فن وہ فن، فکر کی روداد جسے کہتے ہیں
وہ سخنور کہ کھلے جس پہ جہاں کے اسرار　　وہ ادب ساز کہ نقّاد جسے کہتے ہیں
دور گردوں کے دمکتے ہوئے سیّاروں سے　　ایک سیّارہ ہے آزاد جسے کہتے ہیں

جناب جگن ناتھ آزاد کی شخصیت وفن پر ظفر عدیم نے اپنے تاثرات کا اظہار مزید بارہ اشعار میں کیا ہے لیکن منقولہ بالا اشعار قصیدے کی تشبیب یا تقریر وتحریر کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے فضا آفرینی اور ماحول سازی کا کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ ان میں نطق، درد، شعر، اور فن جیسے الفاظ کی تکرار سے موسیقی کی لہریں اور جھنکاریں جو پیدا کی گئی ہیں، وہ بطور خاص توجہ طلب ہیں۔ دوسرے فنّی محاسن میں مخصوص لفظیاتی نظام بھی ہے جو ظفر عدیم کو اپنے ہم عصروں میں انفرادیت اور امتیاز عطا کرتا ہے۔ اس نظم کا آخری بند دعائیہ ہے اور اختتام اس کا اس شعر پر ہوا ہے:

جب تک اردو ہے جہاں تاب، ادب میں آزاد　　تیرا رتبہ، تری عظمت، ترا اعزاز رہے

ظفر عدیم نے برصغیر ہی نہیں، پوری اردو دنیا کی نہایت ہی مشہور ومقبول شاعرہ پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے نثری اسلوب میں بھی قلم فرسائی کی ہے۔ یہ مضمون ''ہر چہ باداباد'' میں شامل ہے۔ غالباً یہ مضمون ''ادب ساز'' کے لئے لکھا گیا تھا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ بھی منفرد انداز و اسلوب پر مشتمل ہے۔ لیکن ''آہ پروین شاکر'' بھی موسیقیت اور غنائیت کے لحاظ سے کیف واثر میں ڈوبی ہوئی نظم ہے۔ قطعہ کی صورت میں چار بند یعنی سولہ مصرعوں پر مشتمل یہ مختصر سی نظم احساسات وجذبات سمیت تاثرات میں بے پناہ وسعت کی حامل ہے۔ اور یہ پروین شاکر کے فن سے ماخوذ تاثرات پر مشتمل ہے۔ پوری نظم ملاحظہ ہو:

گھنیرا لہجہ وہ حُسن کا تھا　　کھلی زباں وہ جمال کی تھی
وجود میں فکر و فن تھا شامل　　عدم میں شرکت، خیال کی تھی
جدید بندش، زباں کی سج دھج　　غزل غز ل وہ تراش اس کی
اسے امر کر گئی ادب میں　　وہ جستجو وہ تلاش اس کی
سمو کے لفظوں میں موج دریا　　صدف صدف دھارے توڑتی تھی

خلا سے لاکر خیالی پیکر　　زمیں سے سیّارے توڑتی تھی
وہ شاعرہ ذات شش جہت تھی　　زمین اور آسماں سے گزری
علامتوں میں وہ جی رہی تھی　　وہ استعاروں میں جاں سے گزری

غریب الوطن: جناب شین مظفر پوری۔ مسدس کے فارم میں پانچ بند پر مشتمل ہے۔ شین مظفر پوری نے مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آگے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ پھر وہیں صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ افسانہ نگاری بھی اسی دوران شروع ہوئی۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے شہرت و مقبولیت حاصل کر لی۔ ماہنامہ آرٹسٹ کے مدیر نے آرٹسٹ کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی تو تقسیم کے سانحے سے پہلے دہلی کا سفر کیا اور اس سانحہ کے رونما ہونے کے ساتھ سیل بلا خیز میں بہتے ہوئے لاہور پھر کراچی چلے گئے۔ یہ سفر اتفاقی اور حادثاتی تھا۔ جب وطن واپس ہوئے تو ''سنگم'' روزانہ پھر ماہنامہ ''صنم'' اور اخیر میں اردو اکادمی، بہار کے ماہنامہ ''زبان وادب'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد اپنے گاؤں باتھ اصلی، سیتامڑھی، مظفر پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں آخری سانس لی۔ ان کی زندگی جدو جہد اور عسرت میں گزری۔ ظفر عدیم نے اس نظم میں ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو:

نشاں، نقوشِ گزر گاہ چھوڑ آیا تھا　　غبار و گرد سر راہ چھوڑ آیا تھا
فضا میں اپنی تڑپ، آہ چھوڑ آیا تھا　　شکستہ شمس تھکا ماہ چھوڑ آیا تھا
ضرورتوں کا سمندر عبور کر کے چلا　　دیار غیر کو بھی کوہ طور کر کے چلا

شین مظفر پوری نے زندگی کی دو تہائی سے زیادہ اپنے دیار مظفر پور سے دور غریب الوطنی میں گزاری۔ دیار غیر سے مراد دلی ہے، جہاں وہ ماہنامہ آرٹسٹ کے مالک کے بلاوے پر گئے تھے اور کچھ ہی مہینے بعد آفت ناگہانی میں پھنسے۔ اپنی سرگزشت ''رقص بسمل'' میں شین مظفر پوری نے زندگی کی محرومیوں، مایوسیوں اور کرب واضطراب پر نہایت ہی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ ہمیشہ مسائل ومصائب سے دوچار رہے۔ اسی معنوی تناظر میں یہ بند ملاحظہ ہو:

صعوبتوں میں بھی تخلیق کر گیا کیا کیا　　خیال وخواب کے دامن میں بھر گیا کیا کیا
حیات و ذات کے سر سے گزر گیا کیا کیا　　اس ایک شخص کے مرنے سے مر گیا کیا کیا
زباں کا طنز بیاں کا گداز دفن ہوا　　ادب کا سوز، زمانے کا ساز دفن ہوا

ایک نظم ''اردو اداس ہے'' جناب اغفار احمد ناز انصاری کی یاد میں تخلیق ہوئی۔ بقول ظفر انور:

''۱۹۹۲ء میں دہلی کے عظیم صحافی جناب ناز انصاری صاحب کا انتقال حج کے دوران عرفات کے میدان میں ہو گیا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی...ان کے انتقال کے بعد میں نے ناز صاحب کی حیات و خدمات پر ایک مجلّہ شائع کرنے کا ارادہ کیا اور ظفر عدیم صاحب سے گزارش کی کہ آپ ایک منظوم خراج عقیدت تحریر فرمادیں تا کہ میں اسے مجلّے میں شائع کردوں۔ میری درخواست انہوں نے قبول فرمائی اور ایک شاہکار منظوم خراج عقیدت لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔''

اس بیان سے مترشح ہے کہ یہ نظم پچیس سال پہلے لکھی گئی۔ یہ نظم بھی مسدس کے فارم میں چار بند پر مشتمل ہے۔ پہلا بند اس طرح ہے:

وہ اک وجود جو کہ ذہانت کی حد پہ تھا — جس کا لطیف ذوق زمانے کی زد پہ تھا
ایسا جنوں کہ دبدبہ اہل خرد پہ تھا — جو فن کے اوجِ فکر کے طولِ بلد پہ تھا
اس کی لحد کا آج پتہ پوچھتے ہیں لوگ — اک دوسرے سے حرفِ دعا پوچھتے ہیں لوگ

آخری بند میں جناب ناز انصاری کے معیار صحافت و ادب کو نشان زد کرنے کی کوشش تحسین طلب معلوم ہوتی ہے:

وہ ایک شخص جو کہ صحافت کا نور تھا — نازِ ادب تھا بزمِ ادب کا غرور تھا
جس کی زباں میں کیف، قلم میں سرور تھا — قدرت تھی پیشکش پہ بیاں پر عبور تھا
لہجے کا گوشہ نطق کا پہلو اداس ہے — اک شخص کے نہ ہونے سے اردو اداس ہے

ظفر عدیم نے مجذوب صفت شاعر: جناب محمد الیاس نجم مظفر پوری سے متعلق نظم میں جذب و کیف کی ایک الگ دنیا ہی بسادی ہے۔ شروع کے تین بند فلسفہ اخلاق کے تناظر میں عمومی تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں بعد کے چار بند میں جناب نجم کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سوز و گداز اور مترنم آواز کی نشاندہی بھی کی گئی ہے:

نجم شاعر تھا بدلتے ہوئے موسم کی طرح — فکر کی دھوپ بھی تھا، فن کی ہری دوب بھی تھا
یوں بظاہر کوئی فنکار سا لگتا تھا مگر — وہ مدبر بھی تھا، مجنوں بھی تھا، مجذوب بھی تھا
پردۂ سوز میں آواز کے پیکر کا جمال — کرب انفاس کے تاروں میں سموئے جیسے
خنک احساس میں ڈوبا ہوا لہجے کا سکوت — چاندنی اوس بھری شاخوں پہ سوئے جیسے
نجم اک عہد سفر بھی تھا، سفر نامہ بھی — سنگِ میل اور کبھی قندیل نظر آتا تھا

اس میں سمٹی تھی زمانے کے ادب کی تاریخ — وہ سمندر تھا، مگر جھیل نظر آتا تھا
نجم کے فن میں ہے گزرے ہوئے کل کی خوشبو — نجم کی فکر نئے دور کی ضو پاشی ہے
شعر میں ٹانک دیئے نجم سحر، لیلیٰ شب — شاعری ہے کہ خیالات کی عکاسی ہے

اس نظم کے آخری بند میں رسم زمانہ پر متاسفانہ تاثرات کا اظہار ہے کہ بھولی بسری ہوئی تربت کا خیال آتا ہے تو یادوں کے چراغ جلا لئے جاتے ہیں۔ زندگی میں خراجِ تحسین پیش نہیں کرتے۔ عقیدت کا خیال مرنے کے بعد آتا ہے۔

الیاس نجم مظفر پوری خوش قسمت تھے کہ ظفر عدیم نے ان پر ایسی شاہکار نظم قلمبند کر کے انہیں اردو ادب میں حیاتِ جاودانی عطا کر دی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نجم کا ذوق نہایت ہی بالیدہ تھا اور آواز یعنی ترنم بھی ایسا تھا کہ مشاعرے کی محفل پر چھا جاتے تھے۔ لیکن ن کا مجموعہ کلام ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکا اور نہ مستقبل میں آنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ وہ رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے شاعر بھی نہیں تھے۔ البتّہ بعض تذکروں میں اکّا دُکّا کلام ملتے ہیں۔ بہر حال ظفر عدیم نے اپنے طور پر حق رفاقت ادا کر دیا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ظفر عدیم کی کسی سے مناقشت یا مخاصمت رہی اور تعلقاتؔ و مراسم اور دوستی نبھانے میں تو ان کا جواب نہیں تھا۔ ظفر انور نے اپنے مضمون مطبوعہ ''دستاویز'' بہار قانون ساز کاؤنسل ۲۰۱۷ء میں لکھا ہے کہ:

''.....تین سال پہلے میں نے ظفر عدیم صاحب سے گزارش کی کہ میں اپنے والد مرحوم جناب ڈاکٹر اظہار الحسن (نور اللہ مرقدہ) کی حیات و خدمات پر ایک کتاب شائع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس کے بیک کور کے لئے منظوم خراج عقیدت تحریر فرمادیں۔ انہوں نے میری کتاب کا مسودہ بہت غور سے پڑھا اور ایک نظم لکھ کر مجھے دے دی جو میں نے کتاب کے بیک کور پر شائع کی۔''

مرحوم اظہار الحسن صاحب چونکہ ڈاکٹر تھے اور ڈاکٹری کے پیشے کو خدمتِ خلق کے طور پر اختیار کئے ہوئے تھے چنانچہ ان کی شخصیت کے اس پہلو سے متعلق یہ بند ملاحظہ ہوں:

دست وہ دست کہ ہو جس میں شفا کی تاثیر — موجِ خوں تھم چلے، چھولے تو تلاطم جاگے
چارہ وہ چارہ کہ ہو رسمِ مسیحائی ادا — لب اظہار دعا دے تو لبِ قم جاگے
خدمت خلق نے پہنی جو عبادت کی قبا — جذبۂ دل کی حقیقت سے شناسائی ہوئی
روشن اظہارِ اطاعت سے ہوا قرب و جوار — در تسلیم پہ سجدوں کی پذیرائی ہوئی

اس نظم کے کل پانچ بند ہیں۔ظفر انور نے ایک اور نظم کا ذکر کیا ہے اور پوری نظم پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۲۰۰۳ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''چشم گل'' کے نام سے شائع ہوا۔ ظفر عدیم صاحب سے میں نے گزارش کی تھی کہ اس کتاب کے فلیپ کے لئے ایک منظوم تبصرہ عنایت فرما دیجئے۔ میں نے آج تک کسی شعری مجموعے پر کسی کا منظوم تبصرہ نہیں دیکھا ہے۔ظفر عدیم صاحب نے بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ تبصرہ لکھ کر دے دیا''

یہ منظوم تبصرہ ''ظفر انور کی شاعری کی علامات'' کے زیر عنوان اور چھ بند یعنی چوبیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

ایسا محسوس ہوا جیسے سبک رَو جھونکے — غرفہ رنگ درِ بو سے چلے آتے ہیں
گرم انفاس میں جذبات کی تاثیر لئے — لب و رخسار کے پہلو سے چلے آتے ہیں
ایسا محسوس ہوا جیسے گھنی چھاؤں تلے — دوپہر لیٹ گئی دھوپ سرہانے رکھ کر
چاندنی بن کے ہری گھاس پہ سورج چمکا — آ گئی گھر کے گھٹا، چونچ میں دانے رکھ کر

لفظوں کی بندش، فقروں اور مصرعوں کی چستی اور برجستگی، ترکیب وتشبیہ کی ندرت اور نادر المثال پیکروں کی تشکیل اور احساس و جذبہ کی نزاکت و لطافت اور شفاف اسلوب کی نفاست، ظفر عدیم کے معاصرین میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

بہر حال اس نظم کا چھٹا اور آخری بند ملاحظہ ہو:

ایسا محسوس ہوا جیسے سمٹ کر دنیا — ظفر انور کے خیالات میں روپوش ہوئی
درد، کرب، آگہی، ادراک، تسلسل، ٹھہراؤ — شاعری عکس عناصر سے ہم آغوش ہوئی

ظفر انور کا یہ مضمون اس جملے پر اختتام پذیر ہوا ہے:

''ظفر عدیم صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے قلم کی تابانی نظم اور نثر کے شاہکاروں کی شکل میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔''

یہ بالکل درست ہے کہ ظفر عدیم کی نثری تحریر ہو یا شعری تصنیف، اگر باذوق قاری کے ہاتھ لگ گئی تو وہ اس کے طلسم یا سحر سے فوراً آزاد ہونے میں ناکام رہے گا۔ ان کی ہر تحریر دامن کش دل و نگاہ ہوتی ہے۔ زبان کا اسلوب اور بیان کا پیراہن اس قدر کشش انگیز اور تاثر خیز ہوتا ہے کہ قاری اپنے گرد و پیش سے

بیگانہ ہو کر کسی اور ہی دنیا میں سانس لینے لگتا ہے۔ظفر عدیم نے یہ مہارت مطالعے اور مشق سے حاصل کی تھی۔ادب و شعر کے میدان میں ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ وہ سائنس کے طالب علم رہے تھے۔تعلیم ادھوری رہی یا پوری ہوئی تو وہ دوا کی ایک کمپنی ''اپکا'' (IPCA) سے بطور Medical Representative وابستہ ہو گئے۔کئی برسوں تک یہی مشغلہ رہا۔اردو اور ہندی کے علاوہ ان کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ فرّاٹے دار انگریزی بولتے تھے اور شروع میں انہوں نے انگریزی اخباروں کے لئے کچھ مضامین بھی لکھے تھے۔ ماہنامہ ''انجو'' کی چیف ایڈیٹری (۱۹۷۷ء) سے ظفر عدیم نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۷۸ء میں فلم نگری بمبئی کے کئی پھیرے لگائے۔۷۸ء سے ۷۹ء تک، تقریباً ایک سال پروفیسر سید احمد، مکما سٹر یونیورسٹی، کنیڈا کے ایک علمی پروجکٹ ''لغات ابجد شماری'' پر خصوصی مساعد کی حیثیت سے کام کیا۔ اظہار تشکر میں سید احمد صاحب نے ظفر عدیم کی زود فہمی اور سرعت رفتار کی تعریف کی ہے۔ظفر عدیم حد درجہ زود گو اور زود نویس تھے۔انہوں نے ۱۹۸۰ء میں جب ''روبی'' کی ملازمت اختیار کی تو ان کے کام کو دیکھتے ہوئے مدیر گرامی رحمٰن نیر نے کئی پرانے اور بڑے عملہ کی چھٹی کر دی تھی۔

ظفر عدیم نہایت ہی خوبرو، خوش وضع، خوش خلق و اخلاق اور ملنسار قسم کے انسان تھے۔اجنبیوں سے بھی اس انداز میں ملتے جلتے جیسے ان سے دیرینہ شناسائی ہو، دوستوں کی تو خیر بات ہی الگ تھی۔ میں دلی جاتا تو ان کے مکان کے قریب ہی ایک عزیز کے گھر قام کرتا اور مغرب کے بعد ان کے درِ دولت پر حاضر ہوتا۔کبھی کبھار بسمل عارفی بھی آ جاتے۔محفل یاران طریقت جم جاتی، علمی ادبی گفتگو میں وقت کے بھاگنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ اکثر گیارہ بج جاتے۔ وہ ویسے بھی دیر رات گئے بستر پر جاتے تھے۔ پہلے باضابطہ ملازمت ''تیج'' میں ہوئی تھی بعد میں ''قومی آواز'' میں بھی سب ایڈیٹر کی مستقل ملازمت سے وابستہ ہوئے۔اس دوران بھی دوسرے اخبارات و رسائل سے وابستگی رہی۔قومی آواز بند ہو گیا تو رضا کارانہ طور پر سبکدوشی ہو گئی۔لیکن اس کے بعد بھی ان کی مصروفیات حسبِ معمول رہیں۔ پھر بھی انہوں نے اپنے پرائے کو کبھی ٹالا نہیں۔ میں نے ''فراق ما سوائے غزل'' کے لئے فون کے ذریعہ ہی ان سے درخواست کی اور انہوں نے نظم بھیج دی۔ابھی تک یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے۔اس لیے ان کی یہ نظم بھی غیر مطبوعہ رہ گئی۔ میں اسے مکمل صورت میں پیش کر رہا ہوں تا کہ پکی سیاہی میں محفوظ ہو جائے۔ظفر عدیم نے اس نظم کے ایک مصرع کو ہی اس کا عنوان بنایا ہے۔''تم نے فراق معجزۂ حسن کیا کیا''۔ یہ نظم چھ مصروں کے پانچ بند پر مشتمل ہے۔ چھ مصرعی بند کو عموماً مسدس کہا جاتا لیکن یہ بند مسدس کی روایتی ہیئت میں نہیں ہے۔تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ نظم ظفر عدیم کی دوسری نظموں سے مختلف ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تکرار سے بچنے

کی شعوری کوشش بھی کرتے تھے۔ پوری نظم ملاحظہ ہو:

تم نے فراق آئینۂ حسن کیا کیا　　عکسِ شبیہ عشق پھر افزوں ہوا نہیں
فرقت کا رنگ شام سے شب گوں ہوا نہیں　　دردِ چراغ نالۂ مجنوں ہوا نہیں
دل آشنائے ذائقہ خوں ہوا نہیں　　تم نے فراق آئینۂ حسن کیا کیا
تم نے فراق پیرہن حسن کیا کیا

جسم قبائے نکہتِ ناز اب کہاں سے لاؤں　　وہ شعلہ زیرِ پردۂ ساز اب کہاں سے لاؤں
خطِ شکن، بہ شوقِ نیاز اب کہاں سے لاؤں　　تا صبح کیف ہجر دراز اب کہاں سے لاؤں
تم نے فراق نیشتر حسن کیا کیا

سوزِ جراحتِ دل بے تاب چاہئے　　بہر نشاط دیدۂ بے خواب چاہئے
ربط سکوں بہ حلقۂ گرداب چاہئے　　نجم سحر بھی چشمۂ خوناب چاہئے
تم نے فراق معجزۂ حسن کیا کیا

افسونِ جلوۂ مہ و انجم نہیں رہا　　قطرہ بقدر دُردِ تہ خم نہیں رہا
پہلی سی وہ طلب وہ تقدم نہیں رہا　　اظہارِ عشق رو بہ تکلّم نہیں رہا
تم نے فراق دل زدۂ حسن کیا کیا

وہ داغ ہائے عشق تہ آب ہے کہیں　　تقدیس جائے عشق تہ آب ہے کہیں
خاکِ شفائے عشق تہ آب ہے کہیں　　رازِ بقائے عشق تہِ آب ہے کہیں
تم نے فراق دل زدۂ حسن کیا کیا؟

مجھے یاد آتا ہے کہ وفات سے دو تین سال قبل ظفر عدیم نے ادب کی کسی بڑی زندہ شخصیت پر اس قسم کی ایک نظم کسی دوست کی فرمائش یا گزارش پر کہی تھی، وہ نظم ماہنامہ ''انشاء'' میں شائع ہوئی تھی۔ اور میری نظر سے بھی گزری تھی۔ ''انشاء'' کا وہ شمارہ میرے ذخیرۂ کتب ورسائل میں کہیں دبا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسی نظمیں اور بھی کہی ہوں گی جو آئندہ کبھی دریافت ہوسکتی ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

67/B P.C.Clony Kankarbagh
Patna- 800020 Mob: 7488549885

● ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی

مولانا منت اللہ رحمانی بحیثیت محقق ومدون

(مکاتیبِ گیلانی کے تناظر میں)

مولانا منت اللہ رحمانی شخصِ واحد کی صورت میں ایک انجمن تھے۔ وہ بیک وقت ایک ممتاز عالمِ دین، مفکر ودانشور، مجاہدِ آزادی، سیاست داں، رجال ساز اور ملت کے بے باک قائد تھے۔ اسی کے ساتھ وہ صاحبِ اسلوب ادیب اور مصنف بھی تھے۔ اپنی مصروف ترین زندگی کے باوجود ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی جملہ تصانیف کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دراصل ان کا میدان تصنیف اسلامی قانون رہا ہے اور عملی طور پر پوری زندگی اس جدوجہد میں لگے رہے کہ احکم الحاکمین کے قانون کی بالادستی رہے اور انسانی سماج بطور خاص اسلامی معاشرے میں اس پر عمل درآمد ہو۔ اس کے علاوہ انھوں نے تعلیم، صنعت وتجارت اور اخلاق وتصوف جیسے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی لیکن خالص ادبی حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو مولانا رحمانی ایک عمدہ سفرنامہ نگار اور مکتوب نگار کی شکل میں بھی ہمارے سامنے آتے ہیں تاہم اِس وقت ان کا ایک بالکل منفرد پہلو میری تحریر کا موضوع ہے۔

مذکورہ امتیازات کے ساتھ ساتھ مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ ایک محقق اور مدون کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں جس کی مثال ''مکاتیبِ گیلانی'' کی تحقیق وتدوین کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کام کے غیر معمولی ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا رحمانی جیسے عبقری اور انتہائی مصروف ترین شخص نے اس کا بیڑا اُٹھایا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اسی اقدام سے مکاتیب اور صاحبِ مکاتیب کے مقام ومرتبے کا بھی بخوبی علم ہوجاتا ہے۔

خط نگاری کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے انسان کو حروف والفاظ کا سرمایہ ہاتھ لگا۔ عربی خط نگاری کا سراغ بھی ماقبل اسلام مل جاتا ہے۔ فارسی میں بھی نامہ نویسی کی تاریخ قدیم ہے؛ بلکہ فارسی خط نگاری ہی کی راہ سے اردو خط نگاری کا چشمہ پھوٹا۔

انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود اردو خطوط کے ایک قدیم مخطوطے کے حوالے سے خواجہ احمد

فاروقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو خط نگاری کی تاریخ کا نقطۂ آغاز 1762 ہے۔(1) اسی کے ساتھ فاروقی صاحب اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ خطوط ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہیں۔ لکھتے ہیں: ''ادبی اعتبار سے یہ خطوط زیادہ اہم نہیں ہیں...ان کی قدامت البتہ اہم ہے۔''(2)

مکتوباتی ادب کے معروف نقاد پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا خط 1803 میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں: ''ان (آرزو) کی تلاش و تحقیق کی رو سے اردو کا پہلا خط 1803 میں لکھا گیا جس کی مکتوب نگار فقیرہ بیگم اور مکتوب الیہ مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت بہادر اظفری دہلوی (1859-1818) تلمیذ میر تھے۔''(3) یہاں شاید آرزو مرحوم خالص ادبی حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں اس لیے کہ اوپر خواجہ صاحب کی تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہو رہی ہے۔ اسی طرح خالص ادبی حوالے سے یا آسان نثر کی رو سے خطوط غالب نے جو انقلاب برپا کیا اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔

ابتدائی دور میں خط لکھنے کے بعد اسے منظر عام پر لانے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ دو افراد کے درمیان خط میں بہت سی راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں، لیکن خط میں جب ذات کے ساتھ اجتماع بھی داخل ہوا تو اس کو افادۂ عام کے لیے اشاعت و طباعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ پروفیسر محمد علی اثر کی حالیہ تحقیق کے مطابق خطوط کا پہلا مجموعہ ''مہر غالب'' 1862 میں منظر عام پر آیا۔ جس کے مرتب عبد الغفور سرور تھے۔(4)

اس کے بعد بیسویں صدی کے نصف اول تک یہ سلسلہ بڑے زور شور سے چلتا رہا۔ آغاز میں کسی معروف شخصیت کے متعدد خطوط کو جمع کرنے کا رواج تھا، پھر کسی ایک معروف یا غیر معروف شاعر و ادیب کے نام مشاہیر کے خطوط کو مرتب کرنے کی بنیاد پڑی اور ساتھ ہی شخص واحد کے مختلف حضرات کے نام مکتوباتی مجموعے بھی شائع ہونے لگے، اس کے بعد تو رسالوں میں بھی مشاہیر اہل علم و ادب کے قابل ذکر خطوط کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا بلکہ آج جو اخبارات و رسائل میں مراسلاتی کالم کا رواج ہے ممکن ہے اسی کے زیر اثر شروع ہوا ہو۔

خطوط کے جمع و ترتیب اور مکتوباتی ادب کو ایک سمت عطا کرنے میں لاہور کے محمد طفیل مرحوم کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ 'نقوش' کا مکاتیب نمبر دو جلدوں میں اور نقوش ہی کا خطوط نمبر تین جلدوں میں ہزاروں صفحات پر مشتمل اردو خطوط کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

رجب علی بیگ سے اقبال تک مکتوباتی ادب کا ایک سنہری دور دکھائی دیتا ہے، اس کے بعد جوں جوں جدید ذرائع و وسائل اور مواصلاتی نظام نے ترقی کی رفتار تیز کی؛ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے

لگا، دوریاں گھٹنے اور فاصلے سمٹنے لگے تو خط و کتاب کا یہ کاغذی نظام بھی ماند پڑ گیا، مگر گزشتہ بیس پچیس برسوں سے بڑی برق رفتاری کے ساتھ اس میں اضمحلال پیدا ہوا ہے اور مکتوباتی عمل کے زیر اثر قوت فکر و ادب میں جو جلا پیدا ہوتی تھی اس کا سوتا خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ اردو ادب کے لیے یہ ایک حادثے سے کم نہیں۔

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کسی خط کی اشاعت کا جواز اور اس کی بنیاد کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب سے قبل اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ آخر خط کسے کہتے ہیں؟ خط کی تعریف کئی حضرات نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے۔ کسی نے اسے نصف ملاقات تو کسی نے پوری ملاقات قرار دیا ہے۔ خطوط غالب کی روشنی میں خلیق انجم نے خط کو تقریر و تحریر کے درمیان کی چیز بتائی ہے۔(5) ڈاکٹر سید عبد اللہ کی رائے کے مطابق خط ایک مختصر صنف تحریر کا نام ہے جس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی، اس میں ذاتیت بھی ہوتی ہے اور اجتماعیت و آفاقیت بھی۔(6)

خلاصہ یہ ہے کہ دو شخصوں کا آپس میں اپنے جذبات و احساسات کو پوری بے تکلفی سے تحریری پیرایے میں پیش کرنے کا نام خط یا مکتوب ہے۔ خط کی بنیاد مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے دوستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ محض ایک شخص کے احساسات و جذبات کے اظہار کو خود نوشت یا مکتوباتی طرز کا افسانہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن خط کے زمرے میں اس کا شمار نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کے ''غبار خاطر'' کو خط قرار دینے میں اہل نقد و نظر کو تامل ہے۔

خط اگر اپنے زمانے کا عکاس اور خط نگار کے احوال و افکار کا وسیلہ ہونے کے ساتھ دل کش اسلوب و انداز کا نمونہ بھی ہو تو پھر یہی خط تاریخی، سوانحی اور ادبی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور ذاتی سے اجتماعی و آفاقی بن جاتا ہے۔ ان ہی تینوں عناصر کی وجہ سے خط کی اہمیت ہے۔ اپنی ان خصوصیات کی بنا پر خط نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اس سے انکار ممکن نہیں۔

یہ بات محقق ہے کہ غالب کو کامل غالب کا درجہ اس کے خطوط ہی نے عطا کیا۔ اسی طرح 1857 کے بہت سے گم شدہ گوشوں تک رسائی ان ہی خطوط کے ذریعے ممکن ہو پائی۔ بہت سی تحریروں سے مصنف کی ذات اور اس کے اردگرد کا علم تو ہوتا ہے لیکن بہت ہی اوجھل انداز میں؛ تاہم خطوط کے آئینے میں خط نگار کی جو شفاف تصویر دکھائی دیتی ہے وہ دوسری تحریروں میں نظر نہیں آتی۔ خط لکھتے وقت ایک خط نگار کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ اس کے یہ خطوط کبھی منظر عام پر آئیں گے۔ خط نگار کی اسی بے خبری اور بے خبری میں چھپی بے تکلفی ہی خط کا حسن اور اس کی روح ہے۔ ابتدا میں غالب صاحب بھی اپنے خطوط کی اشاعت کے زیادہ قائل نہیں تھے، بعد میں خط کی اسی اہمیت کے پیش نظر وہ اپنے خطوط کی اشاعت پر آمادہ ہو گئے

تھے۔غالب نے اپنی فارسی کتاب ''پنج آہنگ'' میں بھی مکتوب نگاری کے کچھ اصول ضبط کیے ہیں جنھیں اپنے خطوط میں پورے طور پر برت کر دکھایا ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی کی علامہ سید مناظر احسن گیلانی سے رشتہ داری بھی تھی لیکن تحقیق وتنقید کی راہ میں یہ چیز آڑے نہیں آئی۔علامہ گیلانی کی وفات (5 جون 1956) کے بعد مولانا رحمانی نے اولاً ان کے قلمی مسودات کی تحقیق وتدوین کا ارداہ کیا تھا لیکن چند دنوں کی تحقیق وتلاش کے بعد انھیں یہ محسوس ہوگیا کہ یا تو علامہ گیلانی کے تمام مسودات کتاب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں یا اگر ہیں بھی تو وہ ان کے دسترس سے باہر ہیں۔یہاں پر مولانا کا دوسرا نکتہ زیادہ معتبر ہے اس لیے کہ ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ نومبر ودسمبر 1986 میں مظفر گیلانی نے اپنے ایک مضمون میں علامہ گیلانی کی ایک ڈائری اور کئی مسودات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کچھ تحریریں عربی زبان میں ہیں جنھیں سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔یہی ڈائری بعد میں خدا بخش لائبریری کے علمی ورثے کا حصہ ہوگئی۔2013 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ ٔ علوم اسلامیہ کے لیکچرر عثمان احمد نے اپنی تحقیق وتعلیق کے ساتھ اس ڈائری کو 'بیاضِ مناظر'' کے نام سے شائع کیا۔

مولانا منت اللہ رحمانی کی رسائی جب علامہ گیلانی کے مسودات تک نہ ہوسکی تو وہ علامہ گیلانی کے علمی، تحقیقی اورادبی خطوط کی تحقیق وتدوین کی طرف متوجہ ہوئے۔بقول مولانا رحمانی علامہ مناظر احسن گیلانی کی وفات جون 1956 میں ہوئی اور خطوط کی جمع وترتیب کا کام اوائل 1957 میں شروع کر دیا گیا تھا اور دو سال کے طویل عرصے میں ایک حد تک ان کا ٹارگیٹ پورا ہو پایا، ابھی تبییض، تکمیل اور اشاعت کا مرحلہ باقی تھا تاہم محض خطوط کو مختلف ذرائع سے ڈھونڈ کر جمع کر دینا اور اسے شائع کر دینا مولانا رحمانی کے نزدیک کوئی کام نہیں تھا۔جب کہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علامہ گیلانی جیسی عظیم شخصیت کے علمی افکار اور ادبی عناصر کے اس قیمتی ذخیرے کو ضائع ہونے سے بچا لینا بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔مولانا رحمانی نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

''اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اولاً تو اُن حضرات کا تعارف کرایا جائے جن کے نام کے خطوط شائع کیے جا رہے ہیں اور پھر خطوط میں جن شخصیتوں، کتابوں اور مقامات کے نام آئے ہیں، ان پر مختصر تعارفی نوٹ لکھے جائیں۔ان مکاتیب کی ترتیب میں دراصل یہی میری محنت ہے''۔(مکاتیب گیلانی، ص:21)

یقیناً تحقیق بہت صبر آزما اور بڑی پتہ ماری کا کام ہے لیکن ہر دشوار کام کے لیے اللہ کچھ مردانِ کار بھی پیدا فرماتے رہتے ہیں اور یوں کائنات کا کام جاری رہتا ہے۔یہ سچ ہے کہ علامہ گیلانی کو علمی وارثین ان کے ہم عصر علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی طرح تو نصیب نہ ہو سکے؛ تاہم ان کی وفات کے فوراً

بعد ایک قابل، علمی وارث کا کلی نہ سہی جزوی ہی طور پر اٹھ کھڑا ہونا بھی خوش نصیبی سے کم نہیں ہے۔

علامہ گیلانی کے اس علمی کام کو مرتب و مدون کرنا مولانا منت اللہ رحمانی کا مقدر ٹھہرا اور انھوں نے اسے بحسن وخوبی انجام بھی دیا۔مولانا نے اس مجموعے کو جلد اول کا نام دیا ہے اور جلد دوم بھی وہ مرتب کر چکے تھے جس کے مکتوب الیہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا علی میاں ندوی، ڈاکٹر یوسف الدین ،مفتی ظفیر الدین مفتاحی اور خود فاضل مرتب کے نام قابلِ ذکر ہیں، (7) لیکن سوئے قسمت کہ آج تک وہ منتظرِ اشاعت ہے۔

خالص تدوینِ متن اور تدوینِ خطوط کے اصول میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں منشائے مصنف کے مطابق متن کو مدون کرنا ہوتا ہے اور ایک حد تک پہلے ہی سے اس کا وجود ہوتا ہے۔قلمی مسودات کے ایک سے زائد نسخوں اور ان نسخوں کی نقل در نقل اور طولِ زمانہ کی بنا پر اصل متن میں بہت سی خامیاں در آتی ہیں جن کی تصحیح کیے بغیر مصنف کی منشا تک رسائی ایک کارِ دشوار ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی تدوین کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے برعکس آخر الذکر میں صاحبِ مکتوب کے مختلف افراد و مقامات اور رسائل میں منتشر خطوط کو ڈھونڈ کر یکجا کرنا اصل ہے اسی کے ساتھ ساتھ نجی خطوط کا نسخہ تقریباً ایک ہی ہوتا ہے، وہی اصل اور وہی نقل۔

دونوں کے اصل متن میں تو کسی بھی مدون کو اپنی طرف سے کسی قسم کے حک و اضافے کا حق نہیں ہوتا؛ تاہم توضیح وتشریح کے حوالے سے خطوط میں بنسبت متنِ کتاب کے زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔اس لیے کہ عام طور پر خطوط کی ترتیب وتدوین کا کام یا تو صاحبِ مکتوب کا کوئی عزیز یا کوئی ہونہار شاگرد ہی انجام دیتا ہے اس لیے مکتوب نگار سے اگر کوئی لفظ وضاحت سے رہ جاتا یا کسی واقعے میں ابہام جگہ پا لیتا ہے تو اسے مرتبِ خطوط بآسانی حل کر لیتا ہے۔

اب ضرورت کے مطابق ہر مرتب کو اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایسا طریقۂ کار اختیار کرے کہ خطوط کی تفہیم آسان سے آسان تر ہو جائے۔مولانا منت اللہ رحمانی نے اولاً اشخاص، مقامات اور خطوط میں مذکور مختلف کتابوں پر تعارفی نوٹ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کے بعد موضوع وار توضیحی فہرست کے اندراج کا بھی منصوبہ بنایا۔مولانا رحمانی اپنے اسی طرزِ نگارش کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس مجموعے میں ہماری ایک محنت مکاتیب کی تفصیلی فہرست بھی ہے۔مکاتیب کی حیثیت نجی گفتگو کی ہوا کرتی ہے جس میں مرتّب اور مربوط علمی تحقیقات کی تلاش ''زیادتی'' ہے۔مولانا گیلانی کے مکاتیب بھی اس اصول سے مستثنٰی نہیں ہیں۔مولاناؒ کے تقریباً ہر مکتوب میں علمی تحقیق اور بڑے کام کی باتیں مل جایا کرتی ہیں لیکن انھیں تلاش کرنا خود ایک کام تھا، مولانا کے منتشر جواہر پاروں تک آسانی کے ساتھ

پہنچنے کے لیے کتاب کی ابتدا میں ہر مکتوب کی تفصیلی فہرست شامل کر دی گئی ہے''۔(ایضاً،ص:23-24)

یہ مجموعہ حمائل سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ چھ افراد کے نام کل 87 خطوط ہیں۔ پہلا خط یعقوب صاحب کی اہلیہ کے نام ہے جو مولانا کی سگی ممانی اور رضاعی ماں بھی تھیں، دوسرا خط مولانا حکیم یوسف حسن خان رحمانی کے نام، تیسرا خط مولانا گیلانی کے ہم درس مولانا محمد زکریا محمودی کے نام اور علامہ گیلانی کے رشتے کے دادا ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد یعقوب کے نام چار خطوط ہیں۔اس کے علاوہ 49 خطوط مولانا عبدالباری ندوی اور بقیہ 31 خطوط علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ہیں۔28 صفحات پر توضیحی فہرست، پانچ صفحات پر عرض مرتب اور پورے پچاس صفحات پر محیط مولانا عبدالباری ندوی کا تحریر کردہ مقدمہ ہے۔

عرض مرتب میں بجائے مختصر وضاحتی بیان کے خطوط کے فن اور موضوع پر ایک بھرپور مقدمہ ہونا چاہیے جو اصول تدوین کا تقاضہ تھا؛ البتہ فاضل مدون نے اپنے مقدمے میں اس سوال کا جواب بھی دینے کی کسی قدر سعی کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:''مولانا عبدالباری ندوی صاحب کی اس (مقدمہ) تحریر کے بعد مکاتیب جلد اول کے لیے میں کسی اور مقدمے کی ضرورت نہیں سمجھتا''۔(مکاتیبِ گیلانی،ص: 24) اس مقدمے میں علامہ گیلانی کا شخص زیادہ اور فن کم نظر آتا ہے تاہم خطوط پر موضوعاتی حوالے سے مولانا ندوی نے عمدہ بحث کی ہے۔مولانا منت اللہ رحمانی کی تحقیق کا اصل جوہر مجموعے کے آخری حصے یعنی سید صاحب کے نام خطوط کے حواشی میں نظر آتا ہے اس لیے کہ مولانا عبدالباری ندوی کے نام خطوط کے وضاحتی نوٹ کا بیشتر حصہ خود مولانا ندوی ہی کے قلم سے ہے جسے مرتب نے بڑی دیانتداری سے حرفِ''ع'' کے ذریعے نمایاں کر دیا ہے۔

ان تحقیقی مراحل میں مولانا رحمانی کا سب سے قابلِ ذکر کام خطوط پر ان کا تعارفی نوٹ اور وضاحتی حواشی ہیں۔کتب ومقامات کے ساتھ اشخاص پر جو نوٹ ہیں وہ انتہائی مختصر، جامع اور پُر از معلومات ہیں۔علامہ گیلانی نے اپنے ایک خط میں اپنے والد محترم کا ذکر کیا جس کا تعارفی نوٹ مولانا منت اللہ صاحب نے یوں لگایا:

''فاضل گیلانی علیہ الرحمہ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حافظ ابوالخیر صاحب تھا۔حافظ صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا اس لیے حفظ اور فارسی کی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے اور گھر کی زمینداری اور کاشتکاری کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔حافظ صاحب کے یہاں تین صاحبزادے اور متعدد صاحبزادیاں ہوئیں۔لڑکوں میں سب سے بڑے مولینا مناظر احسن صاحبِ مکاتیب ہیں۔دوسرے مولوی مکارم احسن صاحب جو اس وقت اپنے وطن گیلانی ہی میں مقیم ہیں۔تیسرے مسٹر مظہر احسن جو اس وقت حیدرآباد کے ایک کالج میں معاشیات کے استاد ہیں۔

حافظ صاحب کی ایک صاحبزادی خان بہادر مولینا عبدالعزیز صاحب مرحوم مقیم صاحب گنج سے منسوب ہوئیں۔دوسری مولوی مظاہر حسن صاحب پیشکار کٹنی کول، ضلع مونگیر سے اور تیسری راقم الحروف کے برادر بزرگ حضرت مولینا سید لطف اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے۔

حافظ ابوالخیر صاحب بڑے سادہ لوگوں میں سے تھے۔گاؤں والوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ کبوتروں سے بڑا شوق تھا۔گیلانی میں اپنی مردانہ بیٹھک کے سامنے کبوتر خانہ بنوا رکھا تھا۔اس عاجز کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ایک مرتبہ بڑے اصرار سے گیلانی لے گئے۔وہ زمانہ راقم کے بچپنے کا تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے، کبوتر دکھلاتے بھی تھے اور کھلاتے بھی۔1929 میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔رحمۃ اللہ علیہ''۔(مکاتیب گیلانی،ص:93)

مذکورہ نوٹ سے پوری جامعیت کے ساتھ کس طرح علامہ گیلانی کے والد کے حالاتِ زندگی، ان کی جوانی، تعلیم، آل اولاد اور مختلف مشاغل وغیرہ کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے۔اسی طرح ان حواشی سے علامہ گیلانی کے دادا، بھائی اور دیگر اہل خاندان سے متعلق بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔فاضل محقق نے بہت سے مقامات کے بیان میں بھی انتہائی مفید حواشی تحریر کیے ہیں۔شہر مونگیر پر جو نوٹ مولانا رحمانی نے لگایا ہے وہ نوٹ نہیں بلکہ اسے ایک مستقل مضمون سمجھنا چاہیے۔اس کے چند اقتباسات پیش ہیں:

''مونگیر ہندوستان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔اس شہر کے تین طرف دریائے گنگا بہتا ہے اور ایک طرف خوبصورت پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور آج بھی مونگیر سے بھاگل پور جانے والی ٹرینوں کو پہاڑی سرنگ سے گذرنا پڑتا ہے۔دریائے گنگا اور پہاڑی سلسلہ کے درمیان صرف چھ میل چوڑا ایک راستہ ہے جس سے مغرب کی طرف جایا جا سکتا ہے۔

مونگیر مسلم حکمرانوں کے زمانے میں ہمیشہ مرکزی مقام اور فوجی اہمیت رکھنے والا شہر رہا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں بختیار خلجی کے دورِ حکومت میں اس شہر کو بڑی مرکزیت اور فوجی اہمیت حاصل تھی۔ شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں 1590 کے بعد سپہ سالار ٹوڈرمل نے مونگیر ہی کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔''
(مکاتیب گیلانی،ص: 119-121)

آگے لکھتے ہیں:

''مونگیر کو صوبہ بہار میں''لیڈروں کا شہر''(City of the leaders) کہا جاتا ہے۔صوبہ بہار میں جو ملکی اور قومی تحریکیں چلی ہیں اس کی رہنمائی اسی ضلع کے افراد نے انجام دی ہے۔آج ہی نہیں ایک عرصے سے صوبہ بہار کی کانگریس کو اسی ضلع کے افراد کی سرپرستی حاصل ہے۔مسٹر سری کرشن سنہا جو 1923

میں بہار کونسل کے اندر سوراج پارٹی کے لیڈر تھے اور 1938 سے جنوری 62ء تک بہار کے چیف منسٹر رہے ،اسی ضلع کے رہنے والے تھے''۔(مکاتیبِ گیلانی،ص: 121)

نمونے کے طور پر یہ محض دو اقتباسات ہیں ورنہ پورا نوٹ شہر مونگیر کی تاریخی ، سیاسی ، تعلیمی ، مذہبی ، تہذیبی ، صنعتی اور جغرافیائی احوال پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں مولانا رحمانی کے تاریخ و جغرافیہ سے گہرے شغف کا بھی علم ہوتا ہے۔

ایسے ہی فاضل محقق نے کتابوں پر بھی عمدہ تعارفی نوٹ تحریر کیے ہیں۔'دعوتِ اسلام' نامی ایک کتاب کا حاشیہ یوں رقم کیا ہے:

''یہ کتاب ٹی ، ڈبلو ، آرنلڈ اسکوائر بی ، اے سابق پروفیسر محمڈن کالج علی گڑھ کی مشہور تصنیف'' دی پریچنگ آف اسلام'' (The Preaching of Islam) کا اردو ترجمہ ہے ۔عنایت اللہ صاحب علیگ نے اسے اردو قالب عنایت کیا۔ مطبع فیض عام علی گڑھ سے 1906 میں پہلی مرتبہ یہ ترجمہ 496 صفحات پر طبع ہو کر شائع ہوا۔ کتاب ایک دیباچہ، 13 ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے۔تصنیف کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں شمشیر و سنان کا کوئی حصہ نہیں ؛ بلکہ اپنی اچھائیوں کی بنا پر لوگوں کو گرویدہ و شیدا بنایا اور اسلامی حکومتوں نے دوسرے مذاہب کو پوری مذہبی آزادی دی۔ کتاب معلومات سے پُر اور قابلِ مطالعہ ہے''۔(مکاتیبِ گیلانی،ص: 307)

مولانا رحمانی کے کتابوں پر لگائے حواشی قابلِ قدر ضرور ہیں تاہم اشخاص و مقامات پر درج نوٹ انتہائی قیمتی اور مفید ہیں۔حواشی میں عام قاری کی فہم کے پیشِ نظر قرآنی آیات و احادیث اور عربی و فارسی اشعار کے اردو ترجمے کا اضافہ بھی خاصے کی چیز ہے۔

مولانا نے سادہ اور آسان زبان کا استعمال کیا ہے اور اسلوب انتہائی معروضی ہے۔کم از کم تین جگہوں پر علامہ گیلانی سے جو تسامحات واقع ہو گئے تھے انھیں بھی بڑی خوش اسلوبی سے مولانا رحمانی نے اپنے حواشی میں درست کیے۔نمونے کے طور پر ایک مثال پیش ہے:''جہاں تک معلوم ہو سکا''کتاب الہند'' مولینا عبدالحیؒ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ غالباً''نزہۃ الخواطر'' کو فاضل گیلانی نے''کتاب الہند'' لکھ دیا ہے''۔(مکاتیبِ گیلانی،ص:318)

اس تحقیق و تدوین کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس مجموعے کی ابتدا میں تفصیلی فہرست نہایت ہی کارآمد اور مفید ہے خاص طور پر ریسرچ اسکالروں کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔سید صاحب کے نام ایک مکتوب کی توضیحی فہرست مولانا رحمانی یوں مرتب کرتے ہیں:

1 سید صاحب مولانا گیلانی کی نظر میں
2 ''حیاتِ شبلی'' لکھ کر آپ نے استاد کا حق ادا کر دیا
3 ''حیاتِ شبلی'' کے مطالعے کے لیے بے چینی
4 مولانا شبلی کے متعلق اپنا انفرادی نقطۂ نظر
5 علامہ شبلی ملا تھے، ملا رہے، ملا مرے
6 راہِ قلندری کا پروانہ
7 ''ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے''

بظاہر لفظ''ترتیب'' سن کر ذہن میں کوئی خاص تأثر نہیں ابھرتا اور یہ عمل کوئی اہم کام کے بجائے ایک آسان اور معمولی سا کام محسوس ہوتا ہے بسا اوقات لوگ اس طرح کے کام کو مذاق سمجھتے ہیں لیکن یہ اظہر من الشمس ہے کہ جوہر کی سچی قدر جوہری ہی کر سکتا ہے۔ چناں چہ اس عظیم علمی و تحقیقی کام میں بھی جو جو دشواریاں پیش آسکتی تھیں آئیں۔محقق کو بعض حضرات کے حالات معلوم کرنے کے لیے بیس بیس خطوط لکھنے پڑے، کبھی کسی کو بھیجنا پڑا اور کبھی بذاتِ خود جانا پڑا۔ 1957 سے اس کام کا آغاز ہوا اور 1961 میں کہیں یہ کام مکمل ہو پایا لیکن اس زمانے میں طباعت و اشاعت کا کام بھی کچھ آسان نہ تھا۔ چھ سات جگہوں سے اشاعت کے سلسلے میں بات چیت ہوئی، کامیابی پھر بھی نہیں ملی جب کہ رائیلٹی کا بھی کوئی معاملہ نہیں تھا۔ بالآخر فاضل محقق نے طباعت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھوں سنبھالی اور مسودہ تیار ہو جانے کے باوجود پورے دس سال بعد اسے''مکاتیبِ گیلانی'' کے نام سے کتابی صورت میں دارالاشاعت مونگیر سے 1972 میں منظرِ عام پہ آنا نصیب ہوا۔

جب کسی کام میں خونِ جگر شامل ہو اور ساتھ ہی خلوص بھی ہم رکاب ہو تو اس کی اپنی ایک الگ شان ہوتی ہے اور اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔مولانا رحمانی کی اس کاوش نے'سونے پہ سہاگہ' کا کام کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''مکاتیبِ گیلانی'' پڑھتے ہوئے جانے کتنے بزرگوں سے جان پہچان ہو جاتی ہے۔حق تو یہ کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے تعارف اور حاشیوں کی وجہ سے یہ مکاتیب حد درجہ توجہ طلب بن گئے ہیں... مرتب کے نوٹس اور حاشیوں کی وجہ سے''مکاتیبِ گیلانی'' میری پسندیدہ کتابوں میں رہی، جب بھی اپنے گمنام بزرگوں سے ملنے کا جی چاہا تو یہ کتاب اٹھالی۔399 صفحات کی یہ کتاب آج بھی سرگوشیاں کرتی ہیں''۔(8)

یہ خطوط اپنے آپ میں ایک تاریخ ساز ہستی کے جادو قلم سے نکلے ہوئے ، علمی ، تعلیمی اور ادبی حیثیت کے حامل ہیں ، تس پر مولانا رحمانی جیسے ذہین فطین اور درّاک قلم نے اپنے تحقیق و تحشیے سے ان خطوط

کی اہمیت مزید دوبالا کر دی ہے۔ مولانا رحمانی کے فنِ تحقیق پر داد دیتے ہوئے معروف محقق اور ماہر غالبیات مالک رام نے لکھا:

''مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط پر مختصر اور قیمتی نوٹ مولانا رحمانی مرحوم نے لکھے ہیں۔ اس سے ان کی محنت، تحقیقی ذوق، ادبی صلاحیت اور تصنیفی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کئی شخصیتوں کا سنہ وفات مجھے اسی کتاب میں ملا۔ میرے لیے وہ حوالہ کی کتاب ہے اور میں اسے اپنی پسندیدہ کتاب میں شمار کرتا ہوں''۔(9)

مالک رام جیسے غیر مسلم اسلامی اسکالر، درجنوں کتابوں کے مصنف و محقق اور مدون کا اعتراف بھی بجائے خود ایک استناد ہے۔ شاید پہلی بار مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا اس زاویے سے مطالعہ کیا گیا ہے، مجھے امید ہے کہ مستقبل میں مولانا کی اس منفرد جہت کو مزید وسعت ملے گی۔ ان شاء اللہ۔

◂◂ ● ▸▸

حواشی:

(1) مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، خواجہ احمد فاروقی، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (2013) ص:55-54

(2) ایضاً، ص ص:57-56

(3) مکتوباتی ادب، بریلی، ناشر و مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی (2010) ص:115

(4) مکاتیب مشاہیر، مرتب: پروفیسر محمد علی اثر، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (2013) ص:28

(5) انتخاب خطوط غالب، خلیق انجم، نئی دہلی، مونومینٹل پبلشرز (2011) ص:33

(6) نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر جلد اول (1957) مرتب: محمد طفیل، ص ص:24-23

(7) سوانح حضرتِ امیر شریعت، ڈاکٹر وقار الدین لطیفی ندوی، مجلس گیارہ ستارے انڈیا، کھگڑیا (2018) ص:66

(8) حضرت امیر شریعت: نقوش و تأثرات، مرتب: مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، دہلی، فرید بک ڈپو (2004) ص:34

(9) ایضاً، ص:38-37

Village Mushkipur, PO. Jamalpur Gogri,
Distt. Khagaria 851203 - Bihar
Department of Urdu,
Ram Lakhan Singh Yadav College,
Bettiah, West Champaran

● محمد لطیف

اسلوب کی تعمیر میں اصوات کا کردار

اسلوب کی ساخت میں جس طرح صاحبِ اسلوب کی شخصیت، اس کی علمیت و ذکاوت، تجربات، احساسات، مشاہدات، اس کے عہد، وغیرہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح زبان کے بغیر اسلوب کا تصور ایک خیالِ خام ہے۔ کیونکہ دراصل اسلوب سے مراد زبان اور اس سے منسلک متنوع فنی اقدار (Figures of Speech) کا منفرد، مجتہد اور مخصوص استعمال ہے۔ لسانیات سے مراد مختلف سطحوں (جن میں ایک بنیادی اور سب سے اہم سطح صوتیات ہے) پر زبان کا سائنسی مطالعہ ہے اور اس کی شعریات میں دیگر شعبوں کے علاوہ دو اہم اور عظیم شعبے صوتیات (Phonetics) اور علم الاصوات (Phonology) (جو اس مضمون کا اصل مغز بھی ہے) ہیں اولالذکر اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی بھی زبان کے تکلمی آوازوں کی ادائیگی میں ترسیل و ابلاغ کی کیفیت، حروف کے صحیح تلفظ، اعرابی حالتوں کی صحیح پہچان اور اصوات کی اعضائے تکلم کے اعتبار سے درجہ بندی کا علم ہے، اور موخرالذکر کا تعلق کسی مخصوص زبان کی بامعنی آوازوں کا معروضی، تجزیاتی اور توضیحی مطالعے کا نام ہے جس میں منتخب شدہ زبان کی صوتی (Phonemical) پرتوں کو سٹفک بنیادوں پر وا کیا جاتا ہے۔

یہ بات بدیہی ہے کہ زبان کی رنگارنگی اور منفرد استعمال سے اسلوب کی ساخت اور شناخت قائم ہوتی ہے۔ اسلوب کی پہچان میں شخصیت کے جزوی امور کو کلی اہمیت نہیں دی جاسکتی ہے۔ نیز نہ ہی موضوعات کی تخصیص پر اسلوب کی اساسی تخصیص منظر عام پہ لائی جاسکتی ہے۔ بلکہ زبان، موضوعات، خیالات، احساسات، اور فنی اقدار کا استعمال ہی ایک اسلوب کی ساخت کو تشکیل پذیر کرتے ہیں۔ یہ ایک اوپری سطح کی بات ہے کہ زبان اپنی ساخت میں متنوع ایسی اکائیاں رکھتی ہیں جن کی لسانی ساخت مختلف ہو کر بھی معنوی مطابقت رکھتی ہے۔ مثلاً مرگ، موت، وفات، انتقال، فوت، سفرِ آخرت، ابدی نیند سونا، آفتاب زندگی غروب ہوا، دارالفانی سے کوچ کیا، جامِ شہادت نوش کیا، وغیرہ بظاہر لسانی ساخت کے اعتبار سے مذکورہ تمام الفاظ اور فقرے مختلف ہیں لیکن بہ باطن ان میں معنوی مطابقت اظہر من الشمس عیاں ہے۔ اس طرح کی بیسوں مثالیں ہر کسی زبان کی لسانی تشکیل میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انہیں کے منفرد اور مخصوص استعمال سے تحریر میں جدت، ندرت اور انوکھا پن جیسی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور ایک منفرد اسلوب بھی معرضِ وجود میں آتا

ہے۔ایک اسلوب کے اندر بیش بہا خصوصیات موجود ہوتی ہیں جن کو ادبی زبان میں اسلوبی خصائص(Stylistic Features) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہرکوئی تحریر اپنے اندر مختلف النوع اسلوبی خصائص رکھتی ہے،جن کو کھنگال کر معروضی، تجزیاتی اور توضیحی بنیادوں پر سامنے لانا اسلوبیاتی تنقید رلسانیاتی تنقید کا بنیادی مقصد بھی ہے۔زبان کے منفرد استعمال سے نہ صرف ایک ادیب یا شاعر کے اسلوب کی انفرادی پہچان قائم ہوتی ہیں بلکہ اس زبان کے دامن میں بھی وسعت آتی ہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان نئ اصطلاحات،انسلاکات اور نئے لسانی سانچوں سے مالا مال ہوتی ہے۔اس سیاق وسباق میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائے:۔

”گویا ایک شاعر یا ادیب اپنی تخلیقی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے
ایک نئ زبان خلق کرتا ہے جس میں جدت، ندرت،تنوع اورانوکھے پن کے علاوہ
نئے لسانی سانچوں،نئ لسانی تشکیلات،اور نئے تلازمات اور انسلاکات سے بھی
کام لیا جاتا ہے۔“[1]

جیسے ابتداء ہی میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ لسانیات سے مراد زبان کا مختلف سطحوں پر (صوتیات،فونیمیات،صرفیات،نحویات اور معنیات) سائنسی مطالعہ ہے۔جس میں تجزیاتی، معروضی اور توضیحی انداز کو اپنایا جاتا ہے۔انہیں عوامل کے تحت اسلوبیاتی تنقید رلسانیاتی تنقید اسلوب کا مطالعہ کرتی ہے۔زبان کا سارا دارومدار اصوات پر ہی مبنی ہوتا ہے۔اصوات کے میل جول اور ترتیب سے ہی لفظ جنم لیتا ہے اور الفاظ کے میل جول اور ترتیب سے ہی جملے بن جاتے ہیں آخر میں یہی جملے ایک عبارت کو معرضِ وجود میں لاتے ہیں۔اصوات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو زبان میں مصمتے (Consonants) اور مصوتے (Vowels) کل ملا کر اکاون ہیں جو کچھ اس طرح ہیں:۔

اکتالیس(41) مصمتے (حروفِ صحیح)۔(بشمول ہکاری آوازیں)۔

ب،پ،ت،ٹ،ج،چ،ح،خ،د،ڈ،ر،ڑ،ز،ژ،س،ش،ع،غ،ف،ق،ک،ھ،ل،م،ن،ں،بھ،
پھ،تھ،ٹھ، جھ، چھ،دھ،ڈھ،رھ،ڑھ،کھ،گھ،لھ،مھ،نھ

دس(10) مصوتے:۔

اِ،اَ،اُ،آ،وٗ،وَ،و،ي،یےَ،یے

اس طرح اردو زبان کا یہ قضیہ بھی حل ہو گیا ہے کہ اس میں حروفِ تہجی کی کل تعداد بشمول نونِ غنّہ انتالیس(39) ہیں۔جن کی فہرست حسبِ ذیل درج کی جاتی ہے:۔

انتالیس(39) حروفِ تہجی:۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ ش ص

ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن ں و ہ ھ ء ی ے

مذکورہ تمام آوازوں اور حروف کو مقامِ تلفظ اور طریقہ تلفظ کے حوالے سے مختلف زمروں (Paradigms) میں منقسم کیا جاتا ہے۔مثلاً کوز آوازیں، بندشی آوازیں،انفی آوازیں،صفیری آوازیں، پہلوئی آوازیں،لہردار آوازیں، ہکاری آوازیں وغیرہ غرض انہیں اصوات اور حروف کی ساخت پر پوری زبان کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہیں،اور انہیں کے استعمال سے اسلوب کی عمارت بھی تعمیر کی جاتی ہے۔

اصوات کی کیفیت کافی حد تک معنیاتی دنیا کو بھی متاثر کرتی ہے اگر چہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے تاہم بیشتر الفاظ کی معنوی کیفیت اصوات بھر مبنی ہوتی ہے۔جن میں کسی نہ کسی طرح کی معنوی مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔اردو زبان میں شامل صوت ”ش“ کو لیجئے یہ ایک تالوئی صفیری آواز(Fricative Sound) ہے جس کی ملفوظی کیفیت اس سے بننے والے الفاظ (جن میں یہ آواز غالب رہتی ہے) کی معنوی کیفیت پر بھی اپنے اثرات مرتسم کرتی ہے۔مثلاً:۔شکنجہ، شکن، شیر، شکوک، شق، شمشیر، شمشاد، شمر، شامت، شام، شکار، شکایت، شاتر، شکتی، شانت، شر، شرر وغیرہ جیسے الفاظ میں بہادری، ڈر اور خوف کی کیفیت کی غمازی ہوتی ہے جس کا بنیادی مرکز ارتعاش ہے جس طرح صوت ”ش“ از خود اپنے اندر ارتعاشی کیفیت بھی رکھتی ہے۔اسطرح صوت ”ہ اور ح“ اپنے اندر مدھمی کیفیت رکھتے ہیں جس کے اثرات الفاظ کی ساخت کے ساتھ ساتھ ان کی معنوی کیفیت پر بھی صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً:۔ حماقت، ہم، ہوس، حواس، حرام، حلال، ہوا، ہدایت، حامی، حسرت، ہمت، حرارت، حمد، ہار، وغیرہ۔ان الفاظ کی ادائیگی میں لہجہ مدھم رہتا ہے اور اگر ان کی معنوی دنیا پر بھی غور وخوص کیا جایے تو معنوی لہر بھی دھمی نظر آرہی ہیں۔اسطرح کی بیسوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔اسلوب کی انفرادیت کے پیچھے اصوات کی گہما گہمی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کے مانند اہمیت رکھتی ہیں، کسی بھی ادیب یا شاعر کو تحریر میں استعمال شدہ اسلوبی خصائص کے نقائص سے دامن بچانے کے لیے زبان میں شامل ہم آواز حروف کی پہچان ہونی بے حد لازمی ہے۔کیونکہ ایک زبان میں کچھ حروف ایسے ہوتے ہیں جن کی آواز ایک جیسی ہوتی ہے لیکن ساخت کے اعتبار سے یہ اپنے اندر افتراق کا پہلو رکھتے ہیں اردو زبان کی ہی مثال لیجئے اس میں جہاں ث، س، ص جیسے مشترکہ اصوات والے حروف پائے جاتے ہیں تو وہیں ز، ذ، ظ، ض والے حروف بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، یہاں ک وق اور گ وغ کی آوازوں والے حروف کو بھی خاطر میں رکھنا بہت ضروری ہے۔تحریری صورت میں اگر ان حروف کا صحیح استعمال نہیں کیا جائے گا تو الفاظ کی معنوی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے۔مثلاً:۔

آنا (آمد)	تیار (موجود، آمادہ)	حاجی (جس نے حج کیا ہو)
آنہ (سکہّ)	طیّار (اڑنے والا)	ہاجی (ہجو کرنے والا)

امر (نہ مرنے والا)	کلب (کتّا)	ہال (حرکت، جنبش)
عمر (سن وسال، عرصہ)	قلب (دل)	حال (حالت، کیفیت)
امرا (امیر کی جمع)	صبر (بمعنی برداشت)	ہلال (چاند)
عمرہ (حج کے علاوہ مکّہ معظّمہ کی حاضری)	سبر، ثبر (معنویت سے خالی)	حلال (درست، جائز)
امل (امید، خواہش)	سگار (بڑا سگریٹ)	حالا (مالگزاری کی قسط)
عمل (فعل، کار، تعمیل)	صغار (صغیر اور صغرا کی جمع)	ہالا (شراب)
امید (آرزو، آس)	سفت (دبیز، موٹا)	حائل (روکنے والا، روک)
عمید (سردار، حاکم)	صفت (خوبی، خصلت)	ہائل (ہولناک، مہیب)
ارض (زمین)	سور (خنزیر، بدذات)	حبّہ (دانہ، غلّہ)
عرض (گزارش)	صور (بگل، نفیری) ثور (پہاڑ)	ہبہٗ (عطا، بخشش، خیرات)
تول (وزن، جانچ)	سید (امام، سردار)	ذردہ (پہاڑ کی بلندی)
طول (وسعت، پھیلاؤ)	صید (شکار، وہ جانور جس کو شکار کریں)	زردہ (زرد رنگ کا گھوڑا)
ذیل (دامن، نیچے کا حصّہ)	ذل (رذالت، کمینہ)	ذمام (حق، عزّت)
زیل (چیخ کی آواز)	ظل (چھاؤں، پناہ)	زمام (باگ، نکیل)

مذکورہ مثالوں کے علاوہ اردو زبان سے ایسے بے شمار نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں۔جن کی ساخت میں ایک صوت کی تبدیلی سے معنوی دنیا اپنی ڈگر پر نہیں رہتی ہے، کہنے کی غرض وغائت یہ ہے اگر صوت اپنے اندر معنی کی کوئی کیفیت نہیں رکھتی ہے تو لفظ اور معنی کے درمیاں رشتے کو اس طور پر متاثر کرنے کا یہ عمل کیا ہے۔الغرض جب تک ایک ادیب یا شاعر کو ان اصوات کے قال وفعل کی مکمل پرکھ اور پہچان نہیں ہوگی تب تک وہ ان کے استعمال سے اپنے اسلوب میں جدت، ندرت اور جاذبیت پیدا نہیں کرسکتا ہے۔

علم الاصوات کے اعتبار سے اگرچہ یہ عمل (اصوات کا غلط استعمال) ایک سقم قرار دیا جاتا ہے تاہم کرادروں کے عین مطابق ایسی زبان کے استعمال کو اسلوبیاتی تنقید کے حوالے سے مصنف کے اسلوب کی ایک باوقار خصوصیت قرار دی جاتی ہے۔لیکن غلط کو ہمیشہ غلطی پر مستمل رکھنا سقم ہی ہے نہ کہ خاصیت۔اردو زبان میں اعراب کا مسئلہ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔تکلمی زبان میں اس کی طرف توجہ کرنی از حد ضروری ہے۔کیونکہ تحریری زبان میں تو اعراب کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے اور کیا بھی جائے تو اکثر بیشتر مصوتوں پر ہی کیا جاتا ہے مصمتوں پر اتنا نہیں جو صوتیات کی رو سے ضروری بھی ہے۔اس تناظر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:۔

''یہ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں زیادہ تر اعراب کی ضرورت مصوتوں
کو ظاہر کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔مثلاً زیر، زبر، پیش کا فرق یا یائے معروف اور

یائے مجہول کا فرق جس سے لفظوں کے معنی بدل جاتے ہے۔''[۲]

اعراب کے غلط استعمال سے نہ تو صرف تلفظ بلکہ معنوی کیفیت بھی دگرگوں ہوتی ہے، اس سلسلے میں لاتعداد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن بخوف طوالت ذیل میں چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

اَندر (درمیان)، اِندر (چالاکی) اُم (ماں، والدہ) بُرت (ہندوؤں کا روزہ)
اَم (دودھ پیتے بچے کی زبان میں پانی کا اشارہ) بِرت (وجہ معاش، آمدنی)
پتّا (حوصلہ، ہمت)، پَتّا (برگ، پات) تِکّا (گوشت کا ٹکڑا)، ٹِکّا (بان، ناؤک)
چَنک (کمر کی چک)، چِنک (سوزش، جلن) مُوت (پیشاب، نطفہ)، مَوت (مرگ، اجل)

مذکورہ مثالوں سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے، کہ زبان کی ساخت میں اعراب کے صحیح استعمال کا عمل دخل فقید المثل اہمیت رکھتا ہے۔اور ایک تحریر میں اعراب کا کامیاب استعمال لسانی تشکیل کا وصف کے ساتھ ساتھ معزّز اسلوبی خصائص میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔اور اصوات کے سائنسی مطالعہ یعنی صوتیات کو لسانیات کی سبھی سطحوں میں سب سے بڑی اور اہم حیثیت حاصل ہے۔اس حوالے سے پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

''زبانوں کے توضیحی مطالعے میں صوتیات سے بڑی مدد ملی، اور دراصل
اسی نے لسانیات کو صحیح معنی میں سائنسی نقطۂ نظر دیا۔لسانیات کے کسی شعبے کو اگر قطعی
سائنس کا درجہ دیا جاسکتا ہے تو وہ صوتیات (Phonetics) ہی ہے۔''[۳]

ایک ادبی فن پارے میں کسی مخصوص اور منفرد آواز کا اگر تواتر کے ساتھ استعمال کیا جائے گا اور متن کے تجمعی صورت حال پر یہ آواز غالبیت (Dominant) کا روپ اختیار کرتی ہے تو اس کو مصنف کے اسلوب کی ایک اہم اور منفرد خصوصیت قرار دیا جائے گا۔یہ بات بھی بدیہی ہے کہ کسی بھی فن پارے بالخصوص شعری ادب پارے میں کسی آواز یا کئی آوازوں کی تکرار، تاثر اور غالبیت ہوتی ضرور ہے۔ان آوازوں کو جن الفاظ میں زیادہ استعمال کیا گیا ہوگا ان کے مجموعی انجذاب وانحراف کے بعد جو لفظ یا فقرہ معرضِ وجود میں آتا ہے اسے فن پارے کا تجمعی لفظ (Summative Word or Phrase) کا نام دیا جاتا ہے۔اصوات کے مخصوص استعمال سے اسلوب میں جو خصائص پیدا ہوتے ہیں بہ الفاظِ دیگر ان خصائص کا دارومدار اصوات کے انفرادی استعمال پر ہوتا ہے، ان میں صوتی آہنگ، ترنم، نغمگی رغنائیت، قافیہ بندی (Rhyming)، تجنیس صوتی (Alliteration)، موسیقیت (Musicality)، زیر وبم (Tonality)، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں غرض آوازیں اپنے اندر انسان کے عناصر خمسہ کو جگمگانے کی جادوئی اثرات رکھتیں ہیں۔ان میں جذبات احساسات اور خیالات کو متاثر کرنے کی قوت بھی ہوتی ہیں۔بقولِ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ:۔

''آوازیں محض آوازیں ہی نہیں ہوتیں، یا مختلف مخارج سے مختلف اندازِ

ادائیگی کے ساتھ پھپھڑوں سے محض ہوا کے خارج ہونے کا نام آواز نہیں۔ بلکہ آواز ایک جذبہ ہوتی ہے، ایک احساس ہوتا اور ایک کیفیت ہوتی ہے جس کی سرحدیں مابعداللسانی (Metalinguistic) حدود سے بھی جا کر ملتی ہیں۔'' [۴]

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فن پارے میں حزن ویاس، درد وکرب، رنج والم، سرور وسرود، موسیقیت و زیر وبم، جذبہ واحساس، تاثر وتڑپ وغیرہ پیدا کرنے میں اصوات کا کردار ہمیشہ فقیدالمثل اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ آوازیں نہ صرف متن کے مجموعی تصوّر کو قابل داد وتحسین بناتی ہے، بلکہ اعضاءِ سمعی سے گزر کر دل کی تاروں کو چھو لیتی ہے، اور ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں عیش وعشرت اور سکونِ قلب کے لمحات میسّر ہوتے ہیں۔ یہ مناظر فطرت کو سروں اور نغموں میں عیاں کر دیتے ہیں۔ شعری فن پاروں کی تو کیا بات بلکہ ان کے مخصوص استعمال سے نثری فن پاروں میں شاعرانہ کیفیت، دلکشی، جاذبیت اور لذّت پیدا ہوتی ہے۔ علم الاصوات (Phonology) ان اصوات کا سائنسی مطالعہ پیش کرتا ہے اور ان کے استعمال کے کئی پہلوؤں سے ہمیں واقفیت عطا کرتا ہے، نیز ان کے باطن میں پنہاں تاثرات سے بھی روشناس کراتا ہے۔ بعد ازاں جب ایک شاعر یا ادیب ان تاویلات کی روشنی میں ان اصوات کا استعمال کرتا ہے تو ان کے اسلوب کی دلکشی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی لسانیات کے دائرۂ کار کے لحاظ سے اسلوب کی ساخت اور علم الاصوات کے درمیان چولی دامن کا رشتہ ازل سے ہی برقرار رہا ہے۔ اور یہ رشتہ تب تک زندہ وجاوید رہے گا جب تک اس دنیا میں زبان کا وجود قائم ودائم رہے گا۔

◀◀ ● ▶▶

۱۔ اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء ص ۶۷۔
۲۔ اردو زبان ولسانیات، رام پور رضا لائبریری، یوپی، ۲۰۰۶ء ص ۱۵۹۔
۳۔ زبان، اسلوب اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۵۵۔
۴۔ اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء ص ۳۶۰۔

Ph.D Scholar,(URDU)
University of Kashmir,Srinagar
Email:.mohdlateef738@gmail.com
Contact:9797130907/9596545041

● ڈاکٹر منصور خوشتر

اکیسویں صدی میں اردو غزل

موجودہ غزلیہ شاعری کے منظر نامہ میں غزل کے سخت گیر قدیم ناقدینِ کے اقوال کا محاکمہ کیا جائے تو ہم کس نتیجے پر پہنچیں گے؟ کیا ہمیں یہ یقین آئے گا کہ اسی غزلیہ صنف کے بارے میں انھوں نے سخت ترین نظریات قائم کئے تھے؟ غزل کی مخالفت میں غزل کی ہیئت کا زیادہ عمل دخل تھا یا موضوع ومواد کا، اس سے قطع نظر آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاصر غزل میں دونوں سطحوں میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزلیہ شاعری میں حالی نے جس بو کی وجہ سے اپنی ناک پر انگلی رکھ لی یا پھر دوسروں کو رکھنے کی تلقین کی، شاید وہ معاصر غزلیہ منظر نامہ کو دیکھتے تو اپنے قول سے رجوع کرتے۔ گل وبلبل کے لیے بدنام اردو شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری میں موضوعاتی سطح پر اس قدر تبدیلی آئی کہ اس کی اپنی مروجہ تعریف بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے جس صنف کی مروجہ تعریف مشکوک بن جائے تو اس کے سخت گیر ناقدوں کے ذہن ودماغ میں بھی تبدیلی پیدا ہونا لازمی ہوتی ہے۔ اگر میں حلول کا قائل ہوتا تو اتنا ضرور سوچتا کہ کاش حالی، عظمت اللہ خان، کلیم الدین احمد، جوش ملیح آبادی وغیرہ کی روح متعدد بڑے ناقدوں میں دوبارہ حلول کر جائے اور وہ موجودہ غزلیہ منظر نامے کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں ساتھ ہی کوئی نیا فیصلہ سنائے یا پھر نئی غزل کے لئے پر وہ بھی جھومنے لگیں۔ کیوں کہ نہ صرف غزل کی ہیئت واسلوب میں نمایاں فرق آیا ہے بلکہ اس کی تکنیک موضوعات میں بھی بہت حد تک تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور موجودہ کرشماتی صدی میں بہت کچھ بدلنے کے امکانات بھی نظر آتے ہیں۔

یہاں ہم یہ سوال بھی رکھنا چاہتے ہیں کہ مخالف فضا میں غزلیہ روایت کے استحکام کی اصل وجہ کیا ہے؟ کیا غزلیہ سروں میں اتنی نغمگی ہے کہ مخالفت کی تمام تر 'نغمگی' اس میں غائب ہو جاتی ہے؟ کیا غزل میں اس قدر لچک ہے کہ بدلتے زمانے میں اپنے لیے راہ ہموار کرتی جاتی ہے؟ یا پھر سوال یہ ہے کہ غزل اپنی مخالفت کی وجہ سے ردعمل کے طور پر اپنی حالت مستحکم کرنے کے لیے نت نئے طریقوں کو اپناتی رہتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جب مخالفت کے عمل میں شدت آتی ہے تو ردعمل کا رویہ بھی سخت تر ہو جاتا ہے۔ ان سوالوں کے تناظر میں ہمارا ماننا یہ ہے کہ غزل میں نہ صرف عشق وشوریدگی ہی سما سکتی ہے، بلکہ زمانے کی نیرنگیاں بھی

اس میں بآسانی جگہ پاتی ہیں۔اسی لیے آج کی بھاگم دوڑ والی زندگی میں بھی غزلیہ اشعار ہمارے ذہن ودماغ کو گدگدا دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے لوگوں میں نرگسیت اور عشقیہ جذبات کچھ زیادہ ہوں، اس لیے عشقیہ ئے ان کے لیے محبوب ہو، لیکن بدلتے زمانے میں بھی عیش وطرب کے وہ طریقہ کار ہیں، جن کا وجود قدیم زمانے میں نہیں تھا، اس لیے اِن کا اُس عہد میں تذکرہ نہیں ہوتا تھا، مگر آج ہو رہا ہے، اس لیے موضوعاتی سطح پر ان کا ذکر بھی آج کے سامعین اور قارئین کے لیے باعث مسرت ہے۔اسی طرح آج کے بدلتے موضوعات بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہیں، چنانچہ ان موضوعات کی شمولیت سے بھی لوگوں کا ذہن ودماغ جھنجھنا اٹھتا ہے۔گویا غزلیہ شاعری کے فروغ میں موضوعاتی تنوعات کا بھی عمل دخل ہے۔اس تنوع کے ساتھ ساتھ ہوسکتا ہے کہ غزل نے اپنی مخالفت کے عمل کی وجہ سے ردعمل کے رویہ کو اپنا لیا ہو کہ تم مخالفت کرتے جاؤ، میں اپنے بھیس میں اس طرح سامنے آؤں گی کہ سب کچھ بدلا بدلا نظر آئے۔غزلیہ بدلتے منظرنامے پر نظر ڈالیں تو ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ نے اپنا چولا اس طرح بدلا کہ وہ بدلا ہوا نظر نہیں آتا ہے، مگر تغیراتی ثبات کے تناظر میں غزل بھی بدل رہی ہے۔

یہ تو ظاہری بات ہے کہ فارم وہیئت کے مقابلے میں موضوعاتی سطح پر تبدیلی جلد آتی ہے۔ادب کی سماجیات، فارم وہیئت سے کہیں زیادہ موضوعات سے سروکار رکھتی ہے، جو کہ قرین قیاس بھی ہے۔اس لیے ہمارے مضمون نگاروں نے جہاں ہیئت وفارم کی تبدیلی کا مسئلہ زیر بحث لایا ہے، وہیں موضوعاتی سطح پر بھی غزل کو ٹٹولنے کی کوشش ہے۔انھوں نے موضوعاتی سطح پر جہاں موجودہ عہد کی بے کلی کو دکھایا ہے وہیں ہجرت کے کرب کو بھی سامنے رکھا ہے اور آج کل مجری ادب کا بھی چرچا ہے۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت، کرب سے ہی تشکیل پاتی ہے۔اسلامی تاریخ کی ہجرت کی بات کریں یا پھر پاکستان کے قیام کی، یا پھر عالمی سطح پر تارکین وطن کے موضوع کو لیں، ہر جگہ کرب ہے، لیکن اردو کی نئی بستیوں میں آباد لوگوں کا اپنے ملک کے تئیں جذبات کا اظہار کم از کم میرے نقطۂ نظر سے مجری ادب نہیں ہے۔یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اپنے ملک سے دور ہونے کا درد سب کو ہوتا ہے، جو کہ فطری بھی ہے، مگر اس میں کرب کی شدت نہیں ہے، اس لیے ہجرت کی سی آنچ نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ فقط ملک سے دوری ہی ہجرت کا نام ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو مزدور ایک ریاست سے دوسری ریاست کا سفر کرتے ہیں، دوسری ریاست میں دبے کچلے انداز میں کام کرتے ہیں، وہ ان سے بڑے مہاجر ہیں، جو دوسرے ممالک میں بڑے عیش کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست کی تبدیلی اور ملک کی تبدیلی میں بڑا فرق ہے۔تہذیب وثقافت کے لحاظ سے تبدیلی آتی ہے ہمیں تسلیم، مگر اتنا تو کہنے دیجئے کہ شمالی اور جنوبی ہند میں ہی تہذیب وثقافت کے تناظر

میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہم کسی دوسرے ملک میں آ گئے ہیں۔مگر اس تبدیلی کو ہم رنگا رنگی کہہ دیتے ہیں۔اس لیے ایک ریاست سے دوسری ریاست جانے والے کو مہاجر نہیں کہتے ہیں۔اس کے درد کو مجری ادب کے زمرہ میں نہیں رکھتے، نہیں رکھنا بھی چاہیے۔مگر ہم ایک طرف گلوبلائزیشن کا ورد کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنے ملک سے باہر ہوتے ہی مجری رویوں سے اپنی الگ شناخت بنانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ہمیں تضاد سا لگتا ہے۔ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک ریاست سے دوسری ریاست جانے والا مزدور جتنی تکلیفیں جھیلتا ہے، اتنی تکلیف شاید بیرون ممالک جانے والے نہیں اٹھاتے ہوں گے۔اس لیے ہم تو ایسے ادب کو مجری ادب نہیں کہنا چاہتے ہیں، مجری کے علاوہ چاہے کچھ اور نام دے دیں۔

غزل اردو کی سب سے مشہور صنف سخن ہے۔ہر چند کہ ہر دور میں اس کی شدید مخالفت بھی ہوئی۔کبھی اسے ''نیم وحشی صنف سخن'' کہا گیا تو کبھی ''بے تکلف اس کی گردن اڑا دینے' کی بات کی گئی۔اس کے باوجود غزل کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوسکی۔ بلکہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔اردو غزل نے کوچۂ محبوب سے کوچۂ دار ورسن تک کا سفر طے کیا۔زمانے اور وقت کی گردشوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی۔اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے بعد اردو غزل کو کئی قسم کے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔عالمی سطح پر رونما ہونے والے حادثات وواقعات اور سیاسی وسماجی تبدیلیوں نے لوگوں کے رویے اور افکار و نظریات تک تبدیل کر دیئے۔اس صدی کی خاص بات یہ بھی ہے غزل ''ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت'' کے محدود حصار سے باہر نکل چکی ہے۔نئی صدی کا شاعر خود کو کسی دائرے یا کسی 'ازم' کا پابند رکھنا نہیں چاہتا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے ایک مضمون میں ہر علاقے اور ہر خطے یہاں تک کہ سرحد پار جہاں جہاں اردو کے معتبر شعرا موجود ہیں، ان کے اشعار کا حوالہ اور مثالیں دے کر نئی صدی کی اردو غزل کی خصوصیات بیان کرنے کی کارآمد کوشش کی ہے۔انھوں نے ہماری توجہ اس جانب بھی مبذول کی ہے کہ نئی صدی کے شعرا نے کس طرح روایت سے ہٹ کر منفرد لہجے، مزاج، زبان و بیان، اسلوب اور الفاظ کی سطح پر انفرادیت حاصل کی۔ پروفیسر موصوف نے مثالوں کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ معاصر غزل کس طرح روایتی غزل کے ہم مزاج نہیں ہے۔لیکن انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ نئی صدی فکری سطح پر غزل میں کیا تبدیلیاں لائی اس کا اندازہ قبل از وقت ہوگا کیونکہ یہ عمل جاری ہے اور اس کا نتیجہ فوراً نظر نہیں آسکتا۔آج کی غزلیہ شاعری میں دلچسپی کے لامتناہی عناصر پائے جاتے ہیں۔اس میں کرب بیانیوں کا ذکر آیا ہے، اس میں کہیں احتجاج ہے تو کہیں فقر ودرویشی کا ذکر بھی۔اس میں محبت بھی ہے اور شکایت وخفگی بھی۔اس میں خاموشی وسرگوشی بھی ہے اور گفتگو بھی، اس میں تہذیب وثقافت کی جلوہ گری بھی ہے اور فتنہ سامانیوں کا ذکر بھی، اس میں معاشی مسائل بھی پنپ

آئے ہیں اور موجودہ دور کی برق رفتار ترقی کا بیان بھی۔اس میں تجربے بھی ہوئے اور نئے خیالات کا اظہار بھی ہوا وغیرہ۔یہ سب خصوصیتیں شارب ردولوی کے مضمون میں وا ہوئیں ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''نئی غزل یا ہم عصر غزل کو میں نے جدیدیت اور ترقی پسندی کی تقسیم سے باہر رکھنے کی کوشش کی ہے۔میرے خیال میں ہم عصر غزل کو اس طرح کے خانوں میں تقسیم کرنا زیادتی ہوگی۔نئی غزل کی ایک بڑی خوبی اس کا کسی چیز کو دیکھنے اور بیان کرنے کا زاویہ ہے۔ وہ زبان کے اعتبار سے بھی روائتی غزل سے مختلف ہے اور تشبیہات واستعارات میں بھی۔وہ آج کی زندگی سے اپنے استعارے اور تشبیہیں اخذ کرتی ہے۔اس نے جدیدیت اور ترقی پسندی کی حد بندیوں کو ایک طرح سے توڑ دیا ہے اور صرف زندگی، تجربے اور محسوسات کو سامنے رکھا ہے۔اس کی زبان، اظہار اور اسلوب بھی اپنا ہے اور اس کے زندگی کے تجربات بھی اپنے ہی ہیں۔اس میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی شناخت ترقی پسندی سے ہوتی ہے اور وہ لوگ بھی جو اپنی جدیدیت سے پہچانے جاتے ہیں لیکن اگر ان اشعار پر سے شعراء کے نام ہٹا دیئے جائیں تو ان کے نظریاتی رویّوں کے تحت انھیں تلاش کرنا یقیناً مشکل ہوگا۔''

نئی غزل کے موضوعاتی تنوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے مزید وہ لکھتے ہیں:

''آج کی غزل بلند آہنگی کی غزل ہے نہ دھیمے لہجے کی غزل، اس میں احتجاج بھی ہے اور فقر و درویشی بھی۔محبت بھی ہے، شکایت و خفگی بھی، گفتگو بھی ہے اور خاموشی و سرگوشی بھی اور کبھی کبھی ایسی خاموشی جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتی ہے۔خاص طور پر یہ خاموشی عشقیہ شاعری میں نظر آتی ہے۔یوں تو غزل میں ہمیشہ ہی عشقیہ شاعری کا حصہ نصف سے زیادہ رہا ہے لیکن یہ عشق یا تو فرشتوں جیسا رہا یا پھر 'چوما چاٹی' کی سطح پر اتر آیا۔وہ محبت جسے واقعی محبت سے تعبیر کیا جائے ملتی ضرور ہے لیکن کم۔ہم عصر غزل نے اسے زندگی کے ایک پہلو کی طرح برتا اور اسے اسی سپردگی کے ساتھ پیش کیا۔''

اردو غزل میں موضوعات کے تجربے تو ہر زمانے میں ہوئے لیکن غزل کی ہیئت کے ساتھ کسی نے بھی چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہیں کی۔اس ضمن میں سب سے پہلے مظہر امام نے 'آزاد غزل' کا تجربہ کیا لیکن یہ صنف زیادہ مقبول نہ ہوسکی۔اکیسویں صدی میں بھی غزل کی ہیئت کے ساتھ تجربے کیے جا رہے ہیں۔اس سلسلہ میں پروفیسر شارب ردولوی کا خیال ہے:

''اردو غزل میں زبان و بیان، اظہار اور موضوع کے تجربے تو شروع سے ہوتے رہے ہیں لیکن

ہیئت کے تجربے نہیں ہوئے تھے۔اس لیے کہ غزل کی ہیئت کچھ ایسی ہے کہ وہ تجربے کو قبول ہی نہیں کرتی۔ ذرا اس کے بدلنے کی کوشش کی اور وہ احاطۂ غزل سے باہر ہوئی اور اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے لیکن جدید شعراء نے اس کی روایتی ہیئت کو توڑ کر آزاد غزل کہنے کی کوشش کی''۔مظہر امام کا کہنا ہے کہ 1945 میں انہوں نے سب سے پہلے آزاد غزل کا تجربہ کیا جب ان کی عمر پندرہ سال تھی لیکن ساتویں اور آٹھویں دہائی میں اس کا شعوری طور پر تجربہ کیا گیا اور بہت سے شعراء نے آزاد غزلیں لکھنے کی کوشش کی اور اسی زمانے میں آزاد غزل کا ایک انتخاب 'قید شکن' کے نام سے علیم صبا نویدی نے شائع کیا۔خود ان کی آزاد غزلوں کا مجموعہ 'ردِ کفر' شائع ہو چکا ہے جو آزاد غزل کا پہلا مجموعہ ہے۔بشیر بدر نے اپنی نثری شاعری کو 'نثری غزل' کا نام دیا۔جن لوگوں نے آزاد غزل کے اس تجربے میں حصہ لیا ان میں مناظر عاشق ہرگانوی، ظفر اقبال، زرینہ ثانی، یوسف جمال، سلیم شہزاد، حرمت الاکرام، کرشن موہن، آزاد گلاٹھی، ظہیر غازی پوری، بدیع الزماں خاور، خالد رحیم وغیرہ شامل ہیں۔کچھ عرصہ غزل کا یہ تجربہ رسائل میں ادبی بحث کا موضوع رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ ذکر کم ہوتا گیا۔

آزاد غزل چھوٹے بڑے مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے جسے پہلی بار پڑھتے ہوئے مستزاد کی طرف ذہن جاتا ہے۔آزاد غزل میں ردیف و قافیے کی پابندی کے ساتھ مصرعے کے ارکان کو کم یا زیادہ کر دیا جاتا ہے۔آزاد غزل کہنے والوں نے 'ترسیل و ابلاغ میں آسانی اور کشادگی' کو اس کا جواز قرار دیا ہے۔مثال کے طور پر یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

کتنے جلتے ہوئے جسموں کا دھواں ہے باہر
ایک ہنگامہ جواں ہے باہر
حاصل مدعا نہیں کوئی
سوچتا ہوں تو اس جزیرے میں آج میرے سوا کوئی نہیں

ردِ کفر۔علیم صبا نویدی

اس سے اندازہ ہوگا کہ غزل کے اس سفر میں معاصر غزل میں موضوعات اور ہیئت دونوں طرح کے تجربے کیے گئے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ڈاکٹر فیروز بخت کے ترتیب دیے گئے سوالنامے کو بنیاد بنا کر اپنا مضمون ''اکیسویں صدی میں اردو غزل کا منظر نامہ'' رقم کیا ہے۔اس میں اردو غزل کی خوبیوں سے متعلق سوالات کیے گئے تھے۔انہوں نے اس پورے سوالنامے کو اپنے مضمون میں ثبت کر دیا ہے تا کہ قارئین بھی اس سوالنامے کی خوبیوں سے واقف ہو جائیں۔فیروز بخت نے اردو غزل کی خوبیوں سے متعلق واقعی میں

بے حد محنت کر کے سوالنامے کو مرتب کیا تھا۔اس سے سوالنامہ مرتب کرنے والے کی ذہنیت، چستی اور ہوشیاری کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔لیکن اس سے بھی بڑھ کر جس خوبی سے موصوف نے سوالنامے کی بنیاد پر مضمون کو تیار کیا ہے وہ پڑھنے اور یاد رکھنے لائق ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے بقول ''یہ سوالنامہ اور جواب نامہ اکیسویں صدی کا غزل نامہ ہے'' اس جملے نے سوالنامے کو موجودہ صدی سے جوڑ دیا ہے۔انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ جدید ذہن خصوصیت سے اکیسویں صدی کا ذہن تخلیقی عمل سے گزرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔نتائج اخذ کرنے میں بھی فکری بلندی نظر آتی ہے اور زندگی کے رشتہ کی گہرائی تک اس کی رسائی مستحکم ہے۔ایسے میں غزل تخلیق کرتے وقت دورس تجربے اور غزل کی لوازمات سے گذرنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے بے حد خوبصورت انداز میں لکھا ہے کہ کئی جگہ نئے پن کی اختصاصی خصوصیت پیدا ہونے سے پرانے شاعر بھی جدید نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے کئی اشعار حوالے کے طور پر بھی پیش کیے ہیں جن سے ان کے خیالات کو تقویت ملتی ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اکیسویں صدی میں اردو غزل کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے کے لیے فیروز بخت کے سوالنامے کے تناظر میں اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ان سوالات کا جواب ذہن میں آتے ہی نئی صدی میں اردو غزل کا منظر نامہ واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔انہوں نے جن سوالات کے معنی خیز نتائج نکالے ہیں۔اس کے چند سوالات نمونے کے طور پر ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ کیا اچھے اشعار کے لیے اصلیت لازمی ہے؟ ہاں O نہیں

۲۔ کیا اچھے اشعار کے لیے قافیہ ضروری نہیں ہے کیوں کہ اس کے بغیر بھی اچھے کلام کا تصور ممکن ہے؟ ہاں نہیں O

۳۔ کیا اچھے کلام کی سادگی کے لیے خیال کا پیچیدہ اور ناہموار ہونا لازم ہے؟ ہاں نہیں O

۴۔ کیا اچھے اشعار میں فصاحت و بلاغت ضروری ہے؟ ہاں O نہیں

۵۔ کیا اچھے اشعار کے لیے ایسی اصلیت ضروری ہے جس سے خیال پر اثر پڑے؟ ہاں O نہیں

۶۔ کیا اچھے اشعار کی یہ خوبی ہے کہ ان میں لفظوں کی ترتیب زبان اور بیان کے اصولوں کے مطابق ہو؟ ہاں O نہیں

۷۔ کیا اچھے اشعار کے لیے اصلیت سے تجاوز کرنا اور ہر مفہوم کو نئے اسلوب سے ادا کرنا ضروری ہے؟ ہاں O نہیں

۸۔ کیا اچھے اشعار کی یہ خوبی ہے کہ ان میں تخیل جس قدر اعلیٰ درجے کا ہوگا اسی قدر وہ اشعار مؤثر

ہوں گے؟ ہاں نہیں O

۹۔ کیا اچھے اشعار میں خیال کی باریکی اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور شعر کا حسن اور نکھر جاتا ہے جب سیدھی بات کو پیچیدہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے؟ ہاں نہیں O

۱۰۔ کیا اچھے اشعار میں ایسی اصلیت ضروری ہے جو مقتضائے کلام کے موافق ہوتا کہ اس کے اجزاء میں تصادم نہ ہو؟ ہاں O /نہیں

مناظر عاشق ہرگانوی نے اس طرح کے چالیس سوالات قائم کیے ہیں جنہیں سامنے رکھ کر جب ہم اکیسویں صدی میں اردو غزل کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا خوب صورت روپ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اکیسویں صدی کے شعرا نے اردو غزل کو نئے پہلوؤں سے دیکھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نئے پہلو کون سے ہیں؟ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون 'نئی صدی میں اردو غزل کے امکانات' میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ان تمام صورتوں اور بدحالیوں سے سماج کی جو اوپر اوپر کی فضا بن رہی ہے اس نے سماجی ماحول، اصول وضوابط، نظم وضبط سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا ہے۔خیر پر شر، حق پر باطل کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔دھوکہ فریب آج کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔سچائی، سادگی، ایمانداری، حقیقت پسندی سب دم توڑ رہی ہیں۔اس پر اقتصادی بدحالی، اخلاقی پامالی، مستقبل کی فکرمندی، قتل وغارت گری، علاحدگی پسندی اور دیگر سماجی اتھل پتھل مثلاً صنعتی ریل پیل، نئی طبقاتی کشمکش یا طبقوں کی نئی تقسیم اُس پر پورے سماج کا کمرشلائزیشن، ان سب نے مل کر نئے سماج کی جو تصویر ابھاری ہے وہ بڑی ہی عجیب وغریب ہے جس میں بس یہ تو صاف ہے کہ صحت منداور صالح قدروں کا زوال ہو چکا ہے۔انسانیت مر رہی ہے۔انسانی قدروں کی پامالی اس دَور کا مقدر بن چکی ہے باقی سب دھندلا دھندلا ہے۔اس واضح اور غیر واضح سماج کی ملی جلی تصویروں کا عکس اردو کی نئی غزل میں صاف جھلکتا دکھائی دے گا۔''

اپنے اسی مضمون میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے ایک اہم سوال بھی اٹھایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

> '' آخر کیا وجہ ہے کہ جدید دور میں اپنے کرب والم، دردوستم، تنہائی وویرانی، لاچاری وبے بسی، حبس اور گھٹن کے باوجود نئی غزل میں بے چینی وبے کیفی کی لہر تو ہے لیکن احتجاج کی گونج نہیں۔ احتجاج تو درکنار مزاحمت بھی نہیں ہے اور حد یہ ہے کہ غزل کے

اسلوب میں وہ روایتی شکوہ وشکایت بھی نہیں ہے جس سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ معشوق کے جوروستم کی شکایت، شیخ وناصح کی شکایت، آسمان کی چشم بد اور فریبِ تقدیر کی شکایت۔ نئی غزل سے روایتی شکایت کا چلن کیا روٹھا مزاحمت کا لہجہ ہی روٹھ گیا۔ جب کہ ایسے حالات میں نئی غزل کا مزاحمتی لہجہ اس کا ایک اہم لہجہ ہونا چاہئے۔''

معروف ناقد حقانی القاسمی بھی اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ نئی غزل میں موضوعات کا تنوع ہے لیکن وہ اردو غزل کے مستقبل کے تعلق سے بہت زیادہ پرامید نظر نہیں آتے۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''کیا غزل زندہ رہے گی یا موت ہی اس کا وادی ومسکن ہوگی؟ غزل کا اکیسویں صدی میں کیا مستقبل ہے؟ یہ اور بہت سارے مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں یہ احساس ہے کہ آج کی غزل جن نت نئے تجربات سے گزر رہی ہے، اس سے یقیناً شاعری کو فائدہ ہوا ہے۔ مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ دور غزل کے زوال کا ہے۔ اب غزل میں جو نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں، اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ غزل کی موجودہ صنفی، تشکیلی ہیئت سے لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ وہ کچھ اور وسعت چاہتے ہیں۔ بیان کی یہی وسعت ہر ایک صنف کو ارتقاء سے آشنا کرتی ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ اس وسعت کے باوجود بھی غزل میں بہت کچھ سمٹا ہوا اور سکڑا ہوا ہے۔''

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی حقیقت ہے جسے دیکھنے کے بعد حقانی القاسمی جیسا دیدہ ور ناقد یہ کہنے پر مجبور ہے کہ 'یہ دور غزل کے زوال کا دور ہے؟

معاصر غزلیہ شاعری سے حقانی القاسمی کو کسی حد تک تشنگی محسوس ہو رہی ہے وہ معاصر غزلیہ شاعری سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ کیونکہ وہ غزل میں اور وسعت کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غزل میں تجربوں کی اپنی اہمیت ہے، موضوع کے تنوع کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ اگر چہ وہ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ نئے نئے تجربوں سے غزل کو فائدہ ہو رہا ہے تو وہیں دوسری طرف لکھتے ہیں کہ غزل کی موجودہ صنفی، تشکیلی ہیئت سے لوگ مطمئن نہیں ہے۔ جہاں وضاحت مطلوب تھی۔ بہر حال ایسا قطعی نہیں کہا جاسکتا کہ حقانی القاسمی معاصر غزلیہ شاعری سے بدظن ہوئے ہیں انہیں کچھ شعرا میں غزل کا روشن مستقبل نظر آتا ہے جن کی شاعری سے متعلق انھوں نے مذکورہ مضمون میں خامہ فرسائی کی ہے۔

ہندوستان اور آس پاس کے ملکوں میں اکیسویں صدی کے تناظر میں غزلوں کے انداز بیان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اسے ہم رسائل، جرائد اور اخبارات کے ذریعہ پڑھ لیتے ہیں۔ سید احمد قادری نے امریکہ میں اس طرح کی تبدیلیوں کو پیش کیا ہے جو ایک معلوماتی مضمون ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''امریکہ میں اکیسویں صدی کی اردو غزل کا جائزہ لیتے ہوئے بے اختیار سب سے پہلا نام شمالی امریکہ کے بابائے اردو، مامون ایمن کا نام سامنے آتا ہے۔ مامون ایمن نے اب تک نیویارک کے صاحب دیوان شعرا کا تین جلدوں میں جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ ''نیویارک میں اردو غزل'' نام کی کتاب بھی ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ مامون ایمن کو بیک وقت اردو، پنجابی اور انگریزی زبان میں دسترس حاصل ہے۔ لیکن اردو شاعری، خاص طور پر اردو غزل اور رباعیوں میں انھیں جو شہرت اور مقبولیت ملی ہے، وہ یقینی طور پر اس کے حقدار ہیں۔ ادب کے تئیں ان کا جوش وجنون قابل دید اور قابل تقلید ہے۔ اکیسویں صدی میں داخل ہونے والی ان کی اردو غزل کے سلسلے میں اگر بات کی جائے تو 16 ستمبر 2014ء کو کہی جانے والی مامون ایمن کی ایک غزل بے اختیار سامنے آتی ہے، جس میں دس اشعار ہیں اور ہر شعر میں اکیسویں صدی کی دھمک اور اس کی بازگشت بہت واضح طور پر سنائی دیتی ہیں۔ نئے زمانے میں جس طرح ہر شخص خود کو خدا بنا کر پیش کر رہا ہے، اس پر مامون ایمن نے اپنے درد وکرب کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے، ان کا شعر ہے:

جسے دیکھو، وہی اب اک خدا ہے　　زمانہ کا چلن اب دوسرا ہے

پروفیسر رئیس انور نے بہار میں اردو غزل (اکیسویں صدی میں) کے حوالے سے کے عہد حاضر کے تمام معتبر غزل گو شعرا کی شاعری کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق حالیہ برسوں میں بہار کے جن فنکاروں نے شعری کائنات پر نہ صرف اپنی ایک چھاپ چھوڑی ہے بلکہ موجودہ نسل کی بہترین نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان میں عالم خورشید، خورشید اکبر، جمال اویسی، نعمان شوق، خالد عبادی، عطا عابدی، راشد طراز، شمیم قاسمی، عین تابش، شاداب رضی وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا انداز بیان بھی نہایت پر لطف اور پر کشش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۲۱ ویں صدی کی پہلی دہائی سے بہار کے غزل گوؤں نے زمین پر قدم جماتے ہوئے نئے فکری افق اور اسلوبیاتی شفق کی جستجو کی ہے۔ حوصلہ شکن حالات سے ٹوٹ بکھر کر کبھی مایوسی کا دامن تھاما ہے اور کبھی خود کو سمیٹ کر اپنی اپنی سمتیں متعین کی ہیں اور خوشگوار ہواؤں میں اڑان بھری ہے۔ ان کے ہاں نہ صرف مقامی، وطنی اور عالمی معاملات ومسائل کی دھمک ہے بلکہ ان کا خوشگوار ادراک بھی ہے اور بعض

جگہ معاملہ فہمی میں ذاتی مشاہدہ اور تجربہ بھی شامل ہے۔ خیال، جذبہ اور احساس کی تازگی اور ندرت ہے۔ اظہار کی ستھری سجیلی، تازہ کار اور پرکار زبان اور برجستہ اسلوب ہے۔ تیور میں تیکھاپن آیا ہے۔ استعاروں، اشاروں اور کنایوں کا خوبصورت امتزاج ہوا ہے۔ ایک صاف ستھرا، رواں اور قابل فہم لفظیاتی اور معنیاتی نظام سامنے آیا ہے، خیال اور الفاظ کی مناسب اور متوازن ہم آہنگی سے تشکیل پانے والا شگفتہ اور ہمہ جہت غزلیہ لہجہ بنا ہے۔''

جیسا کہ ہم سب واقف ہیں یہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ سائنس نے جو انکشافات کیے ہیں اس سے انسان کی ذہنی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سائنس نے انسان اور اس کی بقا کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے۔ انسان اس کے انکشافات کو دیکھ کر حیران و پریشان ہوجاتا ہے کہ بھلا اس صدی میں سائنس کے حیرت انگیز تجربوں کی بدولت انسان کی زندگی نے کیسی کروٹ لی ہے۔ انھوں نے مذکورہ مضمون میں جہاں انسان کی معاشی ترقی کا ذکر کیا ہے تو وہیں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جس کو ایک انسان اس بھاگ دوڑ زندگی میں فراموش کر بیٹھا ہے۔ وہ ہے سائنس کے نقصانات۔ انھوں نے ماحولیاتی آلودگی پر اپنے مضمون میں خاص طور پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ معاصر اردو غزل میں ماحولیاتی آلودگی کو شعرا نے اپنی شاعری کا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ ان کے مطابق اب غزل صرف حسن و عشق کا نام نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ مختلف جہتوں پر باتیں ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''اکیسویں صدی میں لگاتار سائنس کے میدان میں آئے دن نئی نئی ایجادات اور انکشافات عمل میں آرہے ہیں۔ دورِ حاضر میں ٹکنالوجی ضرورتِ زندگی میں داخل ہوچکی ہے اور زندگی لمحہ لمحہ نئی فکر سے دوچار ہورہی ہے اور روزانہ سائنس کے میدان میں نئے نئے انکشافات آشکار ہورہے ہیں تو دورِ حاضر کو عہدِ سائنس کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا۔ یہ دنیا جو بہت وسیع تصور کی جاتی تھی آج سائنسی ترقیات کے سبب سکڑ کر مٹھی میں آگئی ہے۔ اس جدید دور میں سماج کی ترقی کا دار و مدار سائنس کی ترقی پر مبنی ہے۔ اس بات میں دو رائے نہیں کہ سائنس کی ترقی معاشرے کی ترقی ہے۔ اور یہی انسان کو بلندی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ انسان کے ذہن میں ایک شعور بیدار کرتی ہے جس سے تخلیقات و انکشافات کے لئے راہ ہموار ہوتی ہے۔ سائنس کم و بیش زندگی کے ہر شعبے میں کارفرمائی انجام دیتی ہے، حتیٰ

کہ ادب بھی اس سے اچھوتا نہیں، اکثر و بیشتر جب ہم اردو غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو جگہ جگہ ہم کو سائنس پر مبنی اشعار سے آشنائی ہوتی ہے۔''

''اکیسویں صدی کی اردو غزلوں میں انسانی اقدار'' بھی بہت دلچسپ موضوع رہا ہے۔ بیشتر شعرا نے اس موضوع کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ جس کو پڑھ کر یقیناً قارئین کو بہت معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احمد کفیل کا مضمون معلوماتی ہے۔ اس مضمون میں بتایا گیا ہے اور سوالات قائم کیے گئے ہیں کہ کیسے موجودہ دور میں اخلاق گراوٹ پیدا ہوتی ہے اور کیسے ان کا تدارک ممکن ہے۔ کون سے اسباب ہیں جو انسان کی اخلاقی اور سماجی گراوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ انھوں نے مختلف معاصر شاعروں کے اشعار کو چن چن کر اپنے مضمون میں کوٹ کیا ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ شعرا نے جہاں رنگا رنگ شاعری کی ہے وہیں انسانی اقدار کو بھی فراموش نہیں کیا۔ اس کی ترجمانی بڑے خوب انداز میں شاعری میں خصوصاً معاصر غزل گو شاعری میں ہوئی ہے۔ اشعار کا حوالہ دے انھوں نے مضمون کو قوت بخشی ہے وہ لکھتے ہیں:

''آدمی اگرچہ واقعات سے سبق لیتا ہے لیکن ان کے رویّے سے سماج میں انسانی قدروں کی بحالی ہوتی ہے۔ یہیں پر قدرتی وسائل اور ہماری ضرورتیں باہم الجھتی ہیں۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں شارٹ کٹ کی راہ ہمیں زیادہ بھانے لگی ہے۔ ہم پانچ سو سال پہلے کے لگائے ہوئے پیڑوں کا پھل کھا تو رہے ہیں لیکن آنے والی نسلوں کی ہمیں پروا نہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شارٹ کٹ سے ہم جلدی آگے بڑھ سکتے ہیں ایسے لوگوں کی نظر منزل پر کم، راستے کی آسانیوں پر زیادہ ہوتی ہے۔ قدرتی وسائل میں معدنیات، برقی توانائی، تیل، آبی وسائل اور کھانے پینے کی تمام چیزوں کا مصرف صرف اپنی ذات تک نہیں، آنے والی نسلوں اور انسانی قدروں کو سامنے رکھتے ہوئے کرنا چاہیے اور یہ کام سڑک پر جھاڑو لگانے والے سے لے کر برگر میں کباب لپیٹ کر کھانے والے طبقوں کو بھی سوچنا ہوگا۔ اقبال کے لفظوں میں یہی احترامِ آدمیت ہے اور اس سے باخبر ہونا ہماری اخلاقی ذمے داری ہے۔''

معاصر ناقدین نے جہاں اکیسویں صدی کے شعرا کی شاعری کے مختلف جہات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے وہیں اردو شاعرات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ شارق عدیل نے اکیسویں صدی کی غزل گو شاعرات پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اردو غزل گوئی میں اردو شاعرات کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ قارئین کو غزل گو شاعرات سے روبرو کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غزل آبروئے سخن ہے یہ سچ ہے۔ مگر یہ غزل کی کرامت کے منکر ملے
ہیں یہ کہتے ہوئے ہم کو اکثر غزل عارض وگل کی ہے اک مبصّر مگر یہ ہماری نگاہوں
سے دیکھیں غزل زندگی کی بدلتی ہوئی صورتوں کو اس انداز سے اب عیاں کر رہی ہے
کہ اس میں دلوں کی زبان بولتی ہے۔ اس میں ہر شے مکمل ابھرتی ہوئی سی نظر آ رہی
ہے تو دل چاہتا ہے کہ بس چند نسوانی لبھوں کی پرنور شمعوں سے باور کرائیں۔ غزل
اب مسلسل انوکھے مفاہیم کی داستان لکھ رہی ہے ۔

مری خوشبوؤں میں بسا ہوا وہ ضرور لوٹ کے آئے گا — مرے اختیار میں کچھ نہیں مگر اعتبار تو دیکھئے
سطوت زہرا سطوت

یہ کڑا سفر گذرتا، یہ شبِ دراز کٹتی — کوئی حرفِ وعدہ ہوتا، کہ سحر کو شام کرتے
ساجدہ زیدی

زمانے بھر کی محبت سے کیا غرض مجھ کو — بس ایک شخص کی نفرت سے ڈر سا لگتا ہے
ڈاکٹر پنہاں

ڈاکٹر احسان عالم نے سرزمین دربھنگہ کے چند شاعروں کا تذکرہ اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ دربھنگہ زمانۂ قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے ملک گیر اور غیر ملکی پیمانے پر اپنا، اپنے ملک، اپنے صوبہ اور اپنے ضلع کا نام روشن کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے چند نامور شعراء پروفیسر منصور عمر، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر منصور خوشتر، رہبر چندن پٹوی، اظہر نیر، انور آفاقی، ڈاکٹر نور محمد عاجز، زماں بردا ہوی، حیدر وارثی وغیرہ کا مختصرہ تذکرہ اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔

غلام نبی کمار کا ایک وقیع مقالہ دبستان دہلی کے معاصر غزل گو شعراء کے تذکرہ پر مبنی ہے۔ انھوں نے صرف انہی شعراء کو دبستان دہلی کا معتبر شاعر قرار دیا ہے جو ایک تو اس صدی میں شاعری کر رہے ہیں دوسری بڑی بات یہ ہے کہ وہ تمام شعرا پچھلے کئی برسوں سے اس میدان میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ اس میں کچھ بزرگ شعراء کا ذکر آیا ہے اور کچھ ایسے شاعروں کا جو پچھلی پانچ چھ دہائیوں سے غزل گوئی کے میدان میں نبرد آزما ہوئے ہیں۔ ان کے اس مقالہ میں دبستان دہلی کے اکیسویں صدی کے جن شعراء کا ذکر آیا ہے۔ ان کا اعتراف بھی اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ اب سرزمین دہلی کی مٹی ان کا وطن بن گئی ہے جہاں وہ پچھلی کئی دہائیوں سے رہ رہے ہیں اور جنہیں دبستان دہلی کے ہونے کی سند افتخار بھی حاصل ہوئی ہے۔ جس

کا ذکر وقتاً فوقتاً مختلف تقریبات میں کیا گیا ہے، شعرا کے کلام میں بھی اس کا نمونہ دیکھا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ دبستان دہلی کے غزل گو شعرا کے حوالے جو کتابیں بازار میں دستیاب ہیں وہ ان کی ایمانداری کی ضمانت پیش کرتی ہیں۔ ان کے مضمون میں صرف نامی گرامی شعراء کا ہی ذکر آیا ہے۔ جس میں کچھ وفات پا چکے ہیں اور باقی بقید حیات ہیں۔ جنھوں نے اپنی غزل گوئی سے سرزمین دہلی کو زرخیز کیا ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس فہرست میں کچھ اور نام بھی جڑ سکتے ہیں۔ اس لیے آئندہ اس فہرست میں کچھ اور ناموں کے جڑنے کی قوی امید کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات وقت اور کتاب کی ضخامت بھی پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی ہے۔ غلام نبی کمار نے جس عرق ریزی سے مضمون تحریر کیا ہے وہ واقعی میں قابل ستائش ہے۔ انھوں نے مدلل انداز میں اکیسویں صدی کے غزل گو شعراء کی شاعری پر لکھا ہے اور مضمون میں کہیں بھی ان کا تسلسل ٹوٹتا نظر نہیں آتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے انھوں نے اپنے مضمون میں شعراء کو بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے تناظر میں خوبیاں دبستان دہلی کے شعراء کی ان کی شاعری میں اجاگر ہوئی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ:

''دہلی کو ابتدا سے ہی ہندوستان کا مرکزی شہر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ ملک کی دیگر ریاستوں اور شہروں کے مقابلے میں دہلی کو ہمیشہ اوّلیت حاصل رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اب دہلی ایک بین الاقوامی شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس شہر کا سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی تحریکوں کا سرچشمہ ہونا اور مختلف النوع سرگرمیوں کی سطح پر اس کا اُبھرنا۔ مغل حکمراں ہو یا آج کا سیاست داں، شاعر ہو یا تاجر، سماج کا ذی اثر شخص ہو یا صاحبِ ثروت آدمی، مورّخ ہو یا سیّاح، روزگار کا متلاشی ایک عام انسان ہو یا تعمیری کام کرنے والا معمار، استاد ہو یا طالب علم، ماڈل ہو یا ایکٹر، صحافی ہو یا سماجی کارکن، مہاجر ہو یا کوئی اور غرض ہر ایک کی دہلی تک رسائی رہی ہے۔''

مزید انہوں نے دبستانِ دہلی کے غزل گو شعرا کے انتخاب میں کیا طریقہ اختیار کیا ہے اس کی وضاحت اس طرح ہو جاتی ہے:

''آزادی کے بعد دہلی میں اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کا بہترین اور سنہرا دور اکیسویں صدی عیسوی کا ہے جو کہ اس مقالے کا بنیادی موضوع بھی ہے۔ ابھی اکیسویں صدی میں صرف سولہ سال گزر چکے ہیں ان دو دہائیوں میں غزل لکھنے والے کچھ شعرا ایسے ہیں جو حیات ہیں اور آزادی کے بعد آج بھی مسلسل اپنی غزلیات سے

دہلی کی ادبی سرزمین کوشاداب وسیراب کررہے ہیں۔بعض شعرا ایسے ہیں جو بیسویں صدی کی آخری دوتین دہائیوں میں شعری افق پر نمودار ہوئے ہیں اور تاحال اپنی شعری تخلیقات سے قارئین کونوازرہے ہیں۔کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو بیسویں صدی کے بالکل اواخر میں منظرعام پر آئے اور چند ایسے ہیں جن کی شعری تخلیقات صرف اکیسویں صدی میں ہی منظر پر آنے لگیں۔بہرحال دہلی میں صنفِ غزل میں طبع آزمائی کرنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے جنھوں نے نہ صرف غزل بلکہ اردو کی دیگر اصناف میں بھی قلم چلایا لیکن غزل میں ان سب شعرا کو اختصاصی اہمیت حاصل ہے۔اپنی اسی انفرادیت کے سبب ان سب کو نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ عالمی پیمانے پر شہرت حاصل ہوئی ہے۔اس مقالے میں دہلی کے جن اہم اور معروف ومقبول شعرا کی غزل گوئی پر گفتگو کی جائے گی ان میں زبیر رضوی،مخمور سعیدی،مظفر حنفی،عتیق اللہ،صادق،شجاع خاور،شاہد ماہلی،شہپر رسول،خالد محمود،ابوالفیض عزم سہریاوی،فرحت احساس،شہباز ندیم ضیائی،رؤف رضا،کوثر مظہری،احمد محفوظ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔''

نئی نسل کی ادیبہ صدف اقبال نے بھی اپنے ایک مضمون ''اکیسویں صدی میں غزل کا نیا لہجہ''اکیسویں صدی کے شاعری کے خدوخال کو ابھارنے کی کوشش کیے۔وہ لکھتی ہیں::

''غزل طویل مسافت طے کر کے اکیسویں صدی میں نئے چہرے کے ساتھ داخل ہوئی گوکہ غزل کی روایت اور کلاسک کی گہرائی اور گیرائی سے اسکا رشتہ استوار رہا اگرچہ غزل کے مخالفین نے اس کوختم کرنے یا اس کے حُسن کو گہنانے کے لیے کئی بار تابڑتوڑ حملے کئے لیکن اس کے حمایتیوں کی طرف سے اس کے دفاع کا سلسلہ بھی جاری رہا ۔غزل اردو شاعری کی مقبول صنف ہے اور بہت سارے ناقدین جن مین کلیم الدین احمد نمایاں ہیں کی مخالفت کے باوجود یہ شاعری کے مرکز میں ہے۔ چنانچہ جہاں آزاد غزل کے نام پر بحروزن اور قافیہ وردیف سے بے پرواغزلیں کہہ کر غزل سے بےزاری کا اظہار کیا جاتا رہا وہیں تازہ خون غزل کی آبیاری کو پہنچتا رہا۔ اکیسویں صدی میں بھی غزل کہنے والے کئی ایسے شاعر سامنے آئے جن کے تروتازہ اور توانا لہجے نے اپنی پہچان بنائی۔انہی شعراء میں سے چند کے بارے میں، میں نے اس مضمون میں اظہارِ خیال کرنا ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ بس یہی لوگ ہیں جن کا توانا لہجہ غزل کی آبیاری کررہا ہے بلکہ بہت سے شعراء پاک وہند اور وہاں وہاں تک جہاں جہاں اردو کی حکمرانی ہے اور جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے غزل کہہ رہے ہیں۔''

اس طرح اکیسویں صدی میں اردو غزل کے حوالے سے بعض دیگر ادیبوں،ناقدوں اور دانشوروں

نے مقالات ومضامین اور مختلف رسائل وجرائد میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔مقالہ نگاروں نے سولہ سترہ سال کی مدت میں اردو غزل کی مسافت کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ان مقالات ومضامین کے مطالعہ سے جہاں ایک طرف اکیسویں صدی میں اردو غزل کے خدوخال ابھر کر سامنے آتے ہیں،وہیں مضمون نگاروں کی جانب سے کئی اہم سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں،یہ سوالات بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔مثال کے طور پر نئی صدی کی اردو غزل میں احتجاج کا لہجہ اتنا اثر دار کیوں نہیں ہے جتنا آزادی کے وقت یا ترقی پسند تحریک کے زمانہ میں تھا؟ غزل گو شعراء سیاسی موضوعات کو اپنی غزلوں میں جگہ دینے سے کیوں کتراتے ہیں؟ کیا اردو غزل اپنی اصل شناخت (عشق وعاشقی) کھوتی جارہی ہے؟ وغیرہ۔اس طرح کے سوالات نئے مباحث کو جنم دیتے ہیں۔ساتھ ہی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اردو غزل کا مستقبل کیسا ہوگا؟

یہ سچ ہے کہ ادب کی قرأت وتفہیم کا رجحان پہلے کی بہ نسبت کم ہوا ہے اس کے باوجود آج بھی اردو کے شائقین کافی تعداد میں دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔یہ بھی سچ ہے کہ شائقین اردو کی اکثریت اردو کی تمام اصناف میں غزل کو سب سے زیادہ پسند کرتی ہے۔ایسے میں نئی نسل کو زبان وادب سے قریب لانے میں اردو غزل اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوگی۔

اکیسویں صدی کے شعرا وشاعرات کے موضوعات واسالیب، ہیئت وتکنیک اور زبان وبیان کے حوالے سے پیش کردہ اجمالی تفصیل اور مختلف ناقدین وادبا کے خیالات سے یہ نتیجہ اخذ وجذب کیا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی کائنات شاعری اپنے باطن میں مختلف النوع موضوعات ومضامین اور مسائل کو جذب کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔عہدرواں کی شاعری گل وبلبل اور لب ورخسار کی قید سے آزاد کھلی فضا میں سانس لے رہی ہے اور نت نئے رنگ وآہنگ اور نئی سمت ورفتار سے آشنا کررہی ہے۔

اکیسویں صدی کے شعرا وشاعرات نے اپنی غزلوں میں قومی وبین الاقوامی مسائل، سائنسی ایجادات،صنعتی انقلاب،اقدار کی شکست وریخت،انسانی خوف ودہشت،سماجی ناہمواریاں،انتشار واضطراب، مختلف حوادثات وواقعات،معاشرتی،معاشی،سماجی اور سیاسی اتھل پتھل،مذہبی انتہا پسندی،شدت پسندی، غربت،افلاس،بھوک،بےروزگاری،جنگ،ہجرت،نقل مکانی،احباب کے دھوکے،اپنوں کی بےگانگی،انسانی رشتوں کی پامالی،عیاری ومکاری،اپنی زمین،اپنی تہذیب اور اپنی پہچان سے دور،ہجرت کے کرب،زمانے کی ناقدری،سیاسی استبداد اور ظلم وجبر کے خلاف احتجاج،فرقہ وارانہ فسادات،دہشت گردی،سرحدی تناؤ،اقتصادی بدحالی،اخلاقی پامالی،قتل وغارت گری،علاحدگی پسندی،نئی طبقاتی کشمکش،صحت منداور صالح قدروں کا زوال، حال کی بدحالی، بےچینی،افراتفری،تاریک مستقبل کا شدید احساس،ماضی کی یادیں،عشق وعاشقی کی نئی دنیا،

ماحولیات، شہری پھیلاؤ، بادی میں اضافہ، نئی نئی ٹکنالوجی، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، موبائل، انٹرنیٹ اور تشخص وجود اور شناخت کا مسئلہ وغیرہ ان گنت موضوعات ومضامین اور مسائل کو اپنی شاعری میں تخلیقی جدت وندرت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے جو متعلقہ عہد کے شعراو شاعرات کے روشن مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے شعراء نے مذکورہ موضوعات ومسائل کی پیش کش اور اس کے اظہار کے لیے نت نئے انداز وطریقے، منفرد اسلوب اور تخلیقی زبان کو اپنانے کی سکت بھر کوشش کی ہے۔ انہیں اپنی بات کو استعارات وعلامات کے پردے میں کہنے کا ہنر آتا ہے۔ نئی تراکیب ولفظیات کا استعمال فنکارانہ ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ متعلقہ عہد کے شعراو شاعرات سے اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کو نئی سمت ورفتار متعین کرنے میں اہم رول ادا کریں گے۔ اسی طرح غزل کے گیسو سنوارنے وسجانے میں ہمہ تن مصروف رہیں گے۔

◂◂ ● ▸▸

Editor Darbhanga times
Purani Munsifi Darbhanga
09234772764, 09472059441

نام کتاب: چہرہ چہرہ کہانیاں صنف: خاکہ نما مضامین مصنف: احمد زین الدین سن اشاعت: ۲۰۱۳ء صفحات: ۲۲۴ قیمت: ۳۵۰/روپے رابطہ: Zain Publications, A-8 Nadeem Corner, Block-N,North Nazimabad, Karachi (Pakistan)	م کتاب: بَین صنف: افسانہ مصنف: صدیق عالم سن اشاعت: ۲۰۱۲ء صفحات: ۲۲۶ قیمت: ۲۵۰روپے رابطہ: Flat-5D/5F, Block - Wave، Merlin River View 15-Kavi Tiratha Sarani Kolkata-700023 Mob:+91-9830489953

نام کتاب: عنکبوت مصنف: شموئل احمد صفحات: ۱۶۴	صنف: افسانہ سن اشاعت: ۲۰۱۰ء قیمت: ۲۰۰/روپے

رابطہ:
301-Grand Apartment,New Patliputra Colony, Patna-310008
Mob:+91-9835299303

● ڈاکٹر صالحہ صدیقی

اودھ کی شادیاں.....رسموں اور گیتوں کا مطالعہ

ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف مذاہب، مختلف زبانیں، مختلف تہذیب ومعاشرت، مختلف انواع واقسام کی جنگلی حیات اور مختلف نسلی معاشرے کے لوگ صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ شمال میں بھوٹان چین اور نیپال اور مغرب میں پاکستان ہے اس کے علاوہ بھارت کے جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں بحر ہند واقع ہے۔ نیز یہ ملک سری لنکا، مالدیپ کے قریب ترین ملک ہے۔ اس کے علاوہ بھارت کے نکوبار اور انڈامان جذیرے تھائی لینڈ اور انڈونیشیا سے سمندری حدود بھی جڑے ہیں۔ ہندوستان مشرق میں بنگلہ دیش اور میانمار، شمال میں بھوٹان، اس ملک پر مختلف ملکوں کے حملے ہوتے رہے، دوسرے ملکوں کے لوگ یہاں آکر بسے، یہاں کے لوگ دوسری جگہوں پر گئے جس سے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے۔ ان کے گہرے اثرات ہندستانی تہذیب ومعاشرت پر بھی پڑے۔ ہندستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھی کہلاتا ہے۔ ہندستان کے ایک ارب پینتیس کروڑ سے زائد باشندے ایک سو سے زائد زبانیں بولتے ہیں۔ بھارت ایک وفاقی جمہوریہ ہے جو پارلیمانی نظام کے تحت 29 ریاستوں اور 7 وفاعی علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اتنے بڑے ملک اور اتنی طرح کی تہذیب ومعاشرت کا ایک دوسرے پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ ہندستان میں مختلف مذاہب کے رسم ورواج کا اثر بھی ایک دوسرے پر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی بھی سماج میں کردار کے حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل ایک تہذیبی ماحول کے پس منظر میں ہی اثر انداز ہوتے ہے۔ اس ماحول میں کنبہ، پڑوس، کمیونیٹی، پیشہ، نسلی جماعت، سماجی، معاشی طبقہ اور قومی تہذیب شامل ہوتے ہیں۔ جس سے اکثر سماجی، تہذیبی ماحول کا افراد پر بہت دباؤ پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تیزی سے بدلتے وقت کے ساتھ بے روزگاری کا دور اور بدلتی ٹکنالوجی میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیاں اور یہ سب مل کر دباؤ ڈالنے والے حالات کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ حیاتیاتی اور نفسیاتی اسباب مل کر جو اثرات پیدا کرتے ہے اس کا انحصار اس سماجی دباؤ کی شدت پر بھی پڑتا ہے۔ ان تمام چیزوں کی براہ راست اثر سماج میں رہنے والے افراد پر پڑتا ہے۔ جب ان تہذیبوں کا آپسی ٹکراؤ اور اس سے کشمکش وتصادم رونما

ہوتا ہے تو اس سے کسی تہذیب کا عروج وزوال بھی متعین ہوتا ہے اور موجودہ دور میں مختلف طرح کی تہذیبیں ہیں جن کا آپس میں تصادم بھی قائم ہیں۔ جبکہ دوسری طرف معاشرہ جو کہ باضابطہ اور بے ضابطہ سماجی تنظیموں میں مذہبی ادارے، کنبے، پیشے، سے تعلق رکھنے والی جماعتیں، ہم عمر افراد کی جماعتیں اور احباب کا حلقہ شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض دیگر جماعتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جماعت کی اپنی تہذیبی اکائی ہوتی ہے۔ ایک جماعت کے اراکین میں ادراک وشعور کے ڈھنگ، بعض عقیدے اور مقاصد مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان مشترکہ عوامل سے ہی تہذیب کی تشکیل ہوتی ہے۔ تہذیب میں وہ سماجی رشتے بھی شامل ہوتے ہیں جو ان افراد کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ فرد جس تہذیبی جماعت کا رُکن ہوتا ہے وہ جماعت اس پر کچھ ذمہ داریاں عاید کرتی ہیں۔ اسے ایک مخصوص سماجی حیثیت اور اہم رول دیتی ہے اور ناپسندیدہ طرز عمل کے لیے سزائیں دے کر اس کی تربیت کرتی ہیں۔ اگر تہذیبی ڈھانچے میں کسی قسم کی تبدیلی بھی رونما ہوتی ہے تو فرد اس کی ذمہ داری اور حیثیت میں بھی تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہیں۔ کیونکہ معاشرہ فرد سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ کچھ سماجی معیاروں اور اصولوں کی پابندی کرے گا۔ ان معیاروں کا اظہار بے ضابطہ طور پر عام طرز زندگی اور رسم ورواج کے ذریعے یا پھر باضابطہ طور پر ناقد کردہ قوانین کی صورت میں ہوتا ہے۔ سماجی ڈھانچے میں کسی فرد کی حیثیت جنس، عمر یا اس کے عزیزوں کی پوزیشن کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے یا پھر وہ خود اپنی ذاتی کاوشوں اور کامرانیوں کے ذریعے اُسے حاصل کرتا ہے۔ ایسے معاشروں یا تہذیبوں میں جنھیں ''بند سماج'' کہا جاتا ہے۔ فرد کے لیے اس بات کے مواقع بہت کم ہوتے ہے کہ وہ ذاتی کوششوں کے ذریعے کوئی مرتبہ حاصل کریں۔ ہندوستان میں ذات پات کا نظام اور قرون وسطیٰ میں یورپ کا جاگیردارانہ نظام بند سماج کی مثالیں ہیں۔ کھلے سماج میں فرد کو اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے تعلیم یا پیشے کے میدان میں ذاتی کوششوں کے مواقع خاصی تعداد میں حاصل ہوتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو نسبتاً کھلا معاشرہ قرار دیا جاتا ہے۔ ذہنی صحت کے اعتبار سے ان دونوں معاشروں کی اپنی اپنی خوبیاں اور خامیاں بھی ہے۔ بند سماج میں استقلال ہوتا ہے اس لیے کہ فرد جانتا ہے کہ سماج میں اس کا مقام کیا ہے۔ لیکن ایک ذہین شخص کے لیے یہ صورت حال بڑی مایوس کُن ہوتی ہے۔ دوسری طرف کھلا ہوا معاشرہ مقابلے کے میدان کو بڑھاوا دیتا ہے اور ذہین افراد کو اس کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے اپنی حیثیت میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ لیکن اس صورت میں فرد احساسِ عدم تحفّظ، عدم استقلال اور نااہلی کے شدید احساس کا شکار بھی ہوسکتا ہے۔ تہذیب کی تعریف مختلف طریقوں سے کچھ اس طرح سے کی جاسکتی ہیں: ا۔ وہ اخلاق وعادات جن سے خاص قسم کی موزونیت ودلکشی پیدا ہوتی ہے۔ ۲۔ وہ

اشیا جو انسانی کے حسن ذوق عمل سے وجود میں آتی ہیں۔ ۳۔ وہ معمار، جن پر زندگی پرکھی جاتی ہے۔ ۴۔ اصول وقوانین اور اجتماعی ادارے ۵۔ زندگی کا مکمل نصب العین ۶۔ اقدار کا ہم آہنگ شعور ے۔ علوم وفنون اور بدائع وصنائع وغیرہ۔ فی الحقیقت تہذیب عربی لفظ ہے جس کے معنی لسانی العرب میں یہ ہے کہ تہذیب کی اصل ''ظل'' کو اندر کی تمام چیزوں سے صاف کرنا اور اس کی کڑواہت دور کر کے ''دان'' کو اس قابل بنانا کہ کھانے والے کے لئے خوشگوار ہو جائیں۔ تاج العوس میں ہے' تہذیب اور ہذب کی اصل درختوں کی کاٹ چھانٹ کرنا تا کہ ان کے حسن اور نشونما میں اضافہ ہو۔ پھر بعد میں ہر شئے کی صفائی، اصلاح اور عیوب سے خالص کے لئے اس کا استعمال ہونے لگا اور یہ اس کی حقیقت عرفیہ بن گیا۔ گویا کہ تہذیب اصل میں کسی چیز کی ناخوشگواریوں کی اصلاح کر کے ایک خالص پیرایہ میں ڈھانے کو کہتے ہیں۔ موجودہ دور کی تہذیبیں انہیں ناخوشگواریوں کا مجموعہ بن گئی ہیں، ان کی اصل ضائع ہو رہی ہے۔ لہٰذا ان کے مابین اصلاح کر کے اس میں انسانیت کے جذبہ کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تہذیبیں قوت وطاقت کے غرور میں مبتلا ہو جاتی ہیں، مردہ ضمیر، نفسیاتی خواہشات کی بہتات، مادیت پرستی اور اخلاقی تنزلی کا شکار ہو جاتی ہیں ان کا انجام تباہی وبربادی ہی ہوتا ہے۔

اس مختصر مطالعہ سے کسی بھی سماج میں تہذیب وثقافت کی اہمیت اور اس کے آپسی رشتوں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہندستان میں ہر چیز ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ہندستان میں شادی کی عمر کم از کم اٹھارہ سے اکیس سال رکھی گئی ہیں۔ یہاں کی شادیاں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم اس میں ادا ہونے والی رسمیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یکساں ہی ہیں۔ یہی حال اتر پردیش کا بھی۔ یہاں اودھ کی شادی ہو یا پورے اتر پردیش کی یہاں شادیوں ہے کی رسمیں یکساں ہیں۔ ماضی کی طرح یہاں آج بھی شادی کی رسمیں کئی دنوں پہلے شروع ہو کر شادی کے کئی دنوں بعد تک چلتی ہیں۔ یہاں الگ الگ فرقوں، الگ الگ علاقوں، الگ الگ کمیونٹی کی بھی شادی کی مختلف چھوٹی چھوٹی رسمیں ورواجیں ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کے بارے میں لکھنا ممکن نہیں لیکن میں کچھ ایسی رسم ورواج کا ذکر کرونگی جو کہ ہر ایک شادی میں لازمی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت کا کیوں نہ ہو، ساتھ ہی کچھ گیت بھی آپ کے سامنے پیش کرونگی جو خصوصا شادی کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔ اودھ میں شادی بیاہ کے موقع پر مختلف تقریبات ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے ڈھولک خریدے جاتے ہیں، تمام عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر ڈھولک بجا کر گیت بھی گاتی ہیں۔ ان گیتوں میں دعائیہ ،طنزیہ ہر طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔ ان کو نیگ کی صورت میں کپڑے میٹھائیں یا دیگر تحائف دیے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر جو رسمیں لازما منائی جاتی ہیں۔ وہ رسمیں اس طرح ہیں:

(1) چھیکائی کی رسم: یہ شادی کو لے کر سب سے پہلا قدم ہے۔شادی لڑکے کی ہو یا لڑکی کی، منگنی سے پہلے گھر کی عورتیں جا کر لڑکے یا لڑکی کو دیکھتی ہیں۔خصوصاً لڑکے کی طرف سے یہ رسم کی جاتی ہے۔جب لڑکے کی والدہ، پھوپھیاں، بڑی بہنیں، دادی یا خاندان کی بزرگ خواتین لڑکی کو دیکھتی ہے، پرکھتی ہے مثلاً آج بھی اودھ کے آس پاس کے علاقوں میں لڑکی سے آلو کاٹنے کو کہا جاتا ہے، اگر لڑکی آلو کو ایک سائز میں کاٹ دے تو اسے سگھڑ مانا جاتا ہے۔اسی طرح کچھ خواتین پوچھتی ہے کہ پالک کی سبزی میں ہلدی پڑتی ہے یا نہیں۔اس طرح کے دیگر سوالات کرتی ہیں۔جب ان کو تشفی ہو جاتی ہے کہ لڑکی عقلمند باشعور اور سگھڑ ہے اور ان کے گھر کی بہو بننے لائق ہے تو وہ اسے رسماً کچھ پیسے دے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے ساتھ ہی منگنی کی رسم کے لیے تاریخ مقرر کرتی ہے۔اسے یوپی میں چھیکائی کی رسم کہتے ہے۔

(2) منگنی کی رسم: یہ رسم بہت مقبول ہے جس کے بارے میں شاید ہی کوئی نہ جانتا ہو، شادی کی بات پکی ہو جانے کے بعد یہ تقریب عمل میں آتی ہے۔اس خوشی کے موقع پر اودھ میں لڑکی کے گھر والے، رشتہ دار، عزیز و اقارب اکٹھا ہوتے ہیں، اسی طرح لڑکے کے گھر بھی دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے یہاں جاتے ہیں اور انگوٹھی پہنا کر اس رسم کو ادا کرتے ہے۔مسلم گھرانوں میں آج بھی انگوٹھی لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو نہیں پہناتے بلکہ والدہ یہ رسم ادا کرتی ہے یا کوئی گھر کا بڑا بزرگ۔لڑکی کے گھر اس موقع پر عورتیں گیت بھی گاتی ہے مثلاً:

اماں میری چھوٹی عمریا، کھیلنے کی جان ہے — کون وہ مامی پیغام لگائے سو
ان کی چوٹی کٹاؤ! — میری کھیلنے کی جان ہے

(3) میلاد، دعا اور مذہبی گیت کی رسم: اودھ میں شادی کی ہر ایک تقریب میں ڈھولک گیت کا رواج ہے۔حتیٰ کہ میلاد جو کی شادی کی خوشحالی اور سلامتی کی نیت سے رکھی جاتی ہو اس میں بھی تمام عورتیں حضور ﷺ کی تعریف میں یا کسی ولی اللہ کی منقبت میں گیت گا کر اپنی عقیدت و جذبات کا نذرانہ پیش کرتی ہیں، اس موقع پر ایک خوبصورت گیت ملاحظہ فرمائیں:

میرے پیر کا دیدار ہوا، کیا مزہ ملا
ڈل ڈل کے گھوڑے اترے، گلشن کے باغ میں
وجو کرتے سوار ہوا کیا مزہ ملا
میرے پیر کا دیدار ہوا، کیا مزہ ملا

اس موقع پر دولہا دلہن اور دونوں خاندانوں کے بوڑھے بزرگ دعائیں دیتے ہیں اور رشتہ داروں

کو مبارکباد دی جاتی ہے اور ایک دعائیہ ڈھولک گیت گایا جاتا ہے۔خصوصا اس موقع پر ساس، سمدھن، بیٹی، نند، سالی اور دولھا، دلہن کو یہ مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔مثلاً یہ خوبصورت دعائیہ گیت ملاحظہ فرمائیں جس میں خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لے کر دعا کی گئی ہے۔طوالت کے ڈر سے چند مصرعے پیش کیے جاتے ہیں:

خانے آباد ہیں دربار مبارک ہوئے — تم سلامت رہو، رہو جی اجی ساس بیگم
بیٹا آباد ہو بہو مبارک ہوئے — خانے آباد ہیں دربار مبارک ہوئے
تم سلامت رہو رہو جی اجی سمدھن بیگم — بیٹی آباد و داماد مبارک ہوئے
خانے آباد ہیں دربار مبارک ہوئے — تم سلامت رہو رہو جی اجی نند بیگم
بھائی آباد و بھابی مبارک ہوئے — خانے آباد ہیں دربار مبارک ہوئے
تم سلامت رہو رہو جی اجی سالی بیگم

(4) اناج بنائی: اودھ میں اس کے آس پاس کے علاقوں میں خصوصا اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں آج بھی جب لڑکی کی شادی طے ہو جاتی ہے تو شادی کے کھانے کے لیے چاول سے کنکڑ چننے، گیہوں دھونے، سکھانے اور پسائی کے بعد آٹے کو چلنی سے چال کر چوکر نکالنے کے لیے خاندان اور آس پاس محلے کی عورتیں جمع ہوتی ہیں، شادی کی یہ چہل پہل مہینے بھر پہلے شروع ہو جاتی ہیں، شادی والے گھر میں اناج بنائی کے دوران پان کھانا، گیت گانا اور حلوا وغیرہ بنانے کا رواج ہوتا ہے اس موقع پر عورتیں آپس میں باتیں کرتی ہوئی گیت گاتی ہوئی کام کرتی ہے۔اس موقع پر گائی جانے والی ایک خوبصورت گیت کے چند مصرعے ملاحظہ ہو:

آؤ تو آؤنگی نا منڈوے میں آنا — منڈوا پڑا ہے دیکھو کیسا سہانا
منڈوے کے اندر لائیٹاں لگے ہیں — منڈوے پو ساڑیاں کی جھومبر لگانا
آؤ تو آؤنگی نا منڈوے میں آنا

(5) آپسی میلاپ کی رسم: یہ رسم نکاح کے کی ایک دن پہلے دولہا اور دولہن دونوں کے یہاں منائی جاتی ہیں۔اس موقع پر گاؤں، پڑوس، رشتہ دار سب کو شادی میں شامل ہونے کے لیے منایا جاتا ہیں۔ان کی ناراضگی کو ختم کیا جاتا ہے۔آپسی گلہ شکوہ بھول کر شادی میں شامل ہو کر دعائیں دینے کے لیے منایا جاتا ہیں۔اس موقع پر خاص دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ناراض لوگوں کے پسند کا کھانا بھی بنایا جاتا ہے۔

(6) رت جگا کی رسم: آپسی ملاپ کی رات ہی رت جگا ہوتا ہے۔اس موقع پر خصوصا لونگ کی مراد والا حلوہ تیار کیا جاتا ہے، بریانی اور ست میل کھچڑی، کیوٹی دال (مکس دال) سادہ چاول خاص طور پر بنایا جاتا ہے، اس رات کو خوب ہنسی مذاق، ناچنا گانا، گیت گانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔کچھ عورتیں شادی کے دن کی بچی

ہوئی تمام تیاریاں مکمل کرتی ہیں اور پوری رات جاگا جاتا ہے۔اس لیے اسے رت جگا کہا جاتا ہے۔

دولن کی سیج سجی ڈھولک کی تھاپ سکی
رت جگا ہے آج سکھی چولھے پواب کڑھئی چڑھاؤ
ہری بیل کا منڈوا سجاؤ شادی کی دھوم مچی
رت جگا ہے آج سکھی دولن کی سیج سجی

(7)لگن کھلوائی کی رسم: اس موقع پر لڑکی کے گھر والے عزیز واقارب دعائیں بھی دیتے ہیں اور اس موقع پر ڈھولک پر گیت بھی گائی جاتی ہے،ان گیتوں میں ایسی باتیں کہی جاتی ہے کہ لڑکی کو نئے گھر جانے میں گھبراہٹ محسوس نہ ہو،اس میں ماں باپ کی طرف سے ڈھارس بھی بندھوائی جاتی ہے کہ بھلے وہ اس گھر سے رخصت ہورہی ہے لیکن ہم سب اس کے ساتھ ہیں مثلا یہ خوبصورت گیت ملاحظہ فرمائیں:

بنی تیرے جیبوں کو ہیرے لگے (تین مرتبہ) اشرفیاں لٹاتے آیا بنا (تین مرتبہ)
بنی تیرے بازو کو اماں کھڑے (دومرتبہ) ساسوں کو نچاتے آیا بنا (دومرتبہ)
بنی تیرے جیبوں کو.....
بنی تیرے بازو کو باوا کھڑے (دومرتبہ) سسر کو نچاتے آیا بنا (دومرتبہ)
بنی تیرے جیبوں کو.....
بنی تیرے بازو کو بہنا کھڑے (دومرتبہ) نندوں کو نچاتے آیا بنا (دومرتبہ)
بنی تیرے جیبوں کو.....
بنی تیرے بازو کو بھائیاں کھڑے (دومرتبہ) سالوں کو نچاتے آیا بنا (دومرتبہ)
بنی تیرے جیبوں کو ہیرے لگے (تین مرتبہ) اشرفیاں لٹاتے آیا بنا (تین مرتبہ)

(8)پاؤں میس کی رسم: اودھ میں شادی کے موقع پر یہ بھی ایک دلچسپ رسم ادا کی جاتی ہے ۔اس موقع پر دلہن کی طرف سے دولہے کو جوڑے،گھوڑے کی رقم دی جاتی ہے۔یہ قدیم زمانے میں ہوتا تھا لیکن اب تحفے دیئے جاتے ہیں۔یہ رسم غیر مسلم کے یہاں خصوصا ادا ہوتی ہے لیکن مسلم کے یہاں بھی منانے کی رواج ہے۔اس موقع پر دولہا اور دلہن کے کپڑوں،چپل وغیرہ کی ناپ بھی لی جاتی ہے۔ساتھ ہی دولہا دلہن کے خاندان والے گل پوشی کی رسم بھی کرتے ہیں اور گیت گاتے ہے:

دئیلان میں پہنائے ہار،کیا خوشنما لگا کے
مالی نے لایا دونا،مالن نے لائی ہار

اماں نے پہنائے ہار کیا خوشنما لگا کے
دئیلان میں پہنائے ہار،کیا خوشنما لگا کے

(9)ہلدی،منجھے(منجے)یا منجھے کی رسم: شادی کے موقع پر دولہا اور دولہن کی رنگت کو نکھارنے و سنوارنے کے لیے ہلدی لگائی جاتی ہے۔اودھ میں یہ دولہن کو آٹھ یا دس دن تک ہلدی لگائی جاتی ہے حالانکہ کچھ جگہوں پر ہلدی والا ابٹن بھی لگایا جاتا ہے۔شادی کے دو دن پہلے آخری ہلدی دھوم دھام سے لگائی جاتی ہے۔جس میں خوب شرارتیں بھی ہوتی ہے۔اس موقع پر ہر طرح کی گیت عورتیں ترنم میں گاتی ہیں۔مثلا:

پھلوا پہنانے آئی آج رے میں تو پھلوا پہنانے آئی ا
پھلوا پہنانے آئی،منجھے بٹھانے آئی آج رے میں تو پھلوا پہنانے آئی آج رے

☆☆

چلو کے بہنا دولن کے گھر ڈھول بجانے جایں گے
سنو سنو اب دولے والے ہلدی لے کو آئیں گے
نندا ں آئیں گے،پھولاں لایں گے
دولن کو سب،ہلدی چڑھائیں گے

(10)سانچق کی رسم: یہ بھی ایک خوبصورت رسم ہے جس میں دولہا دولہن کو چسکا اور خوشبو لگائی جاتی ہے۔پھولوں کا ہار پہنایا جاتا ہے۔دولہے والے دلہن کے لئے شادی کے کپڑے اور دیگر شادی میں دیے جانے والے سامان،شادی کے دن پہننے والے جوڑے لے جاتے ہیں،جسے ''بری'' کی رسم کہتے ہیں۔مختلف گیتوں،مٹھائی کھلانے کے ساتھ یہ رسم ادا کی جاتی ہے،سارے سامان کو سجا کر خاندان والوں کو دکھایا جاتا ہے کہ شادی میں ایک دوسرے کی طرف سے زیوارات کپڑوں اور دیگر ساز وسامان میں کیا کیا دیا جارہا ہیں:

چھوٹی دلہنیاں کا دلہا بن جاؤں گا
دلہا بن جاؤں گا،میں نوشہ بن جاؤں گا
چھوٹی دلہنیاں کا.....
چھوٹی دلہنیا کو بھوکو لگی ہے
لڈو،جلیبی میں برفی بن جاؤں گا
چھوٹی دلہنیاں کا دلہا بن جاؤں گا

(11) مہندی کی رسم: شادی کی رسموں میں یہ ایک اہم رسم ہیں۔ جو صرف ہندوستان ہی نہیں دوسرے ممالک میں بھی منائی جاتی ہیں، اس موقع پر دولہا اور دولہن دونوں کے ساتھ خاندان کے ممبران مہندی لگاتے ہیں، اس دن خصوصا گیتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عورتیں ڈھولک لے کر بجاتی گاتی ہیں، ڈانس ہوتا ہے اور انھیں سب کے درمیان مہندی کی رسم ادا کی جاتی ہے، دولہا اور دولہن کی چھوٹی بہنیں اور بھائی ایک انگلی میں مہندی لگا کر کس کے پکڑ لیتی ہیں اور نذرانہ (شگون) کا مطالبہ کرتی ہے۔ شگون کم ملنے پر لڑکے دولہے والوں پر طنز کیا جاتا ہے لیکن اس کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ اپنے پن کا احساس کرانا ہوتا ہے۔ لڑکی کو بیٹھا کر اس کے دونوں ہاتھوں میں پان رکھ کر گھر کے سارے لوگ نظر اتارتے ہوئے، مٹھائی کھلاتے ہوئے مہندی اس پتے پر لگاتے ہیں تاکہ ہاتھ پر رنگ نہ چڑھے اور رسم ادا ہو جائے، اس رسم کے بعد مہندی کی اکسپرٹ باقاعدہ مہندی کی ڈیزائن لگاتی ہیں اور اس دوران گیت گائی جاتی ہیں:

دولن کو چوڑیاں پناؤ ہرے ہرے — ہاتاں دکھیں گے دولن کے بھرے بھرے
ہاتاں کا رنگ اس کے چاندی کے سرکا — پورا ندھارا جی جائیں گا گھر کا
ہاتاں کو پہلے تو مہندی لگائیں گے — مہندی لگا لے پھولاں پنائیں گے
پھولاں کی خوشبو سے ہیں دل بھرے بھرے — دولن کو چوڑیاں پناؤ ہرے ہرے

(12) سہرا اور بارات نکلنے کی رسم: اودھ اتر پردیش میں یہ رسم آج بھی زندہ ہے۔ بادشاہوں اور نوابوں کے زمانے سے چلی آرہی یہ رسم جب خاص و عام ہوئی تو یہ شادیوں کا اہم جزو بن گئی۔ اس رسم کے موقع پر قدیم زمانے سے ہی شعرا نے سحرا لکھا۔ آج بھی اودھ میں سحرا لکھنے کی رواج ہے۔ بادشاہوں کے زمانے میں رنڈیاں اور ڈومنیاں سہرا پہناتے ہوئے سہرا گاتی تھیں بعد میں گھریلوں عورتیں اور درباری شعرا اور مردوں نے بھی سہرا گانے لگے۔ آج یہ رسم ناؤں (بال کاٹنے والا) جب صبح دولہے کو تیار کرتا ہے تو پہناتا ہے اور گھر کی عورتیں کھڑی ہو کر ترنم میں سہرا گاتی ہیں۔

کھیلیں نولیاں ارے بنے — آج کی تیاری کھیلے نولیاں ارے بنے
سہرا تمہارا خوب گندھا ارے بنے، — آج کی رتیا
لڑیاں سنجھالیں لوکھیاں ارے بنے — آج کی رتیا
یا اللہ جلدی بتا خوشی سہرے — تیرے سہرے کی خوشی تیرے امی میں رہے

اسی طرح جب لڑکی کو تیار کیا جاتا ہے تو دلہن بنتے وقت عورتیں کچھ اس طرح گاتی ہیں:

دلہن سجی جی کمرے میں — کاناں جھمکوں سے ساجے

کاناں جھمکوں سے ساجے — اور آئرن بھی باجے
ہنسی کھلی جی من من میں — کاناں جھمکوں سے ساجے
گلا نکلس سے ساجے — ہاتھاں کنگن سے ساجے
ہونٹ مسی سے ساجے — کان آہٹ پہ ساجے
دلہن سجی جی کمرے میں — کاناں جھمکوں سے ساجے

اسی طرح جب دولہا تیار ہو جاتا ہے تو گھر کی عورتیں بلائی لیتی ہیں اور اس خوشی کے موقع پر گیت گاتی ہیں:

اللہ نے بنایا دولہا، دلہن کا جوڑا (تین مرتبہ)

دلہن نے رو کے بولے
اماں میں کیسے جاؤں، ممی میں کیسے جاؤں،
ممی نے رو کے بولے
ساس ہی کو ممی کہنا (دو مرتبہ)
دولھے کا گھر بسانا — دولھے کا گھر بسانا
اللہ نے بنایا دولہا، دلہن کا جوڑا (تین مرتبہ)

(13) آرسی مصحف (جلوا) کی رسم: نکاح کے بعد دولہا اور دولہن کو آمنے سامنے بیٹھا کر بیچ میں تکیہ پر قرآن مجید رکھی جاتی ہے۔ پھر دولہا سورہ اخلاص پڑھ کر دلہن پر دم کرتا ہے۔ جس کے بعد دونوں کے درمیان آئینہ رکھا جاتا ہے۔ اس آئینے میں پہلی بار دولہا دلہن کو دیکھتا ہے۔ بعض مقامات پر اس موقع پر دولہا لڑکی کی مانگ کو افشاں سے بھرتا ہیں۔ اس رسم کو الگ الگ خطوں میں منانے کا مختلف طریقہ ہے مثلا رجستھان میں آئینے کی جگہ انگوٹھی میں لگے شیشے میں منھ دیکھنے کا رواج ہے۔ اس رسم کو آرسی یا جلوا کہتے ہے۔ اس موقع پر بھی عورتیں گیت گاتی ہیں:

میری ہریالی گھونگھٹ کھول راج دلاری گھونگھٹ کھول
گھونگھٹ کھول منھ سے بول راج دلاری گھونگھٹ کھول
باوا کی پیاری گھونگھٹ کھول اماں کی دلاری گھونگھٹ کھول
میری ہریالی گھونگھٹ کھول راج دلاری گھونگھٹ کھول

(14) رخصتی یا وداعی کی رسم: یہ بہت جذباتی اور آنکھوں کو نم کر دینے والا لمحہ ہوتا ہے۔ یہ گیت پر درد ہوتے ہیں۔ ان گیتوں میں بھائی، بہنوں، ماں۔ باپ سے بچھڑنے کا درد مائکے میں گزرے بچپن سے

جوانی تک کی یادیں گیت میں گائی جاتی ہیں، عورتیں بے ساختہ روتے ہوئے نم آنکھوں سے یہ گیت گاتی ہیں:

کیسے مسافر کو دے گی میری اماں
لے کے چلا پردیس دے گی میری اماں
کیسے مسافر کو.....
گڑیا بھی چھوڑی اللہ، گھڑیاں بھی چھوڑیں اللہ
اب چھوڑی اماں کا گود گے میری اماں
کیسے مسافر کو.....

ودواعی کے بعد جب لڑکی سسرال میں قدم رکھتی ہے تو اس کے استقبال کے لیے بھی دھوم دھام سے تیاری کی جاتی ہے۔ اس کا نئے گھر سے جڑنے والا نیا رشتہ اور اٹوٹ بنے، نئی نویلی دلہن کو اپنا پن دکھانے کے لیے سسرال کی نندیں، دیور اور دیگر افراد چھیڑتے ہوئے دلہن کی طرف سے گیت گاتی ہیں مثلاً:

دیور جی اود یور جی میری انگنائی میں گلی مت کھیلو جی
تمہاری گلی پڑوسن کے گھر میں پڑوسن کی بلی ہماری انگنائی میں
نند کا پھیکا دودھ پی جائے گی جی، دیور جی اود یور جی
تمہاری گلی پڑوسن کے گھر میں پڑوسن کی چھوری ہمارے گھر میں
میری دیوارانی بن جائے گی جی، دیور جی اود یور جی

(15) انگوٹھی تلاشی کی رسم: اس میں جب لڑکی وداع ہو کر سسرال آتی ہے تو ایک بڑے برتن میں دودھ بھر کر اس میں گلاب کی پتیاں ڈال کر ایک انگوٹھی ڈلا دی جاتی ہے اور پھر دولہا دلہن سے اس انگوٹھی کو تلاش کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ جو انگوٹھی ڈھونڈھ لیتا ہے، کہتے ہیں پھر وہ تا عمر اپنے ہم سفر پر راج کرتا ہے۔ یہ رسم اب تو بڑے فیشن میں ہے اور بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔

(16) منھ دکھائی کی رسم: لڑکی جب سسرال آتی ہے تو اسے پھر سے تیار کر کے بٹھایا جاتا ہے اور اسے لوگ دیکھنے آتے ہیں اس موقع پر لوگ دلہن کی بلائی لیتے ہیں اس کی نظر اتارتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ اس کو پیسہ اور دیگر تحائف بھی دیا جاتا ہیں۔

(17) چوتھی کی رسم: شادی کے دوسرے دن دولہے کے ساتھ دلہن اپنے میکے آتی ہے۔ دلہن کی بہنیں نئے نویلے دولہے میاں کے جوتے چھپاتی ہیں۔ جوتا چھپانے کی رسم بعض مقامات پر نکاح کے بعد سلام کرائی کی رسم ہوتی ہے جس میں دولہا گھر میں آتا ہے اور گھر کے خاندان کی عورتوں کو وہ سلام کرتا ہے

، چونکہ عورتیں پردے میں رہتی ہے وہ دولہے کو نہیں دیکھ پاتی اس لیے سلام کرائی کی یہ رسم ادا کی جاتی ہے تا کہ گھر کی عورتیں دولہے کو دیکھ سکیں۔ اس دوران لڑکیاں پیسوں کے بنائے ہوئے مالا، کبھی کبھی اس میں مذاقا مرچی، لیموں یا ناریل، چاکلیٹ وغیرہ بھی ڈالتی ہے، دلہے کو پہنایا جاتا ہے، ساس اور دلہن کی بہنیں مٹھائی اور دودھ پلاتی ہے، ساس کبھی کبھی داماد جی کی ناک پکڑ کر کھینچتی ہے، اس موقع پر دولہے کو سونے چاندی کی انگوٹھی اور دیگر تحائف دیئے جاتے ہیں۔ اس دوران جوتا چرائی کی رسم بھی ہوتی ہے۔ لیکن بعض مقامات پر چوتھی کے دن یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر لڑکیاں گیت بھی گاتی ہیں اور گیتوں کے ذریعہ طنز و مزاح کے تیر چلا چلا کر شرارتیں کرتی ہیں۔ ہنستی ہنساتی ہیں۔ مثلاً:

لوٹھے میں گھڑا ڈوباؤ کیا بیگم تیرے لئے، لوٹھے میں گھڑا
تیری اماں جیسی، میری اماں ویسی
اماں کو چھوڑ دوں کیا بیگم تیرے لئے
ٹھے میں گھڑا ڈوباؤ کیا بیگم تیرے لئے، لوٹھے میں گھڑا

(18) ولیمہ کی رسم: لڑکے کے گھر شادی کے دوسرے دن کی تقریب کو ''ولیمہ'' کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر دولہے والوں کی طرف سے دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر کئی گیت گائے جاتے ہیں۔ دولہا اور دولہن کو پھولوں کی مالا پہنایا جاتا ہے۔ تحائف پیش کیے جاتے ہیں، اس موقع پر گایا جانے والا یہ گیت ملاحظہ فرمائیں کہ:

بنے پہ سے کیا کیا واروں ماں — دلہے پہ سے کیا کیا واروں ماں
ہیرے بی واری، موتی بی واری — بنے پہ سے منگا واروں گے ماں
بنی پہ سے کیا کیا واروں ماں

(19) جمعگی کی رسم: شادی صحیح سلامت ہو جانے کے بعد ہر جمعہ کو جمعگی ہوتی ہے۔ پانچ جمعوں تک یہ تقریب عمل میں آتی ہے۔ دلہن والوں کے گھر میں تو کبھی دولہے والوں کے گھر میں، اس موقع پر گیتوں کے ذریعے سمدھنیں آپس میں ایک دوسرے کو چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق ہوتا ہیں۔ یہ گیت ملاحظہ فرمائیں:

زیروزیرونلی، گنوار کی پھلی — دو پیسوں کی نلی، گنوار کی پھلی
زیروزیرونلی — ایسے رضیہ بیگم (جیٹھانی) کو دعوت نہ دینا
پلو میں چھپائے نلی، گنوار کی پھلی — زیروزیرونلی

جمعہ کی جمعگی بہنو بنے آج جمعہ ہے بنے

(20) رسوئی چھوائی کی رسم: جمعگی کی رسم ختم ہونے کے بعد نئی نویلی دلہن کو چولہا چھونے کی اجازت ملتی ہے۔اس موقع پر دولہن میٹھا بنا کر خاندان والوں کو کھلاتی ہیں اور دعائیں لیتی ہیں۔

اسی طرح اور بھی دیگر چھوٹے چھوٹے موقع پر گیت گائے جانے کا رواج ہے مثلا جب لڑکی کو شادی کے لیے تیار کیا جاتا ہے تو اس موقع پر بھی عورتیں گیت گاتی ہیں مثلا یہ گیت ملاحظہ فرمائیں کہ:

بنی ساج رہی ماں، سنہرے جوڑے سے روپہنے جوڑے سے (تین مرتبہ)

بنی تیرے باوا کریں گے کاج (دومرتبہ)

ہیرے موتی سے، ہیرے موتی سے بنی میری ساج.....

بنی تیرے اماں کریں گی ترا کاج (دومرتبہ)

سونے چاندی سے سونے چاندی سے بنی میری ساج.....

بنی تیرے بھائیاں کریں گے تیرا کاج (دومرتبہ)

روپئے پیسے سے روپئے پیسے سے

اودھ میں شادی لگنے کے بعد رشتہ داروں کو بلایا جاتا ہے اور ایک چھوٹی سی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر شادی طے ہونے کی خوشی منائی جاتی ہے اور ایک دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس موقع پر بھی گیت گائی جاتی ہے خصوصا لڑکی کے گھر والوں کے یہاں یہ خوشیاں منائی جاتی ہیں۔اس موقع پر گائی جانے والی ایک خوبصورت گیت ملاحظہ فرمائیں:

شادی آئی ماں میرے گھر بنا بنی مبارک (تین مرتبہ)

خوشی آئی ماں میرے گھر بنا بنی مبارک (تین مرتبہ)

ہرے منڈوے کے نیچے ہلدی کون لگائے بنی کو (دومرتبہ)

ہمیں رسم کے رودار بنا بنی مبارک (دومرتبہ) شادی آئی ماں.....

ہرے منڈوے کے نیچے چکسہ کون لگائے بنی کو (دومرتبہ)

ہمیں رسم کے رودار بنا بنی مبارک (دومرتبہ) شادی آئی ماں.....

ہرے منڈوے کے نیچے صندل کون لگائے بنی کو (دومرتبہ)

ہمیں رسم کے رودار بنا بنی مبارک (دومرتبہ) شادی آئی ماں.....

ہرے منڈوے کے نیچے مہندی کون لگائے بنی کو (دومرتبہ)

ہمیں رسم کے رودار بنا بنی مبارک (دومرتبہ) شادی آئی ماں.....

ہرے منڈوے کے نیچے پھولاں کون پہنائے بنی کو (دومرتبہ)

ہمیں رسم کے رودار بنا بنی مبارک (دومرتبہ) شادی آئی ماں.....

ہرے منڈوے کے نیچے جوتا کون پہنائے بنی کو (دومرتبہ)

ہمیں رسم کے رودار بنا بنی مبارک (دومرتبہ) شادی آئی ماں.....

اسی طرح جس لڑکی کی شادی ہوتی ہے، اسے سہیلیاں چھیڑتے ہوئے گیت گاتی ہیں اور ایکٹنگ کے ذریعہ ہونے والی سسرال کے گھر والوں کا نام لے کر دلہن کو چھیڑتی ہے یہ اکثر مہندی اور ہلدی کی رسم سے پہلے ہوتی ہے۔لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے، جسے آج بڑے شہروں میں برائڈ شاور کے نام سے بھی جانا جاتا ہے یوپی اور اودھ کے آس پاس کے علاقوں میں، بطور نمونہ اس گیت کے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

اللہ میری قسمت کا کھیل ہے نرالا میری ساس ترپٹ میرا سسرا کالا

اللہ میری قسمت کا کھیل ہے نرالا.....

نہیں اس کے جیسا کوئی بھی مثال میری ساس دیتی ہے ہر روز گالی

اسی طرح شہر میں رہنے والا نوجوان جو گاؤں دیہات کی رسم ورواج کو نہی جانتا اسے نوجوان لڑکیاں ایک جگہ جمع ہو کر چھیڑتے ہوئے کچھ اس انداز میں گیت گاتی ہیں۔طوالت سے گریز کرتے ہوئے چند مصرعے ملاحظہ فرمائے کہ:

دولہا گاؤں کا گنوار دولن بولتی ہی نئیں

شملہ چھوڑتا بھی نئیں موٹر بیٹھا ہی نئیں

چپل چھوڑتا ہی نئیں پینٹ پینتابی نئیں

بنڈی چھوڑتا بی نئیں پھولاں کا ڑتا بی نئیں

دولہا گاؤں کا گنوار دولن بولتی بی نئیں

شملہ چھوڑتا بھی نئیں موٹر بیٹھا ہی نئیں

اسی طرح جب شادی کے بعد پہلی بار لڑکی کے گھر والوں کے یہاں لڑکے والے یا لڑکے کے گھر والوں کے یہاں لڑکی والے دعوت پر آتے ہیں تو تحائف وغیرہ دینے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور نئی نویلی سمدھن کو چھیڑنے کے لیے گیت بھی گائی جاتی ہے، مثلا یہ گیت ملاحظہ فرمائیں کہ:

نیا ایک فتنہ نئی ایک الجھن
اجی میری سمدھن اجی میری سمدھن
لبوں پر برائی، نگاہوں میں نفرت
ہر اک سے لڑائی، ہر اک سے ہے حجت
میرے گھر میں جھگڑا ترے گھر میں ان بن
اجی میری سمدھن اجی میری سمدھن

☆☆

سمدھن سالو اوڑھے، سمدھن سالو اوڑھے
جھٹکے سے توڑے انار، سمدھن سالو اوڑھے
سمدھن کے آنکھاں دیکھوں، املی کے پھاکاں دیکھو (دو مرتبہ)
کیا خاصہ کاجل لگائے، سمدھن سالو اوڑھے
سمدھن کے ہاتھاں دیکھو، ادرک کے پنجے دیکھو
کیا خاصہ چھلے جمائے، سمدھن سالو اوڑھے (دو مرتبہ)

بہر حال اس مختصر مطالعہ میں اودھ اور اتر پردیش میں کی جانے والی شادیوں کی رسمیں اور گیتوں پر بھر پور روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ ہندستان میں جتنے خطے اتنی رسمیں اتنی تہذیب وثقافت۔ یہ ایک وسیع موضوع ہیں جسے چند صفحات میں سمیٹنا اور اس کے ساتھ انصاف کر پانا ممکن نہیں، تشنگی کا احساس رہ جانا فطری ہے۔ بہر حال میں انہیں کلمات کے ساتھ ڈھولک گیتوں کی صدیوں پرانی رسم جو دکن سے شروع ہو کر پورے ہندوستان میں پھیلی کے سلسلے میں کہے گئے چند مصرعوں کے ساتھ اپنی بات ختم کرنا چاہونگی کہ:

میں دکھنی ہوں دکھن کی رانی — یہ ڈھولک کے گیتاں ہیں میری نشانی
میں اتی پرانی ہوں اتی پرانی — مگر نئی ڈھلی میری اب تک جوانی

◂◂ ● ▸▸

House no. 267/2B Ward 24
Mohalla Newada ashok nagar
Allahabad (U. P)
Pin 211002 Mob 9899972265
Email: salehasiddiquin@gmail.com

● حارث حمزہ لون

وحشت کلکتوی کی انفرادیت

بیسویں صدی کے شعری منظر نامے پر سرسری نگاہ ڈالیں تو شعراء کی ایک بڑی کھیپ آسمانِ ادب پر بمثلِ روشن ستارے نظر آتے ہیں۔ تاہم علامہ رضا علی وحشتؔ کلکتوی کو اس دور کا امام الشعرا تسلیم کیا گیا۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جنہیں شعر وسخن کی آبرو کہا گیا ہے۔ وحشت کلکتوی نے یوں تو ۲۹ رسال کی عمر میں جب اپنا کلام بغیر کسی تقریظ کے شائع کروایا تو اُسے دیکھ کر ملک کے ہر ایک اہلِ زبان وفن نے تعریف کی۔ اہلِ زبان کے خطے سے دور رہ کر ایک بنگالی نژاد شاعر کا اہلِ زبان کی طرح شعر کہنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ زبان تو زبان وحشتؔ نے فنِ شعر کا بھی جس طرح خیال رکھا وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے نہ تو بڑے فنکاروں کی طرح غزل کی تنکنائی کا رونا رویا اور نہ ہی کوئی جدت طرازی سے کام لیا اور غزل کی ہیئت اور مواد میں بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی اور نہ ہی مروجہ اصول اور اسلوب کے خلاف قدم بڑھایا بلکہ شاعری کی پرانی روش پر قائم رہتے ہوئے ان حملوں کا جم کر مقابلہ کیا جو غزل کے خلاف ہو رہے تھے۔ وحشتؔ نے اُس دور میں غزل کو اپنا لہو پلایا اور اسے زندہ رکھا جب غزل کا باقی رہنا محال نظر آ رہا تھا۔

بلا کی ہوتی ہے وحشت کی بھی غزل خوانی — کہ اک سرور سا ہوتا ہے اہلِ محفل کو

وحشتؔ کلکتوی کا پورا نام سید رضا علی اور تخلص وحشتؔ تھا، لیکن ادبی دنیا میں وحشت کلکتوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کا نام شمشاد علی تھا۔ وحشتؔ کی پیدائش بروز جمعہ بتاریخ ۱۸ رنومبر ۱۸۸۱ء میں کڑایہ روڈ، پارک سرکس، کلکتہ میں ہوئی۔ کلکتہ مدرسہ عالیہ کے بہرۂ انگریزی فارسی میں ۱۸۹۰ء میں ان کا داخلہ درجہ سوم میں ہوا، جہاں سے انہوں نے ۱۸۹۸ء میں انٹرنس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ حالات ساز گار نہ ہونے کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے لیکن مطالعے کے ذوق وشوق نے ان کو علم وادب کی طرف ہمیشہ کھینچے رکھا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں ان کو امپریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ (گورنمنٹ آف انڈیا) کے شعبہ فارسی میں ملازمت مل گئی جہاں ان کے ذمے قدیم شاہی فارسی دستاویزوں کے اندراجات کی ذمہ داری سونپی گی۔ یہ ملازمت وحشتؔ کلکتوی کی طبیعت کے لحاظ سے بڑی مناسب تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہاں اپنی غیر معمولی دلچسپی دکھاتے ہوئے بڑی تیزی سے چیف مولوی کے عہدے تک جا پہنچے۔ اس ملازمت نے ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی

صلاحیتوں کو کافی سہارا دیا جو بعد میں ان کی شاعری اور مقالہ نگاری کی صورت میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ ملازمت ۱۹۲۶ء تک ہی قائم رہی۔ کیونکہ اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) کی تعمیر اور شعبۂ فارسی و اردو کے کھلنے کے بعد مولانا فضل الحق نے ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں کالج کے شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت لکچرار مقرر کرلیا۔ اپنی ادبی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نہ صرف شعبہ اردو و فارسی کے پروفیسر ہوئے بلکہ صدر شعبہ بھی بنائے گئے جہاں وہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۶ء تک اس کالج سے منسلک رہے۔ اور ۱۹۳۶ء میں اس کالج سے پنشن یافتہ سبکدوش ہوئے۔ لیکن اہل علم و ادب نے انہیں چین لینے نہ دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد جب لیڈی برابورن کالج قائم ہوا اور معلّمہ کی تلاش شروع ہوئی تو فوراً کسی خاتون لکچرار کے نہ ملنے پر ان کو اس کالج کے شعبۂ اردو فارسی کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس طرح ایک بار پھر وہ درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ لیڈی بربون کالج سے وابستہ رہے۔ ان کی اردو خدمت کا یہ عالم تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے انگریزی افسروں کو بھی اُردو زبان سکھانے جایا کرتے تھے۔ ان انگریز افسروں کے لئے انہوں نے ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ لیکن افسوس کہ آخری ایام میں وحشتؔ کلکتوی کو ذاتی غموں اور بیماریوں نے اس قدر پریشان کیا کہ ان کا انتقال ۲۰ر جولائی بروز جمعہ ۱۹۵۶ء میں ہوا تھا۔

وحشتؔ کلکتوی نے یوں تو نظمیں، رباعی اور قطعہ بھی لکھیں، لیکن ان کا اصل میدان غزل گوئی رہا۔ وہ اُردو غزل کا ایک معتبر نام ہیں۔ وحشت اُردو ادب میں کلاسکی رجحانات کے حامل تھے۔ وحشتؔ کلکتوی نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۸۹۶ء میں صرف پندرہ برس کی عمر میں کیا تھا اور ابوالقاسم محمد شمسؔ فرید پوری تلمیذ داغؔ دہلوی اور خلف الغفور نساخؔ کو اپنا استاد بنایا۔ استاد اور شاگردی کا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء تک ہی جاری رہا۔ کیونکہ ۱۹۰۵ء میں جب ابوالقاسم محمد شمسؔ کا انتقال ہوگیا تو پھر وحشتؔ کلکتوی نے کسی اور سے اصلاح نہ لی بلکہ خود پر بھروسہ کرکے شاعری کرنے لگے۔ وحشتؔ کلکتوی کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے: (۱) دیوان وحشت (۲) ترانہ وحشت (۳) نقوش و آثار۔ وحشتؔ کا اولین دیوان ''دیوان وحشتؔ'' کے نام سے ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس دیوان کا پہلا شعر ہے۔

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا　　طور شہید ہوگیا جلوۂ دل نواز کا

اس اولین دیوان میں غزلوں کی کل تعداد ۱۰۲ ہے جس میں کل اشعار ۸۹۲ ہیں۔ اس دیوان میں جہاں اُردو غزلیں، نظمیں، رباعیاں اور متفرق اشعار ہیں وہاں اس کے آخری حصے میں فارسی زبان میں غزلیں، رباعیاں، قطعے، قصیدے اور دیگر اصنافِ سخن کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ 'دیوان وحشت' میں خالص روایتی شاعری ملتی ہے۔ تقلیدِ غالب کے اشعار بھی اسی دیوان میں ملتے ہیں۔ اب یہ دیوان نایاب ہے۔ اس کی ایک کاپی نیشنل

لائبریری میں موجود ہے۔ وحشتؔ کلکتوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ''ترانہ وحشتؔ'' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں مکتبہ جدید، لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں بھی غزلیں، نظمیں، قطعے، نعتیں، سہرے اور دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔ ''ترانۂ وحشتؔ'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ وحشتؔ کلکتوی کا تیسرا مجموعہ کلام ''نقوش و آثار'' کے نام سے ۱۹۵۷ء ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ اس میں وحشتؔ کی وہ غزلیں اور دیگر منظومات ہیں جو ۱۹۵۰ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کہی گئیں تھیں۔ وحشتؔ کلکتوی کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''مکاتیبِ وحشتؔ'' کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل ۱۹۰ر خطوط ہیں جو ۲۵ر اشخاص کے نام لکھے گئے ہیں۔ وحشتؔ کلکتوی کے لکھے گئے مختلف ادبی مضامین کا پہلا مجموعہ ''مضامین وحشتؔ'' ہے جسے جمال احمد صدیقی نے وحشتؔ کے انتقال کے ۲۷ر سال بعد ترتیب دیا ہے اور جسے مغربی بنگال اُردو اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ غزل غنائی اور داخلی صنف سخن ہے۔ داخلیت جس قدر زیادہ ہوگی شعر اتنا ہی اثر انگیز ہوگا اور دیرپا اثرات مرتسم کرے گا۔

تم مرے گھر کو اگر آ کے نہ کرتے روشن　　آتشِ شوق، چراغِ شب فرقت ہوتی

وحشت نے قدیم و جدید کے امتزاج سے اپنی شاعری میں وہ رنگ و آہنگ پیدا کیا جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ ایسے شعر وہی کہہ سکتے تھے:

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے　　جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے

وحشتؔ کے اشعار کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی شاعری ہوس پرستی سے پاک ہے اور ان کی محبت بے لوث ہے۔ پی۔ سی۔ شبلی نے کہا تھا: "Our Sweetest Songs are those that tell of saddest thought"

شاعری وہی اعلیٰ ہے جو غم زدہ خیالات کی ترجمانی کرے۔ ہماری غزلیہ شاعری کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جس نے غم کو اپنا موضوعِ سخن نہ بنایا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے ہاں یہ زیادہ پایا جاتا ہے اور کسی کے ہاں کم۔

وحشتؔ کلکتہ کے رہنے والے تھے اور یہ شہر ان دنوں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان کی نظر کے سامنے کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت تحریک پروان چڑھی۔ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ہندو مسلم آپس میں متحد ہوجائیں، انگریز بھی سمجھتے تھے کہ اگر یہ دونوں فرقے متحد ہوگئے تو ان کا یہاں ٹکنا محال ہوجائے گا۔ لہٰذا انھوں نے دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈالنی شروع کی۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' ان کی پالیسی قرار پائی۔ ان حالات سے وحشت کا حساس دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہتے ہیں:

ترے غمزے لڑا دیں گے مسلماں کو مسلماں سے　　ترے عشوے بھڑا دیں گے برہمن کو برہمن سے

انگریز ملک کی معیشت پر قابض تھے۔ زراعت اور صنعت وحرفت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ ہندوستانیوں کو ملکی پیداوار سے محروم رکھا جارہا تھا۔ ملکی چیزیں غیر ممالک بھیجی جارہی تھیں۔ برطانوی حکومت کی لوٹ کھسوٹ سے وحشت کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا:

جگر لاؤں کہاں سے میں جو تاراجِ خزاں دیکھوں　　انھی آنکھوں نے کل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

بالآخر ملک آزاد ہوا دو حصوں میں منقسم ہوکر۔ دونوں طرف کے لوگ ہجرت پر مجبور ہوگئے۔ مہاجرین کے لیے وحشت کا مشورہ دیکھئے:

بہتر یہی ہے اپنا سمجھ لیں اسے وطن　　اب جائیں جس طرف کو نکل کر وطن سے ہم

وحشت کی شاعری کے سلسلے میں جو اک بات مشترک معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا تتبع غالب میں کامیاب ہونا۔ گویا وحشت کی شاعری کی کامیابی کا راز تتبعِ غالب میں کامرانی حاصل کرکے سرخ رو ہونا ہے جبھی تو اکثر و بیشتر نے انہیں غالبِ دوراں اور غالبِ ثانی جیسے القاب سے یاد کیا حتیٰ کہ خود وحشت نے بھی اس کامرانی پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ترے اندازِ سخن سے یہ ہے ظاہر وحشت　　کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

سنا تازہ غزل کوئی بطرزِ میر و غالب　　کہ یہ بزمِ سخن خالی نہیں وحشت سخنور سے

وہ امتیازِ حسن ہے معنی و لفظ کا　　وحشت کو جس نے غالبِ دوراں بنا دیا

تری شاعری نے وحشت ہے مچائی دھوم کیسی　　کہ زمانہ کہہ رہا ہے تجھے غالبِ زمانہ

زمانے میں اگر رنگِ سخن بدلا تو کیا وحشت　　مجھے تو ہے اتباع غالبِ معجز بیاں کرنا

وحشت کلکتوی نے میر و مرزا کے طرزوں کو اپنایا۔ مومن کے حسنِ بیان کا اثر قبول کیا اور داغ کے رنگ کو اپنی غزل میں جگہ دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غالب کی خصوصیاتِ شعری کو وظیفۂ سخن بنایا، لیکن ان کا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ انہوں نے اکابرِ فن کا تتبع اور پیروی کرتے ہوئے بھی جدت وندرت کی راہیں نکالیں اور یوں ان کے کلام میں ایک انفرادی شان پیدا ہوئی۔ وحشت بظاہر 'ادب برائے ادب' کے قائل ہیں مگر ان کے ہاں 'ادب برائے زندگی'' کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ فصاحت، بلاغت اور سلاست وحشت کی شاعری کے امتیازی وصف ہیں۔ ان کی زبان میں پختگی ہے، روانی اور سلاست ہے۔ وحشت اپنی شاعری میں ندرتِ خیال کو فصاحت کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ انھیں فکری سنجیدگی کے ساتھ زبان کا چٹخارا بھی عزیز ہے۔ لفظ ومعنی کا حسن ان کے ہاں نکھر کر آتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی ان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے ہیں:

''وحشت نے اپنی خدمات سے یہ ثابت کردیا کہ اُردو صرف دہلی اور لکھنو کی زبان نہیں، بلکہ پورا

ہندوستان اس کی آغوش میں ہے اور بنگال میں بھی ایسی اُردو لکھی جاسکتی ہے جس پر اہلِ دہلی واہلِ لکھنؤ وجد کریں''۔ (مضمون وحشت کی انفرادیت، از خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ، روح ادب، ۱۹۸۴)

چنانچہ وحشت کا اصل رنگِ سخن کہئے یا ان کی انفرادیتِ شعری، دراصل ان کی سرشت کی پاکیزگی، ان کے مزاج کی سادگی، ان کی شخصیت کی بلند اخلاقی اور روح کی شرافت سے عبارت ہے اور یہی ساری باتیں ان کے اشعار میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ اس سلسلے میں وحشت کو یہ کامیابی یونہی حاصل نہیں ہوگئی بلکہ انہوں نے اول تو غالب کے دیوان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ غور وفکر سے غالب کے محاسنِ کلام کی خوبیوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، ان کے اندازِ بیان، طرزِ فکر، ان کی فارسی بندشیں اور تشبیہات واستعارات ہر جز وحسنِ کلامِ غالب کی جانب ان کی توجہ مرکوز ہوئی اس کے بعد جب انہوں نے غالب جیسے نابغۂ روزگار کی تقلید میں اپنا قلم اٹھانے کی جرأت کی تو انہیں ان کے ریاض کا صلہ کامیابی کی صورت میں ملا۔

وحشت کروں غرور تو کس بات کا کروں　　پاتا ہوں میں تو اپنے سے بہتر ہر ایک کو

وحشت نے غالب کا تتبع قصداً کیا اور خوب کیا ہے۔ لیکن اس تقلید میں بھی ہر جگہ اپنی انفرادیت کی چھاپ چھوڑی ہے۔ ذیل میں چند اشعار کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ایک طرف یہ بات سامنے آتی ہے کہ وحشت نے کس حد تک غالب کا تتبع کیا تو دوسری طرف اسی بات کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اس تتبع میں بھی وحشت کس حد تک وحشت ہیں۔ ملاحظہ ہو:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے　　مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
(غالب)

شعر سے غالب کا مخصوص انداز واضح ہے۔ وحشت نے شعر کے مرکزی خیال کی تقلید میں درج ذیل شعر کہا ہے۔

بغیر از صدق کچھ مطلب نہیں ہے کفر وایماں سے　　دلوں سے کام ہے اس کو کہ ہندو و مسلماں سے
(وحشت)

غالب وفاداری کو اصل ایمان کہتے ہیں لہٰذا بعد از مرگ برہمن کو کعبے میں گاڑنے کی تلقین کرتے ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہاں کسی بات سے برہمن کی وفاداری ثابت نہیں ہوتی۔ پھر کیا ضروری ہے کہ اسے کعبے میں دفنایا جائے۔ البتہ وحشت کے یہاں لفظ ''اُس'' سے واضح اشارہ ''خدا'' کی طرف ہے۔ جس کے بعد یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کو کفر وایماں سے نہیں دلوں کے جذبۂ صدق سے مطلب ہے۔ اب یہ خواہ ہندو کے پاس ہو مسلمان کے پاس۔ خدا اسی کو عزیز رکھے گا جو اُس سے سچی محبت کرے گا۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی
(غالبؔ)

یہاں بھی غالبؔ کا مخصوص انداز واضح ہے جس کا ایک پہلو ظرافت بھی ہے۔ چنانچہ یہاں غالبؔ اپنے مزاج کے مطابق خود کی سرزنش کر رہے ہیں جبکہ وحشتؔ کا کہنا ہے۔

گنہ میرے مجھے یاد آئے وحشتؔ خجل سا رہ گیا میں ہاتھ اٹھا کر
(وحشتؔ)

وحشتؔ نے غالبؔ کا مضمون اخذ کیا ہے لیکن اپنی انفرادیت کی چھاپ بھی چھوڑی ہے اور یہاں وحشتؔ کی شرافتِ نفسی ظاہر ہے۔ واضح رہے کہ غالبؔ گویا بے غیرتوں کی طرح خود کو گناہ گار مانتے ہوئے بھی کعبہ جانے کے لیے تیار ہیں لیکن وحشتؔ تو اپنی انکساری کے سبب خدا سے معافی مانگتے ہوئے بھی سخت ندامت محسوس کرتے ہیں۔ غالبؔ کا ایک اور مشہور شعر ہے۔

درد منتِ کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہو برا نہ ہو

یہاں بھی غالبؔ کا خاص انداز ظاہر ہے بالخصوص دوسرے مصرع پیرایۂ اظہار غالبؔ کے یہاں اکثر و بیشتر جگہ نمایاں ہے۔ وحشتؔ نے اسی انداز کی تقلید کی ہے اور ان کے یہاں بھی ایسا ہی پیرایۂ اظہار صاف طور پر ظاہر ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مٹے داغِ وفا دل سے گو ایسا ہو نہیں سکتا مریضِ عشق اچھا ہے کہ اچھا ہو نہیں سکتا

غرض وحشتؔ نے غالبؔ کے رنگ میں نازک خیالی کی داد دینے کے باوجود اپنے کو اس بے اعتدالی سے بچا لیا ہے۔ وہ تقلید کرتے ہیں مگر ایک نئے طرز کے ساتھ، ایک نئے لطف اور ایک اچھوتے انداز کے ساتھ۔ وہ اپنے کلام کو پیچیدگی سے پاک رکھتے ہیں تاکہ حسنِ کلام برقرار رہے۔ ان کا ایقان ہے کہ کلام کی پیچیدگی، کلام کے حسن کو زائل کر دیتی ہے۔ غالبؔ مشکل پسند طبیعت کے مالک تھے۔ وحشتؔ نے ان کی تقلید کی لیکن ان کی مشکل پسندی سے اجتناب بھی کیا اور سلاست و فصاحت پر زور دیا۔ وہ زبان کے لطف کے زبردست حامی ہیں۔ وحشتؔ کی نظر میں وہ شعر مکمل ہی نہیں جس میں معنی کا حسن اور زبان کی لطافت نہ ہو۔ ملاحظہ ہو:

پیچیدگی سے پاک رکھ اپنے کلام کو وحشتؔ سخن میں چاہیے لطفِ زبان رہے
وحشتؔ کمالِ شعر فصاحت کا نام ہے مضمون کے خیال میں لطفِ زبان نہ چھوڑ
وحشتؔ مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر جس میں کہ حسنِ معنی و لطفِ زباں نہ ہو

وحشتؔ کی شخصیت کی نشو و نما اور تربیت میں تین نہایت اہم عناصر کا ہاتھ رہا ہے شرافت، سنجیدگی

اور دھیما پن۔ انہیں عناصر سے ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے اور یہی عناصر ان کی ساری شاعری میں جاری و ساری ہیں۔ وحشتؔ کو جو چیز ان کے ہم عصروں سے ممیز کرتی ہے وہ ہے ان کا لہجۂ عرفان و عشق۔

اپنا بھی وہی حال ہوا راہِ وفا میں جو حال ہوا کرتا ہے ارباب وفا کا

وحشتؔ کلکتوی نابغۂ روزگار شاعر ہیں جس نے اپنی شاعری کے سحر سے بڑے بڑوں کو مسحور کر دیا، ان میں صرف نیاز فتح پوری، اقبالؔ، حالیؔ، شبلیؔ، شوقؔ قدوائی، محشرؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی، ظہیرؔ دہلوی، صفیؔ لکھنوی اور انہیں کی طرح دیگر اکابرِ فن نے بھی ان کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کھلے دل اور خلوص کے ساتھ ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔

☆ بقول خواجہ احمد فاروقی: ''حقیقت یہ ہے کہ رضا علی وحشتؔ نے اپنی نغمہ سرائی اُس وقت شروع کی جب فضا حالیؔ کے ان اعتراضات سے گونج رہی تھی جو انہوں نے متاخرین شعراء یا یوں کہیے کہ لکھنوی غزل کہ بدترین پہلوؤں پر کئے تھے۔ اس نکتہ چینی نے دو مختلف ردِ عمل پیدا کئے۔ عظمت اللہ خاں نے غزل کی گردن بے تکلف مار دینے کا حکم صادر کیا اور رضا علی وحشتؔ نے قدیم غزل کی قوتِ حیات کا اعلان کیا۔ اور کوثر سے دُھلی ہوئی زبان میں دہلی کے رنگ کو پیش کر کے اس کے عام مضامین کو بھی، پہلے سے زیادہ اونچی کرسیوں پر بیٹھایا....'' (از خواجہ احمد فاروقی۔ مشمولہ وحشتؔ کی انفرادیت، روحِ ادب۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء، ص:۳۱)

☆ علامہ شبلیؔ نعمانی لکھتے ہیں: ''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں''
(ترانہ وحشتؔ، گرانقدر آراء، ص:۳)

☆ آل احمد سرور لکھتے ہیں: ''وحشتؔ استادِ فن ہیں فن کے لحاظ سے وحشت کا درجہ بلند''۔

☆ علامہ اقبالؔ بھی یوں رقم طراز ہیں: ''میں ایک عرصہ سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں آپ کا غائبانہ مداح ہوں۔ دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابلِ دار ہے۔ فارسی کلام آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے تو یہ بات کے کلام میں بدرجۂ اُتم موجود ہے۔''

(ترانہ وحشتؔ، گرانقدر آراء، ص:۶)

☆ حسرتؔ موہانی رقمطراز ہیں: ''مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ متوطن کلکتہ زمانۂ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعراء میں سے ہیں جن کے حسنِ کلام پر اُردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔'' (حسرت موہانی، مطبوعہ ماہنامہ اُردوئے معلیٰ، اپریل ۱۹۱۵ء)

☆ ظہیرؔ دہلوی نے لکھا: ''آپ کا کلامِ بلاغت نظام دیکھ کر بخدائے لایزال کسی شاعر کا کلام نظر میں نہیں جچتا غالبِ ثانی ہونے میں آپ کے کوئی کلام نہیں خدا کی قدرت ہے ایسے ایسے باکمال ہندوستان میں چھپے چھپے بیٹھے ہیں'' (ترانہ وحشتؔ، گرانقدر آراء، ص:۳)

ان اکابرِ فن کی آراء اس بات کی بین دلیل ہیں کہ کلامِ وحشتؔ کے ظاہری و باطنی دونوں اثرات کس قدر لوگوں کے دلوں پر مرتسم ہوئے ہیں۔ انہی باتوں کو دیکھتے ہوئے جہاں امام الشعراء، طوطیِ بنگال، ساحرِ بنگلہ، غالبِ دوراں، غالبِ ثانی، مولانا اور علامہ جیسے القاب سے ملقب ہوئے وہاں سرکار کی طرف سے ان کو خاں صاحب (۱۹۲۴ء) اور خان بہادر (۱۹۳۱ء) کے خطاب بھی حاصل ہوئے۔

وحشتؔ کلکتوی کی شاعرانہ عظمت سے قطع نظر ان کو بنگال کی سیاسی و سماجی حلقوں میں بھی ایک خاص مقام تھا۔ ان کی شخصیت ایسی اعلیٰ صلاحیتوں اور گوناگوں خوبیوں کی حامل تھی کہ بنگال کی سماجی زندگی میں ان کی بڑی اہمیت، وقعت اور عظمت تھی۔ کلکتہ اور نواحِ کلکتہ کے کالجوں اور اسکولوں میں تقسیمِ اسناد و انعامات کے لئے ان کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ان موقعوں پر ان کی تقریریں بڑی دلچسپ، عالمانہ اور مدبرانہ ہوتی تھیں۔ بڑے سے بڑے مشاعروں اور جلسوں میں ان کی بصیرت افروز اور دل پذیر تقریریں دلوں کو موہ لیتی تھی۔''

مری صبح کیا، مری شام کیا، نہیں فرق دونوں میں اک ذرا
مجھے انتظار سحر کا تھا وہی شب کی بات سحر میں ہے

جب اُردو غزل پر تنقید کے تیر برس رہے تھے، اس وقت ایک طرف حسرت موہانی نے اور دوسری طرف وحشتؔ کلکتوی نے غزل کی آبرو رکھ لی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں وہ مقام دیا جائے جس کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

R/O: RehmatAbad Rafiabad Baramulla
7889382310
Post Office: Chatloora Kashmir
Pin Code: 193301

● ڈاکٹر رقیہ نبی

ناول ''غدّار'' ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا ترجمان

ناول ہو یا افسانہ کرشن چندر کا نام دونوں ہی جگہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں اتنا وسیع سرمایہ چھوڑ رکھا ہے جو رہتی دنیا تک ان کو بقائے دوام بخشتا رہے گا۔ ان کے ناولوں میں سے ایک اپنی نوعیت کا منفرد ناول 'غدّار' ہے۔ جو انہوں نے تقسیم ہند سے تقریباً تیرہ برس بعد تخلیق کیا۔ یہ ناول تقسیم ہند کے بعد کی دردناک تصویر ہی پیش نہیں کرتا ہے بلکہ ہندو اور مسلمان طبقہ کے درمیان محبت، اخوت اور انسان دوستی کی کئی بہترین مثالیں بھی اس میں نظر آتی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد کے فسادات میں جہاں محبت اور انسانیت کے دیپ وقت کی آندھی نے بہت حد تک بجھا کے رکھ دیے، وہیں کرشن چندر کے غدار میں آپسی بھائی چارے اور ایثار و قربانی کے کئی خوبصورت مناظر آنکھوں اور دل کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ کرشن چندر خود بھی کہتے ہیں کہ:

''نفرت انسان کو انسان سے نہ ہونی چاہیے یہ اسے مجبور، بدکار، مفلس یا نادار بنا دیتی ہے۔'' آسمان روشن ہے۔ ص:109

ناول غدّار کی کہانی لالہ گاؤں سے شروع ہوتی ہے جہاں برہمنوں اور کھتریوں کی آبادی کثیر تعداد میں ہے اور سب سے کم آبادی مسلمان طبقے کی ہے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد غیر مسلم آبادی کو پاس والے علاقے کے فسادی وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے لالہ گاؤں کے نمبردار 'سر بلند' کے نام پیغام بھیجا جاتا ہے اور نمبردار کا بیٹا طفیل اس پیغام کے آتے ہی اپنے ہندو دوستوں اور ہمسایوں کے لیے تلملا اٹھتا ہے اور پیامی سے کہتا ہے کہ:

''ایک پیغام میرے باپ نے بھی تمہارے پیر قلندر کے نام دیا ہے۔
میرے باپ نے کہا ہے کہ یہ کام ہم سے نہ ہوگا۔ صدیوں سے ہم سب لوگ اسی
گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔'' غدار، ص9

اس طرح نمبردار سر بلند اور اس کا بیٹا طفیل اپنے ہندو بھائیوں کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتے ہیں اور فساد کی آگ کو لالہ گاؤں کی طرف نہ بڑھنے دینے کا عہد کرتے ہیں۔ گاؤں کی دیگر مسلم آبادی بھی سر بلند کے ساتھ کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ تعداد میں بھلے ہی کم ہیں لیکن پھر بھی کئی راتوں تک گاؤں کے باہر پہرہ داری

کرتے رہتے ہیں۔ فسادی جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، لالہ گاؤں کی ہندو آبادی دہشت زدہ ہوجاتی ہیں کہ اب کبھی بھی ہمارے جوان بیٹوں کو قتل کیا جائے گا اور ہماری ماں، بہن اور بیٹیوں کی عصمت تار تار ہوگی! تبھی گاؤں کا نمبردار ہندو مذہب کی ایک بوڑھی عورت کے پیر چھو کر آشرواد لیتے ہوئے کہتا ہے:

''اماں! ہم تیرے بیٹے ہیں۔ علی پور سیداں والے ہمارے جیتے جی اس
گاؤں کی بہو، بیٹیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔'' غدّار ص 11

یہاں پر نمبردار کا ایک ہندو عورت کے پیر چھونا اور اپنے ہندو بھائیوں کا محافظ بن کے کھڑا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان دوستی، آپسی بھائی چارہ اور ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرشن چندر کے نزدیک سب سے بڑا دھرم ہے۔ یہ ناول اس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہندو مسلم فرقے کے سبھی لوگ نفرت کی آگ میں جھلس نہیں رہے تھے، بلکہ کہیں کہیں پیار و محبت اور انسان دوستی کے چشمے بھی رواں دواں تھے۔

مذکورہ ناول میں جہاں ہندو اور مسلمان طبقے کے افراد کے درمیاں آپسی بھائی چارے کی اعلیٰ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں، وہیں دونوں ہی طبقات کو ایک دوسرے کے لیے اپنے عزیزوں کی قربانی دیتے ہوئے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں انسانیت کے علمبردار اشخاص انسانی تہذیب کی بقا کی ہر ممکن کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ مرکزی کردار ''بیج ناتھ'' جس کے اکثر دوست مسلمان فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ عزیز ''میاں جی'' رہتا ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میاں جی انسانیت کے رشتے کو سب سے بڑا رشتہ تصور کرتا ہے۔ وہ بیج ناتھ کے ساتھ جڑے اپنے انسانی رشتے کو فساد کی بھینٹ نہیں چڑھاتا۔ بیج ناتھ اور میاں جی دونوں کے فرقے سے وابستہ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں لیکن میاں جی انسانی تہذیب کا علمبردار، بیج ناتھ کو نہ صرف گھر میں پناہ دیتا ہے بلکہ اپنی ہی اولاد کی جان خطرے میں ڈال کر پنڈت بیج ناتھ کو بچالیتا ہے۔ میاں جی کی انسان دوستی کی ایک جھلک مندرجہ اقتباس میں دیکھی جاسکتی ہیں:

''میں اور میاں دونوں گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی اسٹیشن کے پورچ میں
آ کر رک گئی۔ میاں مجھے جلدی سے اندر لے لیا، تین سو روپے دے کر کہنے لگا۔ اب
تم فرسٹ کلاس کے مسافر خانے میں بیٹھو اور مجھے بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو میں
تمہیں ٹکٹ لا کے دیتا ہوں ۔۔۔۔تم یہاں نہیں رہ سکتے ۔۔۔تمہیں معلوم نہیں
ہے۔ رات کو میرے گھر غنڈے آئے ۔۔۔اور میں نے ان سے کہا کہ میں صبح کو
پنڈت کو تمہارے حوالے کردوں گا، زندہ یا مردہ۔ وہ مان گئے ۔۔۔مگر چلتے وقت
میرے دونوں بچے اپنے ساتھ لے گئے ۔۔۔طارق اور تسنیم ۔۔۔۔بطور

یرغمال۔۔۔۔'' (غدار، ص 24)

مندرجہ بالا اقتباس میں میاں جی ایک مثالی کردار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں، جو اپنے ہی لختِ جگر کو موت کے منہ میں چھوڑ کر دوست کی جان بچانے لگتا ہے۔ میاں جی مذہب کے نام پر کسی غیر مسلم کو قتل نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے خاندان کی سلامتی کے لیے دوسرے خاندان کے چشم و چراغ کو اجاڑنا نہیں چاہتا۔ اگر میاں جی یہاں پر پنڈت کو غنڈوں کے حوالے کردیتے تو شاید وہ اپنی انسانی تہذیب کو مٹانے کا خود ذمہ دار ہوتا۔ میاں جی کا کردار اگرچہ بہت کم مدت کے لیے منظر عام پر آتا ہے تاہم قاری کے ذہن پر دیرپا نقش چھوڑ جانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ میاں جی کے کردار کے تعلق سے اعجاز علی ارشد لکھتے ہیں:

''کرشن چندر نے یہاں انسانی فطرت کے اس ازلی اور ابدی عنصر کو گرفت
میں لینے کی کوشش کی ہے جو اسے انسان دوستی پہ آمادہ کرتا ہے، مل جل کر رہنا سکھاتا ہے
اور ایک دوسرے کی مدد پہ اکساتا ہے۔ یہ عنصر سکون اور اطمینان سے زندگی گزارنے کی
خواہش اور دردمندی کے ساتھ جینے کی تمنا سے عبارت ہے۔ یہ تمنا بیج ناتھ کے دل میں
شدت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ محبت بانٹنا چاہتا ہے اور پیار بانٹنا چاہتا ہے۔'' کرشن
چندر کی ناول نگاری: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ص: 95

بیج ناتھ غدار میں یقیناً پیار و محبت بانٹتا ہے۔ وہ ہمدرد، مہربان اور انسانیت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ وہ کسی طرح کے فساد میں شامل ہونا نہیں چاہتا اور اس کا فساد میں شامل نہ ہونا، بدلہ نہ لینا اسے اپنے ہی لوگوں میں غدّار کا خطاب دلواتا ہے اور جب وہ لاشوں کے بیچ ایک مسلمان بچے کو تنہا چیخ و پکار کرتے دیکھ لیتا ہے تو اسے اپنے سینے سے لگا کر اور ہندو پہرے دار کو چکما دے کر وہاں سے بھاگ نکلتا ہے اور اسی مسلمان بچے کو سینے سے لگائے کہتا ہے کہ وہ خود بھی زندہ رہے گا اور اس بچے کو بھی زندہ رکھے گا، چاہے صورتِ حال کیسی بھی ہو! البتہ اسے یہ یقین بھی ہے کہ انسان اگر اشرف المخلوقات ہے اور اس کی تہذیب اگر کوئی مقصد رکھتی ہے تو ایسا دن بھی ضرور آئے گا جب ہر انسان اپنی تمام تر خامیوں پر قابو پا کر آپسی بھائی چارے کو قائم کرتا ہوا انسانیت کی معراج کو چھولے گا۔ آج سے تقریباً 57 برس پہلے جب ہر طرف دہشت کا ماحول تھا، کرشن چندر نے غدّار ناول کے ذریعے انسانی تہذیب کو زندہ رکھنے کا بیڑا اٹھایا اور انسان دوستی کو ہر مذہب سے بالاتر رکھنے کا درس دیا، جو ہر دور کے انسان کے لیے مشعل راہ کا کام انجام دیتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Lecturer in Department of Urdu
University of Kashmir
South Campus Ananatnag 192101 Mob: 7006732673

اعتراف

● جگ موھن سنگھ

احمد صغیر کی ناول نگاری ''ایک بوند اُجالا'' کے آئینے میں

اکیسویں صدی اردو فکشن کی صدی ہے۔ اس صدی کے ابتداء سے ہی لگا تار اچھے ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اِن ناولوں میں ''مٹی کے حرم'' (ساجدہ زیدی، 2000ء)، ''آنکھ جو سوچتی ہے'' (کوثر مظہری، 2000ء)، ''اگر تُم لوٹ آئے'' (آچاریہ شوکت خلیل، 2003ء)، ''پار پارے'' (جوگندر پال، 2004ء)، ''اہنکار'' (نورالحسنین، 2005ء)، ''اندھیرا پگ'' (ثروت خان، 2005ء)، ''میں اور امراؤ جان ادا'' (عباس خاں، 2005ء)، ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' (صادقہ نواب سحر، 2008ء)، ''دویہ بانی'' (غضنفر)، ''فرات'' اور ''اماؤس میں خواب'' (حسین الحق، 2017ء)، ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' (2015ء) اور ''شکست کی آواز'' (عبدالصمد، 2015ء)، ''پلیتہ'' (پیغام آفاقی، 2011ء) وغیرہ ناول کے ساتھ ہی ڈاکٹر احمد صغیر کے تین ناول ''جنگ جاری ہے'' (2002ء)، ''دروازہ ابھی بند ہے'' (2008ء) اور ''ایک بوند اُجالا'' (2013ء) شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سبھی ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم مانے جاتے ہیں۔

''جنگ جاری ہے'' احمد صغیر کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کے مرکز میں ہندوستان کی مسلم اقلیت کے مسائل ہیں۔ احمد صغیر نے اس ناول میں بابری مسجد کی مسماری کے بعد مسلم معاشرے میں پیدا ہونے والی نفسیات کا تجزیہ ناول کے واقعات اور کرداروں کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد صغیر افسانہ کی طرح ناول میں بھی بیانیہ (Narration) کے برتاؤ کا ایک پختہ اور بالیدہ شعور رکھتے ہیں۔ موجودہ ماحول میں مسلم معاشرہ کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنانا اور اس توازن اور تناسب کے ساتھ بیان کرنا کسی چیلنج سے کم نہیں۔ احمد صغیر سے پہلے حسین الحق، عبدالصمد، پیغام آفاقی اور غضنفر نے بھی ہندوستان کے مسلم اقلیت کے مسائل کو اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ''مکان'' پیغام آفاقی، ''دو گز زمین'' عبدالصمد اور ''فرات'' حسین الحق وغیرہ بے حد اہم ناول ہیں۔

احمد صغیر کا دوسرا ناول ''دروازہ ابھی بند ہے'' 2008ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ''دروازہ ابھی بند ہے'' میں احمد صغیر نے گجرات کے فسادات پر فوکس کیا ہے۔ اس ناول میں بھی احمد صغیر نے مسلم اقلیت کو ہی موضوع بنایا ہے لیکن ناول میں جذباتیت کم ہے اور بصیرت مندی زیادہ ہے۔ وہ مسلم اقلیت کے مسائل پر زیادہ توجہ تو دیتے ہے لیکن ان کے یہاں صرف شکوہ اور مایوسی ہی نہیں بلکہ اُمید کی کرنیں بھی ہے۔ بحیثیت مجموعی ناول ''دروازہ ابھی بند ہے'' میں احمد صغیر یہ تاثر دیتے ہیں کہ اپنے وطن میں ایسا ماحول پیدا ہو کہ فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں اور ملک اقتصادی طور پر مضبوط و مستحکم ہو۔

احمد صغیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں ہمیشہ عصر حاضر کے مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ عصری سماجی، تہذیبی و معاشی حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس لیے وہ اپنے ناولوں میں خاص طور پر نوجوان نسل کو درپیش سماجی اور معاشی مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ احمد صغیر کے ناول ''ایک بوند اُجالا'' کا موضوع بھی ملک کے معاشی نظام کی بدحالی ہے۔ اس ناول ''ایک بوند اُجالا'' میں احمد صغیر نے روزی روٹی کی تلاش میں بیرونی ممالک خصوصاً خلیجی ممالک کا رُخ کرنے والوں کے المیے کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش ناول ''ایک بوند اُجالا'' کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ناول ''ایک بوند اُجالا'' عرب ممالک میں روزی روٹی کی خاطر اپنے ملک، معاشرہ اور ماں باپ نیز اپنی شریک حیات سے خود اختیاری تنہائی اختیار کرنے کے عمل و ردعمل کے ذریعے خلق ہونے والے المیے کو پیش کرنے والا ایسا ناول ہے جو اس موضوع پر پیش تر لکھے گیے ناولوں میں اپنی خاص پہچان رکھتا ہے۔ احمد صغیر ہمیشہ مسائل کی کہانیوں پر توجہ دیتے ہیں ان کا یہ رویہ اس ناول کا بھی اہم سیاق بنا ہے۔'' (فلیپ، از ڈاکٹر مولا بخش صدر شعبہ اردو دیال سنگھ کالج دہلی، مشمولہ ناول ''ایک بوند اُجالا'' احمد صغیر)

اس ناول کی شروعات ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن کی سنگین ہوتی ہوئی صورت حال سے کیا ہے۔ ناول کی ابتداء ناول کے مرکزی کرداروں تبریز اور گلنار کے حوالے سے کرپشن کی تصویر کشی سے ہوتی ہے۔ تبریز ہاشمی ایک ٹی۔ وی اینکر ہے جو اپنی رپوٹوں میں حالاتِ حاضرہ کا بہت ہی غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کر کے روپوٹیں پیش کرتا ہے۔ گلنار سیاسیات میں ایم۔ اے کرنے والی یونیورسٹی کی طالبہ ہے اور تبریز ہاشمی کی بہت بڑی فین ہے۔ گلنار تبریز ہاشمی کی کسی بھی رپورٹ کو مس نہیں کرتی۔ اس ناول کی ابتدا تبریز ہاشمی کے کرپشن سے متعلق ایک رپوٹینگ سے ہی ہوتی ہے۔ تبریز ہاشمی کہتا ہے:

''کرپشن یعنی بدعنوانی اور رشوت ستانی پر اس وقت پورے ملک میں گفتگو جاری ہے۔ ماضی میں بھی ہو رہی تھی اور مستقبل میں بھی ہوتی رہے گی۔ 2G اسپیکٹرم گھوٹالہ ملک کے سبھی گھوٹالوں کی ماں ہے تو ملک میں کوئلہ Allotment کے نام پر تقریباً اٹھائیس لاکھ کروڑ روپئے کی لوٹ گھوٹالوں کا باپ ہے۔ یہ گھوٹالہ وزیر اعظم منموہن سنگھ کے دورِ اقتدار میں ہی نہیں ہوا۔ انہی کی وزارت میں ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ دولت مشترکہ کھیلوں میں بھی گھوٹالے کی کالی پرچھائیں نظر آئی۔ کرپشن کے پہلو سے ملک میں جو تشویشناک صورتحال ہے اس پر انا ہزارے جیسے حضرات سرکار اور اہل وطن کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے ہیں لیکن یہ مرض اتنا مہلک اور سماج کے رگ و پے میں ایسا سرایت کیے ہوئے ہے کہ کسی بھی عام علاج سے اس کا خاتمہ آسان نہیں ہو تو آخر اس کا حل کیا ہے یہ تو آپ کو سوچنا ہے۔''

(ناول ایک بوند اُجالا، احمد صغیر، ص 10 عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی)

احمد صغیر نے یہاں رشوت خوری اور بدعنوانی کے لیے موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ احمد صغیر نے یہ تاثر دیا ہے کہ بدعنوانی اور رشوت خوری کے لیے اربابِ اقتدار ذمہ دار ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کرپشن ہندوستانی عوام کی فطرت میں داخل ہو چکی ہے۔ گلنار تبریز ہاشمی کے تبصرے کی حمایت کرتے ہوئے اپنے والد عبدالرحمٰن سے کہتی ہے:

''انہوں نے بالکل واضح انداز میں بتایا کہ کرپشن ہندوستانی عوام کے رگ وریشے میں پیوست ہے۔ جب کوئی بچہ امتحان دینے جاتا ہے تو اس کا باپ بولتا ہے پاس ہو گئے تو گھڑی دلا دیں گے اور فیل ہو گئے تو چھڑی سے پٹو گے۔ یہ کرپشن نہیں تو اور کیا ہے۔'' (ایضاً ص 12)

گلنار کے والد بھی کہتے ہیں:

''جس طرح بڑے پیمانے پر سرکاری خزانے کو چند آدمی اپنی تجوری میں بند کر رہے ہیں۔ اس کے خلاف تو کاروائی ہونی چاہیے۔'' (ایضاً ص 12)

اسی مقام پر احمد صغیر نے اسلامی تاریخ سے کرتے ہوئے امیر المومنین، حضرت عمر اور خلیفہ، عمر بن عبدالعزیز کے دور کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کس طرح یہ حکمران اپنے وقت کے حاکم ہوتے ہوئے بھی ایمانداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ احمد صغیر نے ایک واقع یہ لکھا ہے کہ:

''حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سرکاری کام میں مشغول تھے کہ بیت المال کی امانت کے طور پر رکھے ہوئے سیب کے ڈھیر میں سے ان کے چھوٹے سے معصوم بیٹے نے ایک سیب اٹھالیا۔ خلیفہ نے بیٹے کے ہاتھ سے سیب لے کر امانت میں ڈال دیا تو بچہ روتے ہوئے گھر چلا گیا۔ کام ختم کر کے جب وہ خود گھر پہنچے تو بیوی نے شکایت کی کہ آپ نے بیٹے کے ہاتھ سے سیب چھین لیا اور وہ خالی ہاتھ روتے ہوئے واپس آ گیا۔ خلیفۂ وقت نے کیا کہ وہ سب بیت المال کی امانت تھی (اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں) بیٹے کو سیب چاہئے تو میں اپنے پیسے سے بازار سے لا دیتا ہوں۔'' (ایضاً ص 13-14)

اسی طرح کے واقعات پیش کرتے ہوئے احمد صغیر نے شعوری اور لاشعوری طور پر کردار سازی پر زور دیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ اگر حکمران خود کرپٹ ہوں گے تو رعایا بھی کرپٹ ہوگی۔

دراصل اسی ناول کے شروع میں ہی احمد صغیر نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس ناول کے سبھی کردار متوسط طبقہ کے عام کردار ضرور ہیں لیکن یہ سبھی کردار ایمانداری اور حق پرستی پر یقین رکھنے والے کردار ہیں۔ اس ناول کا مکانی پس منظر دہلی کا ہے۔ تبریز ہاشمی اپنی بیوہ ماں عصمت بانو کے ساتھ دہلی میں رہتا ہے۔ ناول کی ہیروئن گلنار بھی اپنے والد عبدالرحمٰن کے ساتھ دہلی میں ہی رہتی ہے۔ عبدالرحمٰن دہلی کے جامعہ میں اسکول ٹیچر ہے۔ ان کی تین اور بھی بیٹیاں ہیں۔ شازیہ، شامہ اور شائیکا۔ گلنار کا کوئی بھائی نہیں ہے۔

ناول کی کہانی اُس وقت آگے بڑھتی ہے جب اچانک گلنار اور تبریز ہاشمی کی ملاقات ہو جاتی ہے اور پھر دونوں کی دوستی بڑھتی جاتی ہے۔ دونوں ہی کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار کے انکور پھوٹنے لگتے ہیں لیکن اچانک ہی گلنار کے لیے عرب ممالک میں کام کرنے والے ایک شخص آفاق سے شادی ہو جاتی ہے۔ شروع میں گلنار کنفیوژن کا شکار رہتی ہے کہ وہ آفاق سے شادی کرے یا نہیں لیکن جیسا کہ عام طور پر مسلم سماج میں ہوتا ہے۔ لوگ، دوست، احباب، گلنار کے والد عبدالرحمٰن کو یہ کہہ کر گلنار کی شادی کے لیے رضامند کر لیتے ہیں کہ لڑکا عرب ممالک برسرِ روزگار ہے اور اچھا خاصا کماتا ہے۔ عبدالرحمٰن بھی یہ سوچتے ہیں کہ میری چار بیٹیاں ہیں اگر بڑی بیٹی کی شادی ہو جائے گی تو ایک بوجھ اُتر جائے گا۔ گلنار بھی آخر کار آفاق سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ آفاق گلنار کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا ہے لیکن آفاق چونکہ شادی کرنے کے لیے ایک مہینہ کی چھٹی پر دہلی آیا تھا۔ اسی لیے شادی کے پندرہ دنوں کے بعد ہی وہ دبئی واپس چلا جاتا ہے۔ آفاق کے جانے کے بعد گلنار تنہا ہو جاتی ہے اُسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ آفاق دوبئی جانے

کے بعد اپنی کمپنی کے ساتھ چار سال کا Agreement کر لیتا ہے اور آفاق شاذیہ کو لکھتا ہے کہ چار سال تک اُسے چھٹی نہیں مِل سکتی۔ گلنار یہ سُن کر سخت مایوس ہوتی ہے اور اُداس اور غمگین رہنے لگتی ہے۔ اس کی راتیں سسکیاں لیتے گزرنے لگتی ہیں۔ گلنار کی بہنیں اُس کی حالت دیکھ کر فکرمند ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنے والد عبدالرحمٰن صاحب سے گلنار کی بگڑتی ہوئی صحت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ گلنار Depression کا شکار ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی آپی کو کھو دیں تو والد عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ:

''بیٹی تم لوگ کیسی باتیں کر رہی ہو، اتنا اچھا گھر ہے، اتنے اچھے لوگ ہیں۔ دولت کی فراوانی ہے اور کیا چاہئے ایک لڑکی کو۔'' (ایضاً ص 115)

وقت گُزرتا جاتا ہے اور گلنار تنہائی کی زندگی جیتے جیتے تھک جاتی ہے۔ آفاق گلنار کو فون کرتا ہے لیکن آفاق یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ گلنار بہت زیادہ پریشان ہے۔ اس دوران گلنار کو تبریز ہاشمی کی بہت یاد آتی ہے۔ خود گلنار بھی تبریز ہاشمی اور اس کی والدہ عصمت بانو ملتی جلتی رہتی ہے۔ اس دوران گلنار کی چھوٹی بہن شاذیہ کی شادی ایک نوجوان تاریک کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ شاذیہ خوش ہے لیکن گلنار خود بے حد اُداس ہے۔ شاذیہ کی شادی میں تبریز ہاشمی بہت مدد کرتا ہے اور شاذیہ کی شادی بڑی سادگی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس دوران آفاق گلنار کو بار بار فون کرتا ہے لیکن گلنار اب آفاق سے بات کرنے سے کترانے لگتی ہے۔ آفاق اور اس کے گھر والے بھی گلنار کے اس بدلتے ہوئے رویے کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اب تک گلنار کی بہنوں اور ان کے والد کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ آفاق کے چار سال کے Agreement پر دبئی میں ہی رُکے رہنے کی وجہ سے گلنار کتنی پریشان ہو رہی ہے۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ:

''گلنار کی شادی میں نے ضرورت سے زیادہ جلدی کی لیکن میں نے نہیں سوچا تھا کہ یہ صورتحال سامنے آئے گی۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ گلف میں نوکری کرنے والے لڑکے کے ساتھ شادی ہرگز نہ کرے..... عبدالرحمٰن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔'' (ایضاً ص 203)

اسی دوران احمد صغیر نے اس ناول کے ہیرو تبریز ہاشمی کی ایک ملک میں پھیلی ہوئی دہشت گردی، عورتوں کی عصمت دری اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے متعلق تبریز ہاشمی کے ریپوٹوں کے حوالے سے اعداد وشمار بھی ناول میں درج کیے ہیں۔ یہ ریپوٹیں خیالی نہیں حقیقی ہیں، اسی اعتبار سے احمد صغیر نے اپنے ناول میں قرۃ العین حیدر کی طرح جگہ جگہ Documentation سے کام لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تخیل اور تصور کے ساتھ ساتھ دستاویزی حقائق کو بھی اپنے ناولوں میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے

کہ احمد صغیر نے یہ سارے دستاویزات حاصل کرنے کے لیے شعوری کوشش کی ہوگی۔ صرف ایک مثال سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ احمد صغیر کے اس ناول ''ایک بوند اُجالا'' کا یہ دستاویزی اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر اعداد وشمار کی روشنی میں یہ بات کریں تو ساؤتھ ایشیا ٹیررسٹ پورٹل کے مطابق 1994ء سے 3/مارچ 2013ء تک ہندوستان میں دہشت گردانہ حملوں میں 62260 ہلاکتیں دیکھی ہیں جن میں 29224 دہشت گرد 23829 عام شہری اور 9207 سیکورٹی پولس اہلکار شامل ہیں۔ رواں سال کے دو ماہ میں ہی 130 سے زائد لوگ اس ناسور کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔'' (ایضاً ص 124)

اس ناول میں احمد صغیر نے اپنے سبھی کرداروں کو ایک معیار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کسی بھی کردار کا رویہ منفی نہیں ہے۔ آفاق کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی گلنار کی بہن شاذیہ کی شادی میں نہیں جا سکا۔ آفاق کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ گلنار کا کوئی بھائی نہیں۔ اس نے شادی کی تیار کیسے کی ہوگی؟ آج مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ آفاق ایک طرح سے احساس جرم کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہتا ہے:

''میں ایک ایسا پرندہ ہوں جو نوکری کے نام پر قید کر دیا گیا ہوں۔ اپنی خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کا گلا گھونٹ رہا ہوں۔ میری بیوی مجھ سے ناراض ہے کہ میں اس کے پاس نہیں ہوں۔ وہ ادھر اپنی خواہشوں کی بلی چڑھا رہی ہے اسی لئے اس کا مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر ہندوستان میں ہوتا تو ضرور کچھ کرتا۔'' (ایضاً ص 188)

اِدھر آفاق اپنی بہن مہر کا رشتہ دبئی میں ہی کام کرنے والے اپنے دوست شائید سے کرنے کی بات چھیڑتا۔ لیکن مہر یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ

''مجھے یہ رشتہ قطعی منظور نہیں۔ میں گلف میں نوکری کرنے والے لڑکے کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔'' (ایضاً ص 216)

مہر دلیل کے طور پر کہتی ہے کہ:

''میں بھابی کو جس حال میں دیکھ رہی ہوں اور وہ جو زندگی جی رہی ہیں۔ میں ویسی بیوگی کی زندگی نہیں جینا چاہتی۔ میں ہندوستان میں چائے بیچنے والے لڑکے سے شادی کر سکتی ہوں لیکن وہاں کے ڈاکٹر، انجینئر یا کسی بڑے عہدے

پر کام کرنے والے لڑکے سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ ایک لڑکی کو صرف دولت نہیں چاہئے اور بھی بہت کچھ چاہئے جو غیر ممالک میں نوکری کرنے والا لڑکا نہیں دے سکتا۔'' (ایضاً ص 217)

دراصل مہر کا یہ ردِعمل آج کی لڑکیوں کی سوچ کا آئینہ دار ہیں۔ پہلے لڑکیاں اور ان کے والدین بھی خلیجی ممالک میں شادی کرنے کو ترجیح دیتی تھی لیکن اب یہ احساس جاگ گیا ہے کہ اپنے وطن، اپنی زمین سے وابستہ رہنے میں ہی سب کی عافیت ہے۔ اس دور میں گھر کا سکون اور ہنسی خوشی کا اطمینان بخش ماحول سب سے بڑی دولت ہے۔

خلیجی ممالک میں کام کرنے والے لڑکے سے شادی کرنے سے انکار کا یہ منظر احمد صغیر کے ناول ''ایک بوند اُجالا'' کے مرکزی خیال کی تائید کرتا ہے۔ احمد صغیر بھی اپنے ناول میں یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ غیر ممالک ملازمت کے لیے جانا کسی تعلیم یافتہ فرد کی مجبوری ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے ذمہ دار موجودہ سیاسی اور سماجی نظام بھی ہے۔ اگر ملک کا معاشی نظام ایسا ہو کہ ہر شخص کو ملازمت و روزگار مل سکے تو کوئی بھی شخص اپنا گھر بار، ماں بہن اور بیوی کو چھوڑ کر دوسرے ملک جانا پسند نہیں کرے گا۔ خلیجی ممالک میں جا کر کام کرنے والوں کی کیا حالت ہوتی ہے اس کا اظہار احمد صغیر نے بڑے ہی پُر تاثیر انداز میں آفاق کی زبانی اس طرح کیا ہے:

''وطن کی دھرتی سے دور ہم بے وطن لوگ شکم کی آگ بجھانے کے لئے مجبور ہو کر صحرا کی وسعتوں میں ہر روز کھو جاتے ہیں۔ نہ میرے طوق میں زنجیریں ہیں نہ پاؤں میں بیڑیاں ہیں پھر بھی قید کی زندگی جی رہا ہوں۔ یہاں تو بس جھلستے صحرا کی وسعتوں میں سروں پہ آگ اگلتا سورج ہے۔ قدم قدم پر ریت کے سلگتے راستے ہیں۔ نہ کہیں گھنیرے درختوں کے سائے ہیں نہ کہیں پھولوں کی خوشبو ہے نہ سبزہ زار ہے نہ گلشن۔ نہ سکونِ زندگی ہے نہ راحت قلب..... بس رات دن روپیہ اُگانے میں منہمک ہوں اور ہر مہینے اپنی ہتھیلی پر ایک موٹی رقم دیکھ کر خوش ہو لیتا ہوں کہ کل جب وطن لوٹوں گا تو اپنی ساری خوشی، سارا آرام، سارا سکون ان روپیوں سے حاصل کر لوں گا۔'' (ایضاً ص 241)

احمد صغیر نے اس ناول میں آج کی روشن خیال عورت کی منطقی سوچ اور فکر کو بھی واضح طور پر نمایاں کیا ہے۔ گلنار جب نوکری کرنے کا اور آفاق سے طلاق لے کے تبریز ہاشمی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو آفاق کہتا ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں اور بغیر میری مرضی کے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے جواب

میں گلنار کہتی ہے کہ:

''آج کی عورت غلام نہیں ہے۔ شادی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی خود مختاری ختم ہو گئی۔ شادی ایک معاہدہ ہوتا ہے شوہر اور بیوی کے درمیان..... کیا آپ نے Agreement کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا..... کیا آپ نے میرے جذبات کی فکر کی تھی..... کیا آپ نے میری اُداسی کو کبھی محسوس کیا..... کیا آپ نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں تنہا اپنی زندگی کیسے گزار رہی ہوں۔ مجھ پر کیا گزر رہی ہے..... نہیں..... تو پھر میں کسی کی فکر کیوں کروں۔ اس لیے مجھے جو اچھا لگا وہی کیا۔'' (ایضاً ص 237)

آخر کار آفاق کی سمجھ میں بھی بات آ جاتی ہے اور وہ گلنار کو طلاق دے کر آزاد کر دیتا ہے۔

اسی طرح ناول کی کہانی ختم ہو جاتی ہے اور احمد صغیر قاری پر یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اصل خوشی دولت میں نہیں ماں، بہن بیوی کی محبت میں ہے۔ خلیجی ممالک میں جا کر آدمی دولت تو حاصل کر سکتا ہے لیکن پیار و محبت، قلبی سکون اور ذہنی اطمینان سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی احمد صغیر کے ناول کا مرکزی خیال ہے اور یہی عصر حاضر کے اس معتبر فکشن نگار فن کے حوالے سے اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک قابل عمل پیغام بھی ہے۔ ناول ایک بوند اجالا میں احمد صغیر نے روزگار کی تلاش میں عرب ممالک جانے والے طالب یافتہ نوجوانوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ احمد صغیر یہ تاثر دیتے ہیں کہ اپنے وطن میں ایسا ماحول پیدا ہو کہ فرقہ وارانہ فساد نہ ہوں اور ملک کی اقتصادی طور پر اتنا مضبوط و مستحکم ہو کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو گھر سے بے گھر ہو کر دیار غیر میں روزگار کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔ دراصل احمد صغیر کا ناول ''ایک بوند اجالا'' ہر مذہب اور مسلک کے سنجیدہ افراد کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ بڑی فن کاری کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کہانی کے بیانیہ میں بھی کوئی بے رُکتی نہیں ہے۔ اس ناول کی ایک نمایاں خصوصیت فنی اعتبار سے یہ ہے کہ احمد صغیر نے جگہ جگہ کرداروں کی خود کلامی سے ناول کی کہانی اور بیانیہ بہت درجہ پر کشش بنا دیا ہے۔ اسی طرح اپنے کرداروں کی دلی کیفیات کو نمایاں کرنے کے لیے اکثر جگہوں پر نظموں کا استعمال بھی کیا ہے۔ یہ نظمیں بھی خود احمد صغیر کی ہمہ جہت تخلیقات کی پیداوار ہیں۔

زبان کے معاملے میں احمد صغیر روشن خیال میں ناول میں کئی جگہ ہندی اور مقامی روزمرہ کی بول چال کے الفاظ بھی لائے گئے ہیں جو ناول کے بیانیہ کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ احمد صغیر نے تبریز ہاشمی اور گلنار کی ملاقاتوں کے جو مناظر پیش کیے ہیں وہ حد درجہ فطری ہیں۔ اس ناول میں جو منظر نگاری کی گئی ہے۔ کرداروں کی سوچ و فکر کے بہاؤ کا نتیجہ ہے۔ اس طرح جگہ جگہ احمد صغیر کے بیانیہ کا رشتہ شعور کی رو کی تکنیک سے بھی جڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ احمد صغیر کے اس ناول کا اسلوب ان کے دوسرے ناولوں کی طرح

طرح سادہ اور عام فہم ہے۔ کہیں کہیں جہاں انھوں نے کرداروں کی جذبات نگاری کی ہے اور ان کی دلی کیفیایات کے اظہار کے لیے نظموں کا سہارا لیا ہے وہاں ان کے اسلوب میں اشاراتی استعاراتی طرزِ بیان بھی نمایاں ہوگیا۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گلنار کو لگتا ہے وقت کہیں گُم ہوگیا ہے۔ فکر مندیاں بیکراں سمندر کی طرح ڈوبتی ابھرتی ہیں۔ اس نے کھڑکی کھول کر سڑک کی طرف دیکھا باہر روشنیوں کا میلہ لگا ہے۔ سڑکیں جاگ رہی ہیں، ہر کچھ روشن ہے، خوش ہر شے سے پھوٹ رہی ہے مگر گلنار رات بھر پریشان رہی کہ شادی کے لئے روپیہ کہاں سے فراہم کیا جائے۔''

(ناول ایک بوند اُجالا، احمد صغیر، ص 151)

غرض یہ کہ احمد صغیر کا ناول ''ایک بوند اُجالا'' ان کے فکر وفن کا اہم نمونہ ہے اور بحیثیت ناول نگار احمد صغیر کو ایک کامیاب فن کار ثابت کرتا ہے۔ بحیثیت مجموعی معاصر ناول نگاروں حسین الحق، عبدالصمد، غضنفر اور نورالحسنین کے بعد کی نسل سے تعلق رکھنے والے نگار احمد صغیر نے اپنے اس ناول ''ایک بوند اُجالا'' کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس دور کے ایک اہم ناول نگار ہیں اور معاصر ناول کے کسی بھی مطالعہ میں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

S/o Shri Vilayat Singh
Cambridge Internation School Purkhoo Camp (Domana)
Jammu 181123 Mob: 8082944191, 7889762542

نام کتاب: روشن دان میں اندھیرا صنف: افسانے مصنف: یوسف عزیز زاہد سن اشاعت: ۲۰۱۳ء صفحات: ۱۸۰ قیمت: ۳۰۰ روپئے رابطہ: Moon Cottage,Al-Khair Street,Gulbahar No:4,Peshawar(Pakistan) Phone:0345-9103005	نام کتاب: آٹھ آنے کی مٹھاس صنف: افسانہ مصنف: عباس خاں سن اشاعت: ۲۰۱۳ء صفحات: ۱۵۴ قیمت: ۱۵۰/روپئے رابطہ: 57-Ghulam Abbas Khan Street, Garden Town, Sher Shah Road, Multan Punjab (Pakistan)

- **خصوصی مطالعہ**
- **خلیل مامون**

تجرید سے پرے ایک نیا قدم.....ہجور آما

عہدِ حاضر میں ہندوستان ہی نہیں، عالمی سطح پر بھی ناول پر ایک عجیب سی دھند چھائی ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال موجودہ ٹیکنالوجی کی پیدا کردہ ہے۔ انسانوں کو اب سوچنے سمجھنے کا یہاں تک کہ جینے کا بھی وقت میسر نہیں ہے۔ اگر کوئی پڑھتا بھی ہے تو وقت گزاری کے لیے۔ اس میں کسی سنجیدہ جذبے کا کوئی عمل دخل نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ہیں جو ادب لکھ رہے ہیں اور کسی حد تک پڑھ بھی رہے ہیں۔ ایسے لوگ ہماری بے انتہا داد کے مستحق ہیں۔ اور اردو جیسی پسماندہ زبان میں کسی سنجیدہ نثری تحریر کے لیے قلم اٹھانا اور بھی مشکل کام ہے۔ شاعری کی بات الگ ہے۔ شاعری کے لیے موزونیت ضروری ہے۔ اگر کسی کے پاس موزنیت ہے اور وہ شاعری کا تھوڑا بہت علم بھی رکھتا ہو تو اس کے لیے باقی راستے اپنے آپ بنتے چلے جاتے ہیں، جب کہ میرا یہ ماننا ہے کہ اچھا فکشن / ناول لکھنے کے لیے ادیب کو بڑی سوجھ بوجھ درکار ہے۔ تخیلات، تجربات اور مشاہدات کے علاوہ نظم وضبط کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بڑا صبر آزما کام ہے۔ لہٰذا یہ کام ہر کسی کے بس کا نہیں۔ واقعات کو ایک خاص ترتیب میں اس طرح سجانا کہ وہ فطری لگے اور پڑھنے والا پوری انہماک کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہو جائے کوئی معمولی کام نہیں۔ ناول میں تو یہ کام اور بھی جوکھم والا ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑا کام تو پلاٹ کی تشکیل ہے اور یہی اچھے ناول کی بنیاد بھی ہے۔ اس لیے ناول نگار کے لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے واقعات کو اپنے پلاٹ کا حصہ بنائے جو گذشتہ دور کے ناولوں سے مختلف اور نادر ہوں۔ نیز ہم عصر ناولوں میں بھی اسے امتیازی درجہ حاصل ہو۔ کیوں کہ ناول کا مطلب ہی تو Novelty (ندرت اور نیا پن) ہے۔ اگر ناول میں کوئی ندرت نہیں تو ہم اسے ناول نہیں کہہ سکتے۔ زبان کا استعمال بھی ایسا ہو کہ قاری ناول کی طرف کھنچا چلا جائے اور اس کی توجہ مستقل طور پر متن پر مرکوز ہو جائے۔ یعنی چار پانچ سطور پڑھ کر اگر کوئی شخص پورا ناول پڑھنے کا تہیہ کر لے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ناول کامیاب ہے۔ اس لحاظ سے شبیر احمد کا ناول 'ہجور آما' ایک کامیاب ناول ہے۔ اردو والوں کے لیے یہ نادر اور انوکھا بھی ہے۔ اس کے تھیم اور واقعات عام ناولوں سے ہٹ کر ہیں۔ نیز اس کے زبان وبیان کے سحر سے قاری چاہتے ہوئے بھی

خود کو نہیں بچا سکتا۔ اس اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب ناول ٹھہرتا ہے۔

ناول کو اکثر دو درجوں میں منقسم کیا جاتا رہا ہے۔ ایک مقبول عام ناول جو وقت گزاری کے لیے پڑھے جاتے ہیں، جس میں گلشن نندہ اور دت بھارتی کے ناول رکھے جاتے ہیں۔ دوسرا وہ ناول جس میں مصنف فرد اور سماج کے باطن کی سیر کراتا ہے۔ ایسے ناولوں میں زبان و بیان کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس میں تخلیقی نثر کو خاص دخل ہوتا ہے۔ ایسے نالوں میں طرح طرح کے تجربے بھی ہوتے رہے ہیں۔ کبھی کسی خاص مقصد کے تحت کسی مخصوص نظریے کو ابھارا جاتا ہے تو کبھی انسانی نفسیات کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے، کبھی تاریخ کے اوراق سے کسی معروف شخصیت کو اٹھا کر فکشن کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے اور کبھی سماج کا کریہہ چہرہ دکھایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس قسم کے ناول مصنف سے انتہا درجے کی فن کاری اور عمیق درجے کے تجربوں کا متقاضی ہوتے ہیں۔

چیک ادیب میلان کندیرا نے اس حوالے سے ''L' Art Du Roman'' نام کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، جس کا The Art of Novel کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اس صنف کے متعلق بہت سی باریکیوں کا خلاصہ کرتی ہے۔ اردو کے ادیب اور قاری کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔ اس میں کندیرا نے سروانتیس، رابیلی، دیدرو، فلوبیر وغیرہ کی تخلیقات کے آئینہ میں یوروپی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یوروپی ناول کا موضوع زندگی کے کرداروں کو جاننے کا ٹھوس ذریعہ ہے۔ وہ مزید کہتا ہے، سروانتیس کے ناول کا جوہر مہم جوئی ہے، جب کہ بالزاک کو تاریخ میں انسان کی جڑوں کی تلاش ہے۔ دوسری طرف فلوبیر زمانے کی غیر معروفیت کے فراق میں ہے۔ ٹالسٹائے انسانی عادات کے غیر عقلی ہونے سے متحیر ہے۔ اپیل رکشش کے نقطۂ نظر سے میلان کندیرا نے ناول کو چار طبقات میں منقسم کیا ہے:

1) واقعیت کی کشش (The Appeal of Play)
2) خواب کی کشش (The Appeal of Dream)
3) فکر کی کشش (The Appeal of Thought)
4) وقت کی کشش (The Appeal of Time)

ان میں بالترتیب کرداروں کے باطن میں نفوذ، استعارات کا استعمال، نثریت یا پیروڈی، خوابوں کی تفسیر، فکری اور فلسفیانہ مضامین اور وقت کے اثرات آجاتے ہیں۔ میلان کندیرا نے وقت کے تعلق سے باطن میں مفارقاتی صورتِ حال کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں نے یہاں مفارقہ بہ معنی Paradox استعمال کیا ہے۔ اردو میں بہت کم ناول ہیں جو ان پیرامیٹرس پر کھرے اتر سکیں۔ ترقی پسندی کے دور میں تو چند ایسے ناول لکھے گئے ہیں جو ایک حد تک اس معیار کے قریب پہنچتے ہیں لیکن اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر

ناول ہمارے سامنے نہیں آتا۔ ویسے بھی شمس الرحمٰن فاروقی اور محمود ہاشمی نے شب خون کے ذریعہ تجریدیت کو فروغ دے کر اردو فکشن سے اس کا قاری چھین لیا۔ نتیجہ میں 'وہ' اور 'یہ' جیسے غیر مرئی کردار ابھر کر خلا میں منڈلانے لگے۔ یہ سب امریکی تجریدی ناول نگار William Burroughs کی بھونڈی نقالی میں کیا گیا۔ جس کے سبب اردو فکشن کا جنازہ نکل گیا۔ اور پھر شمس الرحمٰن فاروقی قرۃ العین حیدر کے 'آگ کے دریا' کے پیچھے پڑ گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بقول محمود ایاز جو کسی کا قول دہراتے تھے ''بٹیا ناول میں ڈرامہ بہت ڈال دیتی ہے۔'' مگر سرے سے اسے رد کر دینا بد دیانتی کی دلیل ہے۔ آگ کا دریا اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ہمارے عہد کا ایک بڑا ناول ہے۔ اس کے بعد سونے پر سہاگہ یہ کہ فاروقی نے پہلے سے موجود کسی سوانحی خاکہ کی بنیاد پر کڑی محنت اور بڑے چاؤ سے ایک ایسا ناول لکھا جسے دور بین اور دس بارہ لغات کی مدد سے بھی پڑھنا دشوار ہے۔ ان کا یہ ناول اول تو بہت بوجھل ہے پھر کوئی تاثر چھوڑنے میں بھی کامیاب نہیں۔ مندرجہ بالا حقائق کے پس منظر میں شبیر احمد کا ناول ''ہجور آما'' جدیدیت کی خمار آلودہ آنکھوں کو نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے کی طرح جگاتا ہے۔

ہجور آما کی سب سے بڑی خوبی اس کے بیانیہ کی روانی ہے جو کسی خاموش ندی کی طرح رواں دواں ہے۔ قاری اس کے دھارے میں بس بہتا چلا جاتا ہے۔ کہیں رکنے کو اس کا جی چاہتا ہی نہیں۔ تاہم شبیر احمد نے سرورق پر ایک فکشن نگار کا جو لیبل چسپاں کیا اس سے ناول کا استعجاب کسی حد تک کم ہو گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر سمیت کئی فکشن نگاروں نے ادب کو کئی ایسے نسوانی کردار دیئے ہیں جنہیں یاد رکھا جائے گا۔ اس اعتبار سے ہجور آما کے کردار کو لازوال قرار دینا مناسب نہیں لگتا۔

بودھ فلسفہ اور Albert Einstein کی Theory of Relativity ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ کائنات میں روایتی وقت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ عین اسی طرح اس ناول میں بھی اول تا آخر کہیں بھی وقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ پورا ناول انسانی کرداروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں واقعات کا تانا بانا بھی کرداروں کی ضروریات اور ان کے تعملات کی رہینِ منت ہے۔ یہ ایک طرح کا لاوقتی وجود ہے۔ اسی طرح اس میں مذہب اور خدا کے وجود کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ زندگی گویا ایک خودرو درخت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اور وہ درخت اگتا چلا جاتا ہے۔ پہاڑوں سے نکلا ہوا پانی کا ایک ریلا ہے جو بہتا جا رہا ہے۔ ایک روایت ہے جسے لوگ بس جی رہے ہیں۔ یہ صورت حال ناول میں فطری طور پر اجاگر ہوئی ہے اور یہی اس ناول کی کامیابی کی دلیل بھی ہے۔

ناول نگار نے ناول کے ہر باب کے شروع میں مختلف شعرا کا ایک ایک شعر دے رکھا ہے۔ ممکن ہے

اس شعر سے ان کی نظر میں اس باب پر روشنی پڑتی ہو۔ مگر مجھے کسی شعر سے کسی رمز کی آگہی نہیں ہوئی۔ میرے لیے ان کی شمولیت یا عدم شمولیت سے ناول کے ابواب پر کوئی اثر پڑتا نظر نہیں آتا۔ بہر حال اگر ان کی شمولیت سے ناول نگار کے دل کو تسکین ہوتی ہے تو یوں ہی سہی۔ ہاں مجھے جو بات اس ناول میں شدت سے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ شبیر احمد نے کسی اقلیدسی پیٹرن پر پلاٹ کے تانے بانے جوڑے ہیں، جو بے حد مربوط اور منضبط ہے۔ بالکل اس طرح کہ زندگی کے نقش پر کردار، واقعات، مکالمے، مناظر سب شطرنج کے مہروں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ناول نگار کا ذہن کامل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناول تخلیق کرتے وقت شبیر احمد کے ذہن میں صرف اور صرف انسان اور اس کی سرگرمیاں تھیں۔ زندگی، موت، تقدیر، سب کچھ اسی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے باہر کچھ نہیں۔ نہ کوئی غیر منطقی حادثہ، نہ کوئی سنجوگ، نہ کوئی ان دیکھی قوت اور نہ کوئی بے وجہ استعجاب! لیکن یہ صورت حال اچھی ہے یا بری، فطری ہے یا غیر فطری اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا آسان نہیں۔

شبیر احمد کے ناول کی زبان اور کیفیت بڑی رومانی ہیں۔ منظر نگاری اور جزیات نگاری بھی غضب کی ہیں۔ کہیں کہیں تو کیمرے کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شبیر احمد نے بنگال کے ترائی علاقے، دارجیلنگ کی پہاڑی اور مشرقی ہمالیہ کی وادیوں کی جیتی جاگتی زندگیوں کی ایک قاش تراش کر ہمارے سامنے رکھ دی ہو۔ تاہم کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اردو کے ایک نام نہاد فکشن نگار (نام لینا مناسب نہیں، اشارہ ہی کافی ہے) کی طرح شبیر احمد نے اپنی تحریر کو اسکرین پلے بنانے کی کوشش کی ہے۔ حالاں کہ وہ معروف نام نہاد فکشن نگار اسکرین پلے کا ڈھیر لگا لگا کر انھیں ناول قرار دیتا جا رہا ہے۔

'ہجور آما' یوں تو دیب لینا اور اس کے سنگھرش کی کہانی ہے، مگر اس خاتون کی زندگی کو دکھاتے دکھاتے ناول نگار بڑی چابک دستی سے اس کے اردگرد کی ساری کائنات کا منظر بھی دکھاتا چلا جاتا ہے۔ دارجیلنگ، سیلی گوڑی، کالمپونگ اور اس کے اطراف کی سیاسی رسا کشی، جغرافیائی مناظر، بھادی سماج کی خود عاید کردہ ذلت بھری زندگی، جنسی ہوس، شرافت کا بہروپ، خواب، تاریخی عوامل، نفسیاتی پیچ وخم وغیرہ، سب ایک ہی دھاگے میں پرو دیئے گئے ہیں۔ یہاں انصاف کرنے والا کوئی خدا نہیں ہے۔ ظلمت کی طرف کھینچنے والے کسی ابلیس کا بھی وجود نہیں۔ کہانی میں ڈھیروں کردار ہیں۔ کچھ بڑے، کچھ چھوٹے، کچھ پیچیدہ، کچھ سیدھے سادے! مرد، عورت، بوڑھے، بچے، امیر، غریب، ان پڑھ، تعلیم یافتہ، پہاڑی، میدانی! بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ دیب لینا، ارباز احمد، پروفیسر نظر امانوی، غزالہ، کانن بالا، سونم داجو، پھلوا، مانسی، سندھیا، ڈورجی، چندر ماما، ہر ایک کا الگ الگ روپ ہے۔ الگ الگ رنگ ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ناول نگار (راوی) ان کے بارے میں خود کچھ نہیں کہتا۔ ہر کردار اپنے عمل ہی سے، اپنے تشخص کا اظہار کر دیتا

ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ناول میں ایک کردار ایسا بھی ہے جو تقریباً ہر جگہ، ہر واقعہ میں موجود ہے، واضح طور پر نہیں، در پردہ۔ پردے کے پیچھے چھپا یہی کردار دراصل سب سے اہم کردار ہے جو اپنا کام بڑی خاموشی سے کر گزرتا ہے۔ ناول نگار نے شاید دانستہ طور اسے خاموش تماشائی بنائے رکھا ہے۔ میرا مطلب پرساشن (Establishment) سے ہے جو ہر جگہ چپکے سے اپنی چال چل دیتا ہے اور لوگ اس کے دام میں الجھ جاتے ہیں۔ جمہوری نظام میں پرساشن کا ایسا شاطرانہ کردار! جمہوریت کے لیے اس سے بڑا طنز اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی اہم چیز جس کی طرف ناول نگار نے انگشت نمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ آج کا انسان اس قدر بے حس ہو چکا ہے کہ ہزار کوششوں کے باوجود اپنی فطرت سے باز نہیں آتا۔ لہٰذا بھادی عورتوں کو جسم فروشی کے دلدل سے نکالنے کے لیے مہم چلائی جاتی ہے مگر بار بار وہ اسی دھندے کی طرف چل دیتی ہیں۔ ان کے مرد بھی اس کھیل میں پیچھے نہیں رہتے۔

سیاسی اور سماجی سطح پر تبدیلیاں لانے کی غرض سے وقتاً فوقتاً انسانوں نے مختلف قسم کی تحریکیں چلائی ہیں۔ کچھ تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں، تو کچھ کو ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑا ہے۔ اس ناول میں بھی الگ الگ وقت میں، الگ الگ مقام پر کئی تحریکیں چلتی ہیں۔ ایک تحریک ہمرو دیش (گورکھالینڈ) کی تحریک ہے، دوسری تحریک کمیونسٹوں کی ہے جو آٹو ٹومیشن کے خلاف مزدوروں کی حمایت میں چلائی جاتی ہے۔ یہ دونوں تحریکیں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ اسی طرح چائے کے باغات میں بھی مالکوں اور کارپوریٹ سیکٹر کے ذریعہ کیے گئے استحصال کے خلاف تحریک چلائی جاتی ہے۔ ناول نگار نے ان تحریکوں کے توسط سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں تبدیلیاں لانے اور انقلاب برپا کرنے کی کوششوں سے بالآخر عام آدمی کی زندگیوں میں تو کوئی مثبت بدلاؤ نہیں آتا الٹے ان تحریکوں کے نتیجے میں کمزور اور غریب افراد ہی پس جاتے ہیں اور مفاد پرست عناصر ہر طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں۔ اس نکتے کو اگر اور کھل کر ناول میں ابھارا جاتا تو بہت خوب ہوتا، مگر ناول کی ضرورت کے اعتبار سے جو ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ دارجلنگ کی پہاڑیوں میں خود مختاری کی جو تحریک چلائی جاتی ہے وہ اکثر مقام پر زراج کا شکار ہو جاتی ہے۔ شبیر احمد مغربی بنگال کے کمیونزم کو بھی اسی پس منظر میں دیکھتے ہیں اگر چہ اس کا اظہار ایک منجھے ہوئے ادیب کی طرح غیر راست طریقے سے ہی کرتے ہیں۔

ناول کا تانا بانا بڑی ہنرمندی سے بنا گیا ہے، پھر بھی کئی جگہوں پر کچھ نقائص رہ گئے ہیں۔ مثلاً دیب لینا کا بیٹا بن کر بصر کا پیدا ہونا اور اپنی محبوبہ کے ساتھ خوابوں کی تفتیش کے سلسلے میں بھادی گاؤں میں جانا، ارباز اور دیب لینا کے واقعات کا پنر جنم معلوم ہوتا ہے۔ یہ واقعات 1973 میں Max Ehrlich

کے لکھے گئے ناول The Reincarnation of Peter Proud کی یاد دلاتے ہیں جس پر 1975 میں ایک فلم بھی اسی نام سے بنی تھی۔ ایسے واقعات ادبی سطح پر ناول کو کمزور بناتے ہیں اور ناول عوامی خواہشات کے دھارے میں بہنے لگتا ہے۔ یہ مقبول عام ناول کے لیے تو مناسب ہو سکتے ہیں مگر ادبی ناولوں کے لیے نہیں۔ ایسی چیزیں رتو کھٹک کی ''مدھومتی'' جیسی فلمیں بنانے کے لیے تو کارگر ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن 'ہجور آما' جیسے ناولوں کے لیے شاید نہیں۔ تاہم یہ جھول قابلِ توجہ نہیں ہے۔ یہ کمزوری ناول کے کلی پس منظر میں ڈوب جاتی ہے۔ اس سے ناول کے مجموعی تاثرات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر بھی ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر اس امر سے بھی روگردانی نہیں کی جا سکتی کہ کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے یہ ایک تکنیکی ضرورت تھی۔ اس پر حتمی رائے دینا غیر ضروری ہی نہیں، ادبی بداخلاقی بھی قرار دیا جائے گا۔ یہ تخلیق کار کی آزادی ہے، کسی مکتب کا پرچہ نہیں۔ اس پر قدغن ٹھیک نہیں۔

سچ کہوں تو مجھے فرانز کافکا کا The Trial، ممتاز مفتی کا 'علی پور کا ایلی'، فلوبیر کا 'مادام بوویری' اور عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' پڑھتے وقت بھی اتنا ہی لطف آیا تھا جتنا شبیر احمد کے ناول 'ہجور آما' کو پڑھتے وقت آیا ہے۔ مگر میں کافکا کو پہلے اور ممتاز مفتی کو دوسرے نمبر پر رکھنا چاہوں گا۔ زبان، بیانیہ اور موضوعات کی بنیاد پر تیسرا نمبر شبیر احمد کا ہے۔ کیونکہ ان کا ناول ایک دھیمی لہر کی طرح چلتا ہے۔ اس میں بھی اتنی ہی کشش ہے جتنی پہلے اور دوسرے ناول میں۔ عبداللہ حسین کے ناول کا موضوع بہت وسیع ہے اس لیے کہیں کہیں وہ اس وسعت کو سنبھال نہیں پاتے۔ اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کہ 'اداس نسلیں' اپنے وقت کا ایک اہم ناول ہے۔ لیکن 'آگ کا دریا' کو میں اس عہد کا سب سے بڑا ناول مانتا ہوں۔ موضوعات کی وسعت اور خیالات کی گہرائی کے سبب قاری کو جگہ جگہ ٹھہر جانا پڑتا ہے، مگر اکثر مقام پر قرۃ العین حیدر ہنستی، بولتی، باتیں کرتی گزر جاتی ہیں۔

'ہجور آما' کا ایک اور پہلو دیب لینا اور سندھیا کے خواب ہیں جن کی تفتیش پہلے ارباز کرتا ہے، پھر اس کا بیٹا، بصر اور بصر کی محبوبہ، پریتا۔ ان کی تحقیق انہیں بھادی سماج تک لے جاتی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ناول نگار نے خواب کو ایک ٹول کی طرح استعمال کیا ہے۔ ٹائم لائن پر دیکھا جائے تو سب سے پہلا خواب چار دانت والے سفید ہاتھی کا ہے جسے دیب لینا پہلی بار اپنے طالب علمی کے زمانے میں دیکھتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی تفتیش و تحقیق کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن متن میں سب سے پہلے ہم جس خواب سے دوچار ہوتے ہیں وہ پہاڑ پر ہونے والے سیاسی انتشار سے متعلق ہے۔ دیب لینا اب عمر رسیدہ ہو چکی ہے۔ کھڑکی کے پاس بیٹھی شراب پیتی ہے۔ راکنگ چیئر پر ڈول رہی ہوتی ہے کہ خواب میں اسے بارش، دھند اور آگ کے شعلے ایک ساتھ دکھائی پڑتے ہیں۔ اس نے یہ خواب جاگتے ہوئے دیکھا

یا غنودگی کی حالت میں، اس کی وضاحت ناول نگار نے نہیں کی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نے مستقبل کا یہ منظر جاگنے کی حالت میں دیکھا ہے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کچھ لوگوں میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ مستقبل سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ میں اسے کشف یا الہام نہیں کہوں گا۔ خواب بھی نہیں کہوں گا۔ میں اسے فراست کہوں گا۔ فراست بھی ایک غیر معمولی قوت ہی ہے جس کے لیے بے انتہا تجربات و مشاہدات درکار ہوتے ہیں۔ صرف چند علامتوں کی آگاہی سے آدمی صحیح نتیجہ اخذ کر لیتا ہے۔ خصوصی طور پر وہ لوگوں جن کی جبلی قوت ادراک کو 'تہذیب' کے بھوت نے شل نہ کر دیا ہو۔ یہ باتیں قبائلیوں اور پہاڑیوں میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں میری خود کی زندگی سے ایک واقعہ اس بات کو تقویت پہنچائے گا۔ میرے آئی پی ایس کے ایک دوست رخوما پچھاو، میزو تھے۔ ایک بار میرے ساتھ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ناک سکیڑ کر کہنے لگے، ''بارش ہونے والی ہے!'' حالاں کہ مجھے بارش کے آثار نظر نہیں آئے تھے، مگر اس کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ناول کی Protagonist دیب لینا بھی تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں تپ تپ کر اپنے بال سفید کر چکی ہے۔ نیز اس کا تعلق بھی ایک قبیلہ سے ہے۔ لہٰذا وہ بھی اگر اپنی فراست سے پہاڑ پر آنے والی مصیبت کو بھانپ لیتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ دیب لینا مذکورہ بالا منظر غنودگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی، تب بھی ناول کے پلاٹ میں کسی قسم کا کوئی سقم نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے ناول نگار دیب لینا کے ذہن کی مابعد الطبیعاتی قوت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ 1976 کا ہے۔ جب میں بنگلور میں محمود ایاز کے روزنامہ سالار میں کام کرتا تھا۔ جس دن پولس میں میرے تقرر کی خبر اخبار میں نکلی تھی اس سے پہلے والی رات کو میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ محمود ایاز مجھے ایک پروانہ ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہہ رہے ہیں ''لو یہ ہے تمہارا تقرر نامہ۔'' ایسی قوتیں اکثر صوفی سنتوں اور پیمبروں کو وہبی طور پر اور ریاضت کے ذریعہ حاصل ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں ایسے خوابوں کو ایک طرح کے روحانی احساس کا نام دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم کی رو سے ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کسی نیک آدمی کا خواب پیمبری کا چالیسواں حصہ ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کبھی کبھی عام انسانوں کو بھی اس قسم کا الہام ہو جاتا ہے۔ میں یہاں اپنی زندگی سے کچھ اور واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ 1972 کی بات ہے۔ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اس وقت دلی میں تھا اور ریڈیو میں ملازم تھا۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ایک پھوپی زاد بھانجی جس کا نام ثروت تھا مر گئی ہے اور میں اپنے ایک سردار جی دوست کے ساتھ قبرستان میں اسے دفن کر رہا ہوں۔ میں نیند سے جاگ پڑا اور اپنی بیوی کو وہ خواب سنایا۔ اس نے کہا کہ یہ محض کوئی خیال خام ہوگا

۔ مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب کچھ دنوں بعد یہ اطلاع ملی کہ ویلورا سپتال میں کینسر کے سبب ثروت کا انتقال ہوگیا ہے۔ایک اور واقعہ سنئیے ۔میں نے 1972 میں ایک خاتون کو ایک خواب میں اپنے ساتھ بار میں بیٹھا دیکھا۔ وہ کوئی نظم سنا رہی تھی ۔ مجھے اس نظم کا پہلا مصرعہ اب تک یاد ہے:

ع رات نیزے کی طرح سینے میں پیوست ہوئی

جب کہ اس خاتون سے میری ملاقات 1986ء میں ہوئی اور میں نے اس کی انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ 'انیس للہی نظمیں' کے عنوان سے شائع کیا۔اس طرح کے اور بھی بہت سارے واقعات ہیں کہ جن کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔لیکن دیب لینا کے خوابوں میں کسی طرح کا کوئی روحانی عنصر نہیں ملتا ہے۔اربار اور بصر کی تحقیق بھی زیادہ گہری نظر نہیں آتی ۔ایسا لگتا ہے شبیر احمد نے واقعات کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے چار دانت والے سفید ہاتھی کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔مگر آگے چل کر یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ یہ خواب وہ خواب نہیں جو انسان کے لاشعور میں دبی خواہشات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو ایک طرح کا آرکی ٹائپ ہے۔یعنی ناول نگار جہاں ایک طرف سگمنڈ فرائیڈ کی ڈریم تھیوری کی نفی کرتا ہے تو وہیں دوسری طرف کارل یونگ کی آرکی ٹائپ کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔چار دانت والے سفید ہاتھی کا خواب دراصل ان خوابوں میں سے ہے جنھیں بھگوان مہاویر کی ماں ،تری شالا دیوی نے دیکھے تھے۔اس وقت چوبیسواں تیرتھنکر ماں کے پیٹ میں تھے۔دگمبر مکتب کے مطابق 16 خواب اور سویتمبر کے حساب سے 14 خواب دیکھے گئے۔ دیب لینا ان میں سے آٹھ خواب دیکھ چکی تھی ۔آٹھواں خواب کو لے کر جینولوجی کی پروفیسر ڈاکٹر پراجنا تذبذب میں پڑ جاتی ہے۔اس خواب کی تعبیر تک اس کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے اور وہ اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ ویسے بھی خواب کی تعبیر سمجھ پانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ خواب اکثر علامات اور نشانات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں،جس کی تشریح آسان نہیں۔ بابل کی تلمودی عہد میں (200.ق.م.) ایک یہودی ربی حسدا نے کہا تھا وہ خواب جس کی تشریح نہیں ہوئی ہو اس خط کی طرح ہے جسے پڑھا نہ گیا ہو۔اور چوں کہ ڈاکٹر پراجنا اس خط کو پڑھنے سے خود کو قاصر پاتی ہے،اسی لیے جھلاّ کر چلی جاتی ہے اور اس طرح مقدس خواب کا جو سلسلہ ہمارے سامنے نمایاں ہوتا رہا تھا ایک دم سے گم ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ شبیر احمد کی دلچسپی خوابوں کے تحلیل و تجزیہ کے بجائے کارل یونگ کی آرکی ٹائپ کو تمثیلی طور پر پیش کرنے میں ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔دیب لینا اور سندھیا کا تعلق بھادی سمودائے سے ہے۔ بھادیوں کے آباؤ اجداد ویشالی کے لچھوی قبیلہ سے تھے۔امر پالی اور تری شالا کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ دونوں ہی جو خواب دیکھتی ہیں ان کے ڈانڈے اسی لچھوی قبیلے سے جا ملتے

ہیں۔اور چوبیسویں تیرتھنکر کی ماں تری شالا دیوی کے خوابوں سے اسے جوڑ کر ناول نگار نے انھیں مذہب کا رنگ دینے کی سعی کی ہے۔ہم سبھی جانتے ہیں کہ چوبیسواں تیرتھنکر مہاویر جین مذہب کا بانی تھا۔اسلام میں بھی کچھ خوابوں کو ایک طرح کے روحانی احساس کا نام دیا گیا ہے۔ابن عربی، ابن سیرین اور ابن خلدون جیسے مفکروں نے خواب اور ان کی تعبیروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔اسی طرح انجیل میں فرعون کے اس خواب کا بیان ملتا ہے جس میں اس نے سات فربہ اور سات لاغر گایوں کو دیکھا تھا۔مگر ناول نگار نے خوابوں کو اس انداز میں بیان نہیں کیا جس سے ان کے مقدس ہونے کی دلیل حاصل ہو سکے۔محض تری شالا دیوی سے منسوب کر دینے سے کام نہیں بنتا۔انھیں خواب کو فکری اور معنوی سطح پر بھی اجاگر کرنا چاہیے تھا۔ہوسکتا ہے اس سے ناول کی ضخامت مزید بڑھ جاتی ۔غالباً اسی سے دامن بچانے کی غرض سے ناول نگار نے ایسا کیا ہو۔ویسے بھی ناول میں اس بات کا اشارہ بھی موجود ہے کہ وہ خوابوں کو مذہبی عقائد سے جوڑ کر دیکھنا نہیں چاہتے ،سماجی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ خواب کے متعلق یہ نظریہ عام ہے کہ خواب کا تعلق ہمارے لاشعور سے ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا لاشعور انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہوتا ہے۔یعنی ہمارے اجداد کے لاشعور کا بھی اس میں دخل ہے۔تو اس اعتبار سے کیا یہ ممکن نہیں کہ دیب لینا اور سندھیا کے لاشعور میں ہزاروں برس پرانے لچھوی قبیلے کا لاشعور بھی کارفرما ہو۔دوسرے لفظوں میں شبیر احمد فرائیڈ کے بجائے یونگ کے نظریے کو فوقیت دیتے ہیں۔ایسا کرتے ہوئے انھوں نے ناول میں سرسری طور پر ہی سہی خواب کے مختلف پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اس میں ان کا اصل مقصد کہانی کو آگے بڑھانا اور اس بہانے دیب لینا کے بیٹے کو ماں سے ملانا تھا اور یہ کام انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ قاری کی توجہ خواب کی طرف دوبارہ مبذول نہیں ہو پاتی۔ویسے بھی اگر ناول کا کوئی موڑ خصوصی طور پر اس امر کا متقاضی ہوتا تو شاید اس پر وہ مزید تفصیل سے لکھتے۔ بہر حال ناول کے فنی احتساب میں اس پہلو کو ذہن میں رکھنا اور اس کی تحسین بھی لازمی ہے۔

غرض یہ کہ شبیر احمد کا یہ ناول جدید اردو فکشن کی طرف ایک نیا قدم ہے۔ یہ ایک اہم اور بڑا ناول ہے۔ پھر بھی میں اسے شاہکار نہیں کہوں گا بلکہ شبیر احمد کے قلم سے آئندہ نکلنے والے شاہکار کا پیش خیمہ کہوں گا۔

◀◀ ● ▶▶

146/A-2, 1st Main, 4th Cross,
Bhuvaneshwari Nagar,
C.V.Raman Nagar Post, Bangalore-560093.
Mob. 9019211001

● ناول کا ایک باب

● شبیر احمد

ہجور آما

پیشوک سے تیستا بازار زیادہ دور نہیں ہے۔ادھر سے گذرتے وقت وہ اکثر کچھ دیر کے لیے یہاں رک جاتی ہے۔تفریح کی غرض سے کبھی کبھی ٹھہر بھی جاتی ہے۔اسے کونے والا یہ کمرا بہت پسند ہے۔مسہری کے دونوں طرف شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جن سے پہاڑوں کا حسن دیکھتے ہی بنتا ہے۔دائیں جانب پھولوں کا باغیچہ ہے اور بائیں صنوبر کے درخت،جن کی ٹہنیاں کھڑکی کے شیشے کو چھوتی رہتی ہیں۔وہ جب بھی ٹھہرتی ہے اسی کمرے میں ٹھہرتی ہے۔آج بھی اس نے ٹیکارام سے اسی کمرے کی فرمائش کی تھی۔

شام کا وقت تھا۔آسمان شفاف! بے کراں سمندر کی طرح دور تک نیلے آنچل پھیلائے ہوئے۔ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں افق کو ایسے چھو رہی تھیں جیسے سمندری جھاگ ساحل کو چھوا کرتے ہیں۔وادیوں سے دور گھنے جنگل کا سایہ برفیلی پہاڑ پر یوں پڑ رہا تھا جیسے نیلے آسمان کا کوئی ٹکڑا چھٹک کر آن گرا ہو۔سرسبز وادیوں میں چھوٹی چھوٹی رنگ برنگ کی عمارتیں ایسے کھڑی تھیں جیسے گھاس پر بچوں نے کھلونے سجا رکھے ہوں۔

کھڑکی کے دائیں پھولوں کا جو باغیچہ ہے آج اس میں پھول کچھ زیادہ ہی کھلے ہوئے تھے۔لال گلاب اور پیلے رنگ کے بڑے بڑے گیندا پھول ہری بھری ڈالیوں پر کھڑے خنداں تھے۔ہواؤں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔کچھ گلاب پر مستی چھائی تھی اور وہ جھوم جھوم کر گیندے کے پھول کو ایسے چھو رہے تھے جیسے عاشق کے لب معشوق کے رخسار کو چوما کرتے ہیں۔دیب لینا نے جب یہ منظر دیکھا تو اس کے جسم میں برق سی لہرا گئی۔اسے لگا،کوئی گرم مانوس ہونٹ اس کے گال پر ثبت ہو گئے ہیں،جس کی حرارت نس نس میں سما گئی ہے۔اس نے لجا کر نظریں دوسری سمت پھیر لیں۔اب اس کے سامنے صنوبر کا درخت تھا۔اسے یاد آیا،گذشتہ مہینے وہ اسی کمرے میں ٹھہری تھی۔اسی درخت پر اس نے ایک کٹھ پھوڑا دیکھا تھا،جو اپنی نوکیلی چونچ سے درخت کے تنے کو چھیدر ہا تھا۔شاید اسے ایک گھر کی تلاش تھی۔

دیب لینا نے دیکھا،ٹھیک اسی جگہ ایک چھوٹا سا گھونسلا ہے جس کے اندر ایک کٹھ پھوڑا بیٹھا ہے۔وہ مادہ کٹھ پھوڑا تھی جو پنکھ پھیلائے انڈے سے رہی تھی۔وہ سوچنے لگی،''کیا یہ وہی کٹھ پھوڑا ہے جسے اس نے ایک مہینے پہلے اسی جگہ اپنی بھاری نوکیلی چونچ سے یہ آشیانہ بناتے دیکھا تھا۔''اسے غور سے دیکھنے لگی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ وہ نہیں ہے۔اُس کے سر پر سرخ تاج تھا اور اِس سے کچھ زیادہ ہی شاندار دکھتا تھا۔تو کیا یہ اُس کٹھ پھوڑے کے گھر میں گھس آئی ہے یا وہ اِسی کے لیے یہ گھر بنا رہا تھا۔اور پھر اچانک غیبی طور پر ایک خیال اس کے ذہن میں در آیا اس کا چہرہ دمک اٹھا۔اُس کے اِس خیال کو تقویت اُس وقت پہنچی جب اُس نے دیکھا،ایک اور کٹھ پھوڑا چونچ میں جھینگر لیے وہاں آ بیٹھا ہے اور گھونسلے کے پاس پھدک رہا ہے۔پہلے تو وہ مسکرائی۔لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا دل بھر آیا۔چہرے پر اداسی چھا گئی۔اس کٹھ پھوڑے کے سر پر سرخ تاج جو تھا۔

وہ سوچنے لگی،''میں نے بھی تو ایسا ہی سوچا تھا۔اپنا ایک گھر!ایک سنہرا آشیانہ!! کیسے کیسے سپنے سجائے تھے میں نے۔لیکن اُس نے ایک ہی جھٹکے میں سارے سپنے چکنا چور کر دیے۔''مگر ادھر کئی دنوں سے اسے اپنے کیے پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔اس قدر جذباتی ہو کر اُس سے نہیں الجھنا چاہیے تھا۔ٹھنڈے دل سے سمجھانا چاہیے تھا۔منطقی انداز میں اُس کی باتوں کو کاٹنا چاہیے تھا۔محبت سے تو بڑے سے بڑے ظالم کا بھی دل جیتا جا سکتا ہے۔مگر وہ تو ظالم بھی نہ تھا۔یونیورسٹی میں کچھ مکار اور چال باز قسم کے لوگ مساوات کے دعویدار بن گئے تھے۔طالب علموں کا سیاسی استحصال کرتے تھے۔سماجی انصاف اور مساوات کے نام پر انھیں ورغلاتے تھے۔ارباز بھی ان کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔وہ مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔اس سے صاف ظاہر تھا کہ سیاست اس کا نصب العین نہیں تھا۔اس نے خود کو ملامت کی،''اس دن اگر تو نے اپنی زبان پر لگام لگایا ہوتا تو آج سرخ تاج والا کٹھ پھوڑا...''

اس نے کھڑکی کے باہر نظر دوڑائی۔دیکھا،کٹھ پھوڑا گھونسلے میں داخل ہو چکا ہے۔اندر اپنے آشیانے میں دونوں کٹھ پھوڑے چونچ میں چونچ ملائے کام و دہن کا مزہ لے رہے ہیں۔

اور جبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔اس نے ریسور اٹھا کر 'ہیلو' کہا۔ٹیکارام کی آواز آئی،''میڈم،دارجیلنگ سے آپ کا فون۔''

''تمھارے فون کا انتظار کرتے کرتے سوچا میں ہی فون کر کے تمھاری خیریت معلوم کرلوں۔کہو،کیا حال ہے؟''

''ہاں داجو۔حال اچھا ہے۔مسئلہ حل ہو گیا ہے۔تمام شرارت کا مرپڈ بھنڈاری کی تھی۔میں

نے اس سے کہہ دیا ہے، پہاڑ چھوڑ کر چلا جائے۔''

''مجھے یقین تھا تم ضرور اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالو گی۔لیکن نو فیصد زیادہ ہو گیا ہے۔معاملہ سات فیصد میں حل کرنے سے ٹھیک ہوتا۔کیا کریں گے وہ اتنے پیسے لے کر۔سب دارو اور جوئے میں اڑا دیں گے۔دیکھو اگر...''

''داجو، وہ دارو میں اڑائیں یا جوئے میں، یہ ان کا حق تھا سو میں نے دلوا دیا۔یہاں کی چائے بہت عمدہ ہے۔بدیسی بازار میں مہنگے داموں بکتی ہے۔کمپنی کو خاصا منافع....''

ابھی اس کے الفاظ باقی تھے کہ فون ڈس کنکٹ ہو گیا۔اس نے رسیپشن کو فون لگایا کہ وہ اس نمبر پر فون لگائے۔لمحہ بھر بعد ہی فون کنیکٹ ہو گیا۔اس نے کہا،''ہیلو داجو،لگتا ہے فون کٹ گیا تھا۔آپ نے بتایا نہیں دوسرا مسئلہ کیا ہے۔''

''دوسرا مسئلہ! ایسا کرو،تم وہیں ٹھہرو۔جب تک میرا فون نہ آجائے وہاں سے ہٹنا نہیں۔اور سنو، کمپنی کے نمائندے کے ذریعہ بونس کا اعلان مت کرواؤ۔بس انھیں اتنا بتا دو کہ پچھلی بار کا مریڈ بھنڈاری نے بونس کی رقم غبن کر لی تھی۔اس بار کوئی غبن نہیں ہوگا۔''

''لیکن داجو...''

''دیکھو، مجھے بہت کام ہے۔فی الحال جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔اور کل میرے فون کا انتظار کرو۔''

''جی داجو مگر میں...'' اور اس بار بھی فون کٹ گیا۔اس نے دو تین مرتبہ 'ہیلو ہیلو' کیا اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔

اور جبھی ایک زوردار جھما کا ہوا اور لمحہ بھر کے لیے کمرا روشنی سے بھر گیا۔اس کے بعد زوروں سے بجلی کی کڑک سنائی دی۔اتنے زور سے کہ کمرے کی ایک ایک شے لرز اٹھی۔مقامی لوگوں کا ماننا ہے کہ جب پہاڑ پر کوئی آفت آتی ہے تو ژونگ مضطرب ہو جاتا ہے۔ہاتھوں سے چھاتی پیٹ پیٹ کر چیختا ہے۔اس کی چیخ آسمان سے جا ٹکراتی ہے اور آسمان میں ہلچل مچ جاتا ہے۔ابر پارے آپس میں متصادم ہوتے ہیں۔اس تصادم سے آگ پیدا ہوتی ہے اور زمین پر برق بن کر گرتی ہے۔اس کا دل دہل گیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔آسمان جو کچھ دیر پہلے بے کراں سمندر کی طرح دور دور تک نیلا دکھائی دے رہا تھا اور جس نے سفید برفیلی چوٹیوں کو خوان پوش کی مانند ڈھک رکھا تھا، یکسر کالے مٹیالے بادلوں کی زد میں آگیا۔وادیاں جہاں صنوبر اور شاہ بلوط کی قطاروں کے درمیان عمارتیں، جو دل کش کھلونوں کی طرح سجی ہوئی تھیں، اور جن کے دریچوں پر رنگ برنگی روشنیاں جھلک رہی تھیں، رات کی سیاہی میں یکسر گم ہو گئیں۔لوگ گویا ژونگ کا اشارہ بھانپ گئے تھے اور اس ناگہانی بلا کے خوف سے اپنے اپنے گھروں کے

کھڑکی دروازے بند کر لیے تھے۔اب ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں جس کی للک میں وہ اس کمرے میں ٹھہرا کرتی تھی اور جہاں سے قدرت کے حسین مناظر اس کی آنکھوں کو شاداب اور دل کو مسرور کیا کرتے تھے، یکا یک اپنا وجود کھو چکی تھیں۔اس نے جلدی سے پردہ کھینچ دیا اور مسہری پر آکر لیٹ گئی۔آنکھیں موند کر ذہن کہیں اور لگانا چاہا۔

☆وہ سامان باندھے بیٹھی تھی۔پیا یولمو بار بار کہہ رہی تھی،''تجھے ایسا نہیں لگتا کہ تو غلطی کر رہی ہے۔ایم فیل میں داخلہ لیے ابھی چار مہینے ہی ہوئے ہیں اور تو جانا چاہتی ہے۔تیرا جھگڑا ارباز سے ہوا ہے، پوری یونیورسٹی سے تو نہیں ہوا۔تو یونیورسٹی کو اس طرح کیوں چھوڑ رہی ہے۔تھوڑے دنوں بعد چھٹیاں شروع ہو جائیں گی۔چھٹیوں تک تو رک جا۔ہو سکتا ہے تیرا من بدل جائے۔اور اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔''

یولمو بکتی جا رہی تھی اور وہ تھی کہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی تھی۔

دارجیلنگ میل رات کے آٹھ بجے سیالدہ اسٹیشن سے چھٹتی تھی۔یونیورسٹی سے اسٹیشن کا فاصلہ آدھے گھنٹے کا تھا۔لیکن اس نے سہ پہر ہی سے اپنا سامان باندھ لیا تھا۔اس کے ذہن میں یکے بعد دیگر کئی مناظر ابھرنے لگے تھے۔ان میں کچھ مناظر ایسے بھی تھے، جنھیں دیکھ کر وہ بے قرار ہو اٹھی تھی:

☆ارباز احمد فٹ بال کھیل رہا تھا۔جب بھی کِک مارتا یا مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کو زک دے کر گیند لیے پل جاتا تو وہ پھولے نہ سماتی۔تالیاں پیٹ پیٹ کر آس پاس کے لوگوں کو پریشان کر دیتی۔ارباز ایک کھلاڑی کو چکمہ دے کر تیزی سے بڑھنا چاہ رہا تھا کہ دوسرے کھلاڑی نے پیچھے سے ٹانگ مار دی۔وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔دوسرے ہی پل اٹھا اور دوڑ کر گیند اپنے قبضے میں لینا چاہا، مگر ڈگمگا کر پھر گر پڑا۔پاؤں میں موچ آگئی تھی۔

کئی دنوں تک اس کا چلنا پھرنا محال ہو گیا تھا۔دن رات کمرے میں پڑا رہتا۔دیب لینا روزانہ اس سے ملنے آتی۔اس کی تیمارداری کرتی۔اُس دن بھی وہ اسی مقصد سے گئی تھی۔وہ پیر پھیلائے کھاٹ پر بیٹھا تھا۔اسے دیکھ کر پیر سمیٹنے لگا کہ اسے بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔

وہ مسکراتی ہوئی بولی،''ہلو نہیں، ویسے ہی پیر پھیلائے بیٹھے رہو۔'' مگر اس نے کسی طور اپنے پاؤں موڑ لیے۔وہ پائینتی بیٹھ گئی۔پاؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مغموم لہجے میں بولی،''اب بھی درد ہو رہا ہے، ارب؟''

''ہاں درد تو ہو رہا ہے۔'' اس نے مصنوعی طور پر کراہتے ہوئے کہا۔

''کہاں، یہاں؟'' اس نے پنڈلی کے پاس ابھری ہوئی ہڈی کو دھیرے سے چھوا۔''

اس کے چھوتے ہی ارباز کو محسوس ہوا، جسم میں ایک برق سی لہرا گئی ہے۔ اس نے پیر مزید سمیٹ لیے۔ کہا، ''نہیں، درد تو یہاں نہیں ہے۔ درد تو یہاں ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے سے چپکا لیا۔'' اور شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

دیب لینا نے سینے پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے تعجب سے کہا، ''درد یہاں ہے؟ لیکن کھیلتے وقت تو چوٹ پاؤں میں لگی تھی۔''

''اجی محترمہ، آپ کو کیا معلوم کہ اِس کھیل میں چوٹ کہاں کہاں لگتی ہے۔''

''مگر مجھے جہاں تک یاد ہے اس دن تم چھاتی کے بل تو نہیں گرے تھے۔'' پھر بھی اسے تشویش ہوئی اور وہ جلدی جلدی اس کی قمیض کے بٹن کھولنے لگی۔

''محترمہ، چھاتی کے بل ہی گرا تھا۔ یوں...!'' اس نے کسی طور اپنے پیر موڑے اور خود کو دھیرے سے اس پر پھیلا دیا۔

دیب لینا پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ دونوں کی چھاتی ایک دوسرے سے مس ہو رہی تھیں۔ نگاہیں ایک دوسرے میں سما گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگی تھیں۔ بدن کی حدت ایک دوسرے میں پیوست ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ درجہ حرارت اس نقطہ کو پہنچ گیا جہاں ٹھوس سخت دھات بھی اکثر پگھل جاتے ہیں۔ رقیق لاوے کی صورت ٹپکنے لگتے ہیں۔

☆ یولمو نے ٹہوکا دیا، ''کیا سوچ رہی ہے؟''

اس نے ذہن میں ابھر آنے والے خیال کو جھٹکتے ہوئے کہا، ''نہیں، کچھ بھی نہیں۔''

''مجھے پورا یقین ہے، تو اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اور کرنا بھی چاہیے۔ آخر وہ بھی تجھ سے کم پیار نہیں کرتا۔'' یولمو نے اسے جان بوجھ کر چھیڑا۔

''دیکھ، تو میرے سامنے اس کا نام مت لے۔'' یہ کہہ کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔

''اگر تو نے مجھ سے پہلے کہا ہوتا کہ اسے بیچ راہ میں یوں چھوڑ کر چل دے گی تو میں وہ کام کرتی کہ اس بے چارے کو یہ دن دیکھنا ہی نہیں پڑتا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں اسے لے کر بھوٹان بھاگ جاتی۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ مگر دیب لینا اس کے قہقہہ میں مخفی درد نہ جان سکی۔ آنکھیں موندے بستر پر پڑی رہی۔ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

☆ اس کے ذہن میں ماضی کے واقعات ابھر آئے تھے۔ وہ ان واقعات میں کھوئی ہوئی تھی کہ

کسی نے کنڈی کھڑکھڑائی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا مگر یوں ہی لیٹی رہی۔ کنڈی کھڑکانے کی آواز دوسری بار آئی تو بادلِ ناخواستہ بستر سے اٹھی۔ اسے محسوس ہوا باہر بارش ہو رہی ہے۔ پردہ کھسکا کر کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ پانی کی موٹی موٹی بوندیں شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہوا بھی تیز تھی۔

کنڈی کھڑکانے کی آواز تیسری دفعہ آئی۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دیکھا، ٹیکا رام بڑا سا ایک ٹرے تھامے کھڑا ہے۔ اس نے خندہ روئی سے گڈ ایوننگ کہا اور اندر آ کر ٹرے کھانے کی میز پر رکھ دیا، ''میڈم، باہیر بھاری ورشا ہودے چھے۔'' ٹرے کی ایک طرف پیتل کی چھوٹی سی ایک بالٹی تھی جس میں وہسکی اور سوڈے کی بوتلیں رکھی تھیں۔ نیچے طشتری میں کاجو اور چنے تھے۔ نارنگی کی قاشیں تھیں۔ اور دوسری طرف ایک کیس رول تھا۔ بیچ میں پلیٹ اور چھری کانٹے سجے تھے۔

[میڈم، باہر بہت بارش ہو رہی ہے۔]

ٹیکا رام نے بالٹی سے بوتلیں اور کاجو چنے والی طشتری نکال کر کرسی کے سامنے رکھ دیں۔ کورنش بجالانے کے انداز میں سر جھکایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔

اس نے پکارا، ''بھائی، ایک پیکٹ فلٹر ولس لے آنو ہوس۔''

[بھائی، ایک پیکٹ فلٹر ولس لے آؤ۔]

اور اس کے جاتے ہی ایک بار پھر وہ بستر پر پیٹھ کے بل لیٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ ماضی کی کوئی یاد اسے اپنی بانہوں میں آ دبوچتی ٹیکا رام نے دروازے پر پھر دستک دی اور فلٹر ولس کا پیکٹ دے گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے گلاس میں وہسکی اور سوڈا انڈیلے۔ سگریٹ سلگا کر لمبا سا ایک کش لیا۔ پھر شراب کی چسکی لی اور دو عدد کاجو منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔

باہر بارش مزید تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کے شور کے ساتھ بجلی کی کڑک بھی سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر اس نے ٹھان لی، وہ بونس کے سلسلے میں مزدوروں سے کچھ نہیں کہے گی۔ کمپنی کے نمائندے سے بھی بات نہیں کرے گی۔ صبح ہوتے ہی کالپونگ کے لیے روانہ ہو جائے گی۔ بھاش دا جو سے کوئی بہانہ بنا دے گی۔ وہ بدبدائی، ''ویسے بھی انھوں نے کہہ ہی دیا ہے، دوسرے پرابلم کا حل انھوں نے خود ہی ڈھونڈ رکھا ہے۔ جب پرابلم کا حل ڈھونڈ ہی لیا ہے تو پھر میرا کیا کام۔''

مگر صبح کو اس کے منصوبے پر پانی پھر گیا۔ ٹیکا رام نے بتایا، رات بھر موسلے دھار بارش ہوئی ہے۔ مٹی اور چٹان کھسکنے کے سبب راستہ بلاک ہو گیا ہے۔

اور کوئی چارہ نہ رہا۔ مجبوراً رکنا پڑا۔ وہ کمرے میں بیٹھی کھڑکی سے باہر تاک رہی تھی۔ ویسے

پہاڑوں پر گھٹائیں اکثر چھائی رہتی ہیں۔ دور کا سماں بہت صاف نظر نہیں آتا۔ ایک خاص دوری پر کوہستانی سلسلہ پُراسرار طریقے سے بدلیوں میں چھپا رہتا ہے۔ اس لیے فطرت پورے حسن کے ساتھ نمایاں نہیں ہوتی۔ لیکن بارش اگر زوروں کی ہو تو فضا کی تمام کثافت دھل جاتی ہے اور فطرت اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر تک اسرار سے پردہ اٹھا رہتا ہے۔ جگہ جگہ نقرئی جھرنے رواں ہو جاتے ہیں۔ اور پانی کے سوتے جو دھیرے دھیرے نیچے اترتے ہیں ایک دم سے توانا ہو جاتے ہیں۔ فضا مترنم ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے پہاڑوں میں روح پھونک دی ہو۔

اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ باہر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ پہاڑ کا ایسا حسن اُس کی نظروں سے کم کم ہی گزرا تھا۔ وہ قدرت کے حسین نظاروں سے حظ اٹھانے لگی۔ خود کو حسین وادیوں میں گم ہوتا محسوس کرنے لگی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

گھنٹی دیر تک بجتی رہی مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ وہ تو پوری طرح قدرت کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی۔

اس بار بھی گھنٹی بجی تھی۔ فون کی نہیں دروازے کی۔ اور کئی بار کھٹکھٹانے کی آواز بھی آئی۔ جب کھٹکھٹانے اور گھنٹی بجنے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا تو اس نے جبراً قہراً دروازہ کھولا۔ سامنے ٹیکا رام کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ناشتے کی تھال لیے۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے تھال میز پر رکھی اور رات کے جھوٹے برتن اٹھاتے ہوئے بولا، ''میڈم دارجیلنگ سے آپ کے لیے فون آیا تھا۔'' وہ بوتل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیب لینا نے بوتل چھوڑ جانے کو کہا۔ فون کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

ناشتہ کرنے بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا۔ 'ہیلو' کہا۔ اور چونک گئی۔ آواز بھاش داجو کی نہیں، ہیمل کی تھی۔

کہہ رہا تھا، ''دیبی، تم ابھی پیشوک میں ہو تو؟'' آواز میں قدرے گھبراہٹ تھی۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''ہیمل، تم نے جب فون پیشوک میں کیا ہے تو میں پیشوک ہی ہوں گی نا۔ مگر تم گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟''

''چھتری جی کا خون ہو گیا ہے!'' ہیمل نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''چھتری جی کا خون؟ مگر وہ تو ہم لوگوں کے ساتھ.....''

''دیکھو، کون کس کے ساتھ تھا، کس کے ساتھ ہے اور کس کے ساتھ رہے گا، یہ میتھ مٹکس سمجھنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ ہم سبھوں کو اب اپنی اپنی فکر کرنی ہے۔ چوکنا رہنا ہے۔ بس اتنا جان رکھو، حالات

اچھے نہیں ہیں۔''

''لیکن ہوا کیا تھا؟ کس نے مارا؟''

''کس نے مارا، یہ جاننا اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ کس نے مروایا۔''

''کس نے مروایا؟''

''اس کا سراغ اب تک نہیں ملا ہے؟ ویسے مجھے دو لوگوں پر شک ہے۔ اور دونوں ہی ان کے قریبی تھے۔ لیکن حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم محتاط رہو اور فی الحال گھر جانے کا ارادہ ترک کر دو۔ ہو سکے تو فوراً دارجیلنگ لوٹ آؤ۔'' ہیمل کے طرزِ تکلم میں تشویش کا عنصر تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات تھی جس سے اب وہ گریز کرنا چاہتی تھی۔

☆ سرینگ چھتری سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ان کے قتل کی خبر سن کر وہ سکتے میں پڑ گئی تھی۔ جب وہ کلکتہ سے لوٹی تھی تو من ہلکا کرنے کی خاطر ان سے ملنے جایا کرتی تھی۔ ایک دن طنزیہ لہجے میں پوچھا تھا، ''ہجور بوبا، سچ سچ بتائیے، آپ کی نگاہ میں ہماری کیا وقعت ہے؟''

انھوں نے ہنس کر کہا تھا، ''تُو، ارے تُو تو میری پوتی ہے۔ تیرا باپ مجھے کاکا کہتا تھا۔ تو مجھے دادا کہتی ہے۔ باپ کی نگاہوں میں جو وقعت بیٹے کی ہوتی ہے۔ دادا کی نگاہوں میں جو وقعت پوتی کی ہوتی ہے۔ یقین جان بیٹا، اس سے رتی بھر کم نہیں ہے۔ مگر تجھے اچانک ہو کیا گیا ہے۔ جب سے کلکتہ سے لوٹی ہے، کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ اور اب یہ بے تکا سا سوال پوچھ رہی ہے؟''

''نہیں ہجور بوبا، میرا مطلب آپ سے نہیں تھا۔ میرا مطلب آپ کی پارٹی سے تھا۔ آپ کی پارٹی پہاڑی لوگوں کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟''

''پہاڑی لوگوں کو! ارے بیٹا، میں تو خود ہی پہاڑی ہوں۔ جیسا میں ہوں ویسے ہی پہاڑ کے دوسرے لوگ۔ ہماری پارٹی کا نظریہ بھی یہی ہے۔''

''تو پھر آپ کی پارٹی ہمرو پردیس آندولن کے خلاف کیوں ہے؟''

''ہماری پارٹی ہمرو پردیس آندولن کے خلاف ہے؟ کون کہتا ہے؟ جو یہ کہتا ہے اسے سچائی نہیں معلوم۔ سن، اس وقت میں چھوٹا تھا۔ پھر بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب دیس آزاد ہوا، اس وقت پارٹی میں دراڑ نہیں پڑی تھی۔ سب اکٹھے تھے۔ کنسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں ہماری پارٹی نے ایک میمورنڈم پیش کیا تھا۔ ہمرو لوگوں کے لیے الگ پردیس بنانے کا۔ اس وقت اس میں دارجیلنگ اور سکم دونوں علاقے شامل تھے۔ لیکن ہماری مانگ نہیں مانی گئی۔ حالاں کہ بعد میں سرکار نے بھاشا ہی کی بنیاد پر پردیسوں کو تقسیم

کیا۔آسام، بنگال، اڑیسہ، مدراس، پنجاب وغیرہ بنائے گئے۔لیکن ہمیں ویسے ہی چھوڑ دیا گیا۔اور جب سکّم کو پردیس کا درجہ مل رہا تھا تو اس وقت بھی ایک موقع تھا مگر اس وقت بھی ہم فراموش کر دیے گئے۔ سوچو، کس نے کیا فراموش؟ اب تم ہی کہو، ہماری پارٹی پر کیا یہ الزام درست ہے؟''

''تو پھر آج ہمرو پردیس کے نام پر اتنا خون خرابا کیوں؟''

''کیوں کا جواب اتنا آسان نہیں ہوتا، بیٹی۔ انجیکٹیو اور سبجیکٹیو دونوں ہی پہلو سے سچائی کو پرکھنا پڑتا ہے۔ دو پلس دو چار ہوتے ہیں، اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہمیں کسی تجربے سے گزرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کا نتیجہ پہلے سے طے ہے۔لیکن پہاڑی لوگ میدانی لوگوں سے بہتر ہیں۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہمیں بے شمار تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں نتیجہ پہلے سے طے نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے خون خرابا ہوتا ہے۔ پھر بھی لوگ پوچھتے ہیں اتنی خون ریزی کیوں؟ تو اس کا جواب بھی انجیکٹیو نہیں سبجیکٹیو ہے۔ کیوں کہ تمھارا جواب میرے جواب سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اسی طرح میرے جیسے سو شلسٹ جو پہاڑی ہیں، اوران جیسے سوشلسٹ جو پہاڑی نہیں ہیں، دونوں کے جواب ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ یہ ماننا کہ یہ دونوں سوشلسٹ ہیں اس لیے دونوں کی سوچ اور تجربے سے گزرنے کا عمل بھی ایک جیسے ہی ہوں گے، مناسب نہیں۔ یاد رہے، ماحول، سماج، کلچر اور نفسیات، انسان کے سوچ اور تجربے کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ خون ریزی کسی مخصوص نظریے کے سبب نہیں، یہ مختلف سوچ اور تجربے کے سبب ہے۔ پھر بھی ہے تو سچ۔اور یہ سچ انجیکٹیو نہیں، سبجیکٹیو ہے۔''

''میں سمجھ گئی، ہجور بوبا۔''

''کیا سمجھ گئی، بٹیارانی؟'' سرینگ چھتری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ سوشلسٹ اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔''

''نہیں بیٹی، میں نے اچھے بروں کی تو بات ہی نہیں کی۔ خون خرابا کرنے والے سب برے لوگ ہی ہوں گے یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں۔ یہ تو بس درسٹی کون کی بات ہے۔ تم مجھے اچھا سمجھتی ہو کیوں کہ تم اچھی ہو۔ کل کوئی مجھے مار ڈالے گا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آدمی برا ہوگا۔ یہ تو اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ تم مجھے کس زاویے سے دیکھتی ہو اور وہ مجھے کس زاویے سے دیکھے گا۔'' [درسٹی کون: زاویۂ نگاہ]

دیبی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ کہا، ''وہ چاہے جس زاویے سے دیکھے لیکن ہمارے لیے تو وہ برا آدمی ہی ہوگا۔''

☆''برا آدمی!'' وہ بڑبڑائی۔

کون ہے وہ برا آدمی!

اگر پاتال میں بھی چھپا ہوگا تو بھی میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ حرام زادے کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔''

اس نے ناشتے کی پلیٹ پیچھے کھسکادی۔ میز پر کہنی رکھی اور ہتھیلی سے رخسار تھامے سوچنے لگی، ''کون ہوسکتا ہے وہ حرام زادہ...؟''

اور جبھی ایک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔اس بار اس نے فون فوراً اٹھالیا۔ بھاش دا جو کہہ رہے تھے، ''دیبی، بھنڈاری کو بھگاؤ نہیں، وہیں رہنے دو۔ وہ جس طرح یونین کا کام چلا رہا اسے چلانے دو۔ بس دباؤ بنائے رکھو۔''

''مگر دا جو اس نے تو.....''

''مجھے پتہ ہے اس نے شرارت کی ہے۔اسے نکال باہر کرنے سے پہاڑ پر ہنگامہ مچے گا۔ ہم پہاڑ پر اب اور ہنگامہ نہیں چاہتے۔ سرکار نے پہاڑ کی ترقی کے لیے جو ذمہ داریاں ہمیں سونپی ہیں انھیں پورا کرنا ہے۔اس کے لیے امن چاہیے۔ ہمیں ہر کام پُرامن طریقے سے کرنا ہوگا۔''

''تو پھر دا جو، مجھے یہاں بھیجنے کا فائدہ؟'' دیبی منمنائی۔

''فائدہ نقصان دیکھنا تمھارا کام نہیں۔ جو کہا جارہا ہے وہی کرو۔ کامریڈ بھنڈاری کو چھوڑ دو۔ کمپنی اور مزدوروں کے درمیان جو کرنا ہے وہ کرے۔ بس ہڑتال نہ ہو۔اس کے لیے اس پر دباؤ بنائے رکھو۔''

''میں کل کالمپونگ جاؤں گی۔ وہاں سرینگ چھتری کا کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''تمھیں کس نے بتایا؟'' بھاش دا جو نے تجسس میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بس معلوم ہوا ہے۔'' اس نے جان بوجھ کر ہیمل کا نام نہیں بتایا۔ دراصل وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ ہیمل اور اس کے درمیان ان دنوں جو کچھ چل رہا ہے، اس کی انھیں بھنک لگے۔

''یہ کام چنگا داس کا ہے۔ وہ دوغلی پالیسی چل رہا۔ سنا ہے ہمارے خلاف ریلی نکالنے والا ہے۔ تھانہ گھیراؤ کرے گا۔ تم وہاں رہو گی تو وہ جھجکے گا۔اس پر لگام لگانا ضروری ہے۔اس لیے تم کالمپونگ کے لیے فوراً روانہ ہوجاؤ۔''

''لیکن جاؤں کیسے۔ راستہ تو بلاک ہے۔''

''اُف، تب تو وہ خوب اودھم مچائے گا۔ ٹھیک ہے میں ہی کوئی راستہ نکالتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے فون رکھ دیا۔

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ ہیمل جانے سے منع کر رہا ہے۔ اور بھاش دا جو جانے کو کہہ رہے ہیں۔ آخر وہ کرے تو کیا کرے؟ سارا دن وہ اسی تذبذب میں پڑی رہی۔ ویسے رات ہی کو خبر مل چکی تھی، راستہ کھل گیا ہے۔ سرینگ چھتری کے قتل کا اسے بے حد رنج تھا۔ دیر رات تک شراب پیتی رہی۔ خود کلامی کرتی رہی۔ کالمپونگ جائے یا نہ جائے۔ اس نے گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پوری شراب پی لی۔ جب وہ پریشان ہو جاتی ہے تو شراب ایسے ہی غٹک جاتی ہے۔ آخر کار اس نے طے کر لیا۔ کل کالمپونگ جائے گی۔ لیکن صبح سویرے نہیں۔ دن چڑھنے کے بعد۔

اس نے ٹیکا رام کو ہدایت کر دی، صبح دس بجے سے پہلے اسے نہ جگائے۔ لیکن رات کو اس سے ایک چوک ہو گئی۔ کھڑکی پر پردہ تاننا بھول گئی تھی۔ چٹخنی بھی کھلی رہ گئی تھی۔

☆ پو پھٹتے ہی چڑیوں کی چہکار سے پوری وادی گونج اٹھی۔ اور جب پرندے پھدکتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکلنے لگے تو وہ کٹھ پھوڑا ابھی سامنے والے درخت کی سوراخ سے نکل آیا۔ پھدکتا ہوا ڈال پر جا بیٹھا۔ پروں کو پھٹپھٹایا۔ پھر پنکھ کھول کھول کر ہوا میں کئی بار پھڑ کایا۔ دفعتاً اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑی۔ پٹوں کے بیچ اسے ہلکا سا شگاف نظر آیا۔ اڑ کر منڈیری پر بیٹھ گیا۔ شیشے سے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو کھانے کی میز پر روٹی کے ٹکڑے نظر آئے۔ پٹوں کے شگاف سے کمرے میں گھسا اور اڑتا ہوا کھانے کی میز پر آ بیٹھا۔ میز پر پڑے دانے چگنے لگا۔ پنکھ بوتل سے ٹکرائے اور بوتل لڑھک کر جھن سے فرش پر گر پڑی۔ آواز سن کر وہ ڈر گیا۔ پنکھ پھڑ کاتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ لیکن پردہ جھولنے کے سبب اسے شگاف نظر نہ آیا۔ وہ گھبرا گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں کمرے میں اِدھر اُدھر اڑنے لگا۔

بوتل کی جھنکار سن کر دیبی کی نیند ٹوٹ گئی تھی، لیکن وہ آنکھیں موندے بستر پر اب بھی پڑی تھی۔ جب پھڑ پھڑانے کی آواز سنی تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔

کمرے میں روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ اس کی نیند اچٹ گئی۔ اور تب اس نے فیصلہ کیا، اب اور دیر نہیں کرے گی۔ صبح سویرے ہی کالمپونگ روانہ ہو جائے گی۔

◀◀ ● ▶▶

1B/1, K.B.Bose Lane,
Kolkata-700033.
Mob : 8961491731

● خافان ساجد

یوسا

ہیمبرگ کی وہ شام جتنی حسین تھی، میں اسی قدر اداس تھا۔

اداسی کی اصل وجہ وطن سے دوری تھی۔ میری کیفیت کا اندازہ صرف انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو کسی سبب اپنا دیس چھوڑ کر دیار غیر میں جا بسے ہوں۔

مغرب کا وقت تھا اور میں ہیفن سٹی گراس بروک میں دریائے ایلبی کے کنارے کروز ٹرمینل کے قریب ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں کوک کا ٹن تھا، جسے میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے حلق میں اتار رہا تھا۔

بندرگاہ پر اس وقت خاصی رونق اور گہما گہمی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے ایمسٹرڈیم سے ایک مسافر جہاز آ کر لنگر انداز ہوا تھا۔ میں دل بہلانے کے لیے اس سے اترنے والے مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ ویک اینڈ پر میرا یہی مشغلہ ہوتا۔ گزشتہ دو مہینے سے، میں ٹرمینل سے محض دس منٹ کی پیدل مسافت پر، ایک رہائشی عمارت میں مقیم تھا۔ عمارت کی چوتھی منزل پر واقع تین بیڈ روم کا فلیٹ میرے دوست موہن لال کے والد کیپٹن (ریٹائرڈ) پیارے لال کی ملکیت تھا۔ اس کا ایک الگ تھلگ کمرہ جو ایک طرح کا اسٹوڈیو فلیٹ ہی تھا، مجھے موہن کی سفارش پر نہایت کم کرائے پر مل گیا تھا۔

بحری جہاز جو ابھی ابھی لنگر انداز ہوا تھا اس کے زیادہ تر مسافر سکینڈے نیوین ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ سویڈش، نارویجین اور ڈینش لانبے قد کی سنہری زلفوں والی سپید گلابی عورتیں اور مردانہ وجاہت سے بھرپور صحت منداور قدآور مرد۔ دبلی پتلی اور کھلنڈری حسین لڑکیاں، بے فکرے نوجوان، بچے اور بوڑھے مرد اور بزرگ عورتیں جن کے چہرے عمر رسیدگی کے باوجود ہشاش بشاش تھے۔ ہمارے عمر رسیدہ لوگوں کی مانند نہیں جو ساٹھ کی حد پار کرتے ہی جوڑوں کے درد، شوگر اور بلڈ پریشر جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو کر زندگی سے بیزار دکھائی دینے لگتے ہیں۔

میں نے بائیں جانب نگاہ دوڑائی۔ سورج دور گہرے نیلے پانی میں ڈوبنے سے پہلے اپنی سرخ ازلی آنکھ سے بندرگاہ کو گھور رہا تھا۔ مجھ سے سوڈیڑھ سو گز دور، میری نظر اور غروب ہوتے سورج کے درمیان، اکیلا سمندری بگلہ پانی سے بیس پچیس فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا۔ وہ فضا میں ایک ہی جگہ معلق رہتے ہوئے تیز تیز پر مارتا اور پھر گولی کی طرح سطح آب سے جا ٹکراتا۔ جب وہ غوطہ لگا کر بھیگے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہوا دوبارہ فضا میں بلند ہوتا تو اس

کی چونچ میں چھوٹی سی مچھلی دبی ہوتی۔ وہ اڑان بھر کر ساحل پر ایستادہ ایک زنگ آلود متروک کرین پر جا بیٹھتا۔ شکار کی ہوئی مچھلی کو پیٹ میں اتار کر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دو تین بار اپنی گردن کو جنبش دیتا اور پھر اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر فضا میں بلند ہوتا اور خود کو ہوا کے دوش پر آزاد چھوڑ دیتا۔ ہوا اسے اڑا کر خاصا اوپر لے جاتی۔ پھر وہ اسی انداز میں دوبارہ ایک ہی جگہ معلق ہو جاتا اور نیچے پانی پر نظریں گاڑے نئے شکار کی کھوج شروع کر دیتا۔

میں ٹرمینل کی رونق سے منہ موڑ کر کئی منٹ اسے محویت سے دیکھتا رہا اور اپنا موازنہ رزق کی تلاش میں سرگرداں اس تنہا پنچھی سے کرتا رہا۔ میں بھی دیارِ غیر میں اسی کی مانند اکیلا، روزی کے لیے تگ و دو کر رہا تھا۔ مجھے جرمنی آئے تین سال بیت چکے تھے۔ میں اس دوران ایک بار بھی وطن واپس نہیں گیا تھا۔ جی تو بہت چاہتا تھا۔ اکثر دل اُداس ہو جاتا، مگر ابو نے فون پر کہا تھا۔

''تیمور بیٹا آنے جانے پر پیسہ برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہمیں وہ قرض چکانا ہے جو عزیز و اقارب سے لے رکھا ہے۔ رقم وقت پر واپس کرنا ضروری ہے بیٹا۔ کوئی تقاضا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم بھی چپ سادھ لیں۔'' مجھے ان سے اتفاق تھا، مگر دل کی دنیا دماغ کی دنیا سے الگ ہے۔ دل کو بہلانا اتنا سہل کہاں ہوتا ہے۔

جب میں لڑکپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھ رہا تھا تو سب نوجوانوں کی طرح میرے بھی کچھ خواب تھے۔ میں سافٹ ویئر انجینئر بننا چاہتا تھا۔ اپنی منزل پانے کے لیے میں نے ایف ایس سی میں جان توڑ محنت کی۔ سولہ سولہ، اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ پڑھتا تا کہ ملک کی سب سے بہترین انجینئرنگ یونی ورسٹی میں داخلہ لے سکوں۔ نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کسی فرد میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کو اس یونی ورسٹی میں پڑھا سکے۔ اس کے باوصف جب میرا نام میرٹ لسٹ پر آیا تو میرے والدین نے مجھے پڑھایا۔ امی نے زیور بیچ دیئے اور ابو نے اپنے دوستوں اور قریبی رشتہ داروں سے قرض لیا، تب کہیں جا کر چار سالوں میں میری پڑھائی پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

گریجویشن کے بعد ان کا اور خود میرا بھی یہی خیال تھا کہ مجھے کوئی اچھی سرکاری نوکری مل جائے گی۔ مگر بہت جلد ہماری خوش فہمی دور ہو گئی۔ ملک میں تھوڑے ہی عرصے میں یونی ورسٹیوں کی تعداد یوں بڑھی تھی جیسے برسات میں یکا یک باافراط کھمبیاں اُگ آتی ہیں۔ یونی ورسٹیاں ہر سال فیکٹریوں اور کارخانوں کی مانند ہزاروں ڈگری یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں کی کھیپ تیار کرتیں مگر ان سب کو کھپانے کے لیے اتنی بڑی تعداد میں نوکریاں دستیاب نہیں تھیں۔ ایک اور بڑی اُفتاد وطنِ عزیز پر یہ آ پڑی کہ پورا ملک خوفناک دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہر روز کہیں نہ کہیں خودکش حملہ ہوتا جس میں درجنوں بے گناہ لوگ شہید ہو جاتے، بیسیوں زخمی ہوتے۔ مسجدوں میں نمازیوں کو خون میں نہلا دیا جاتا۔ جنازے پڑھنے والوں کو بھی نہ

بخشا جاتا۔ اس وقت تو انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی جب سینکڑوں پھول جیسے بچوں کو ایک اسکول میں اندھا دھند فائرنگ کر کے آن واحد میں موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ایسے حالات میں ملک کے مستقبل کے حوالے سے مایوسی کی لہر پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ ابو بھی اس لہر کی لپیٹ میں آ گئے۔

وہ گرمیوں کی ایک شام تھی۔ ابو مغرب کی نماز باجماعت پڑھ کر مسجد سے لوٹے تو امی نے چائے پیش کی۔ وہ برآمدے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے اور خلافِ معمول بہت خاموشی سے چائے پینے لگے۔ میں ان سے چند قدم دور طوطے کے پنجرے کے پاس کھڑا اسے کٹا ہوا امرود کھلا رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ چہرے پر افسردگی اور کسی قدر مایوسی کے سائے لہرا رہے تھے۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ لپٹی موتیا کی گھنی بیل، اس پر اُگے ان گنت سفید پھول اور ان سے اٹھنے والی خوش بو نے اس اداسی اور خاموشی کو مزید گہرا کر دیا تھا۔ ابو نے بالآخر امی کی طرف خالی کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نیک بخت! سچ پوچھو تو مجھے اب یہاں اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اصلاحِ احوال کی کوئی امید نہیں۔ بہتر ہے تیمور کو بیرونِ ملک بھجوا دیا جائے۔''

''کہاں بھیجنے کا سوچ رہے ہیں میرے بیٹے کو؟'' امی فکرمند ہو گئیں۔

''جرمنی۔'' ''اتنی دور؟''

''دنیا اب ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ دوری کیا معنی رکھتی ہے؟'' ابو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''اپنے امام صاحب ہیں نا۔ ان کا بھانجا لوگوں کو بیرونِ ملک بھجواتا ہے۔ اس کی ریکروٹنگ ایجنسی ہے۔ کہہ رہے تھے اس کے ذریعے بھجوا دیں گے۔ زیادہ رقم خرچ نہیں ہوگی۔''

''بندہ تو قابلِ اعتبار ہے نا؟''

''ہاں، ہاں۔ ہمارے دو ساتھی نمازیوں کے بچوں کو بھجوا چکا ہے۔ وہ سیٹ بھی ہو گئے جرمنی میں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ لیکن پیسوں کا بندوبست کیسے ہوگا؟''

''اللہ مدد کرے گا۔ کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو ہی جائے گا۔''

قصہ مختصر میں انہی صاحب کے توسط سے چند ماہ بعد جرمنی پہنچ گیا۔ شروع میں بہت مشکلات پیش آئیں۔ کئی جاب ملے اور چھوڑے۔ بالآخر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کوالٹی اشورنس سافٹ ویئر انجینئر کی حیثیت سے اچھی ملازمت مل گئی۔ یہ کمپنی انواع و اقسام کے کھانے بنانے کی تراکیب بمع اجزائے ترکیبی پیک کر کے بیچتی تھی۔ ڈبے میں ایک سی ڈی بھی ڈال دی جاتی جس میں ویڈیو کے ذریعے سمجھایا جاتا کہ وہ کھانا عملاً کیسے بنانا ہے۔ میں اس کے ڈیٹا سنٹر میں کام کرتا تھا جو ہیمبرگ میں واقع تھا۔ دفتر کے نزدیک ہی مجھے ایک کمرہ کرائے

پرمل گیا۔اس کا کرایہ اگرچہ زیادہ تھا مگر اس لحاظ سے وارے میں تھا کہ میں دفتر پیدل چلا جاتا۔وہاں میں سال بھر رہا، پھر اسٹیٹ منیجر سے کسی بات پر تو تکار ہوگئی اور مجھے وہ کمرہ خالی کرنا پڑا۔اس موقع پر موہن لال میری مدد کو آیا۔چوبیس پچیس سالہ یہ بھارتی نژاد خوش اخلاق نوجوان اس کمپنی میں نو وارد تھا۔وہ بھی سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ میں نے ایک سینئر کی حیثیت سے شروع میں اس کی احسن طریقے سے رہنمائی کی جس پر وہ میرا شکر گزار تھا۔اس نے اپنے والد سے بات کر کے مذکورہ اسٹوڈیو فلیٹ مجھے کرائے پر دلوادیا۔اس کے والد بزنس مین تھے۔وہ زیادہ تر برلن میں قیام کرتے۔اہلیہ کی وفات کے بعد انہوں نے ایک جرمن خاتون سے دوسری شادی کر لی تھی جو وہاں اپنا ریستوران چلاتی تھی۔وہ تین مہینے میں ایک بار ویک اینڈ گزارنے اپنے بیٹے کے پاس ہیمبرگ آیا کرتے،مگر اب تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں تھوڑی دیر ٹرمینل پر بیٹھا رہا۔جب شفق کی سرخی پھیل گئی،ٹرمینل پر ایستادہ برقی قمقمے روشن ہوگئے اور مسافروں کی بھیڑ چھٹ گئی تو میں بھی جماہی لیتے ہوئے بینچ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔طبیعت میں بوریت اور ایک طرح کا بوجھل پن تھا جو کسی طور رفع ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کسی سینما یا تھیٹر ہال کا رُخ کروں؟ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے موبائل فون کی بیل بجنے لگی۔میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔موہن کی کال تھی۔

''ہیلو!''

''ہیلو تیمور سر! میں موہن بول رہا ہوں۔کہاں ہیں؟''

''میں کروز ٹرمینل پر ہوں۔''

''وہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''آوارہ گردی۔ٹائم پاس۔اکیلا کمرے میں پڑا کیا کروں؟''

''ہاہاہا.....شریف آدمی کی واقعی ہیمبرگ میں کوئی زندگی نہیں!'' میں بھی ہنسنے لگا۔

''سوچ رہا ہوں کہ کوئی فلم دیکھنے چلوں۔تم نے دیکھنی ہے؟''

''سوری سر! میں آپ کی دعوت ضرور قبول کرتا' مگر پتا جی آج برلن سے آئے ہیں، میرے ساتھ ویک اینڈ گزارنے۔''

''اچھا' پھر تم انہیں کمپنی دو۔اور ہاں، انہیں میری طرف سے سلام عرض کرنا۔''

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ آ کر ملیں اور سلام کر لیں۔ابھی کچھ دیر پہلے آپ کا ذکر خیر ہوا۔انہوں نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔اگر آپ مناسب خیال کریں تو ہم ڈنر آج اکٹھے کر لیں۔میں بیا نک میں ٹیبل ریزرو کروا رہا ہوں۔'' میں نے شکریہ کے ساتھ اس کی دعوت قبول کر لی۔

میں پیدل چلتا ہوا کمرے میں آیا،نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہنا اور وقت مقررہ پر بیا نک ریستوران پہنچ گیا۔بیا نک، ہیفن سٹی کے مشہور ترین اور مہنگے ریستورانوں میں سے ایک ہے۔اس کے کھانوں کا معیار بہت بلند ہے۔دونوں باپ بیٹا کچھ ہی دیر پہلے ریستوران پہنچے تھے اور لابی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔میں نے بزرگ کو سلام کیا۔وہ شفقت اور تپاک سے ملے۔ستر پچھتر برس کے دبلے پتلے مگر صحت منداور چاک و چوبند آدمی تھے۔ہلکا لنگڑا کر چلتے تھے۔نوجوانی میں بھارتی فوج میں آفیسر کے طور پر سروس کر چکے تھے۔جنگ میں زخمی ہوئے تو انہیں طبی بنیادوں پر سبک دوش کر دیا گیا۔یہ بات انہوں نے مجھے کھانے کی میز پر بتائی تھی۔

''تیمور بیٹا' آپ کا تعلق پاکستان کے کس شہر سے ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی میں سیالکوٹ سے ہوں۔''

''ہماری فیملی نے لاہور سے ہجرت کی تھی۔میرے ماتا پتا دونوں لاہور کی جم پل تھے۔میں بھی لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ہربنس پورہ میں۔'' وہ مسکرائے۔

''اچھا! تو آپ لاہوری ہیں۔پھر تو پنجابی بول لیتے ہوں گے؟''

''بالکل بول لینا واں!'' انہوں نے اس انداز میں کہا کہ ہم سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

''آپ خاص سیالکوٹ شہر سے تعلق رکھتے ہیں؟'' انہوں نے مجھ سے استفسار کیا۔

''خاص سیالکوٹ شہر نہیں۔اس کے قریب ایک قصبہ ہے۔چونڈہ، شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو؟''

''لو بھئی' کیوں نہیں سنا۔'' وہ جوش سے بولے۔

''۱۹۶۵ء کے یدھ میں، میں ٹینکوں کی اس لڑائی میں شریک تھا جو بھارتی سینا اور پاکستان آرمی کے درمیان چونڈہ کے علاقے میں لڑی گئی۔سیکنڈ ورلڈ وار کے بعد یہ ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی تھی۔میری رجمنٹ پونا ہارس نے لیفٹننٹ کرنل اردشیر تارا پور کی کمان میں حملے میں حصہ لیا تھا۔وہ اس لڑائی میں شہید ہوگئے تھے۔بعد میں انہیں بھارت کا سب سے بڑا فوجی اعزاز پرم ویر چکرا بھی ملا۔ہم نے فلورا (پھلورا) گاؤں پر قبضہ کیا تھا۔تب میں لیفٹیننٹ تھا اور ڈیرہ دون ملٹری اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوئے مجھے صرف دو مہینے گزرے تھے۔''

''پھلورا میرا ننھیالی گاؤں ہے۔وہ واقعی آپ کی فوج کے قبضے میں چلا گیا تھا،لیکن پاک آرمی نے دو دن بعد جوابی حملہ کر کے یہ علاقہ بھارتی فوج کے قبضے سے چھڑوا لیا تھا۔اور بہت سے بھارتی فوجی جنگی قیدی بنا لیے تھے۔'' میں نے ریکارڈ کی درستی ضروری سمجھی۔

''یہ صحیح ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''پاک فوج بھی کم بہادر نہیں۔بڑا زوردار جوابی حملہ تھا۔اس میں پاکستانی ۶ آرمڈ ڈویژن کو آپ

کی ائیرفورس کی مدد بھی مل رہی تھی۔ آپ کی ائیرفورس اس وقت انڈین ائیرفورس سے بہت بہتر تھی۔ اس کے سیبر لڑاکا طیارے اور پائلٹ بہت اچھے تھے۔ وہ بہت نیچے آ کر ہم پر راکٹ برساتے اور بھاری بم گراتے رہے، جس سے ہماری سینا کا بہت جانی نقصان ہوا۔ بہت لوگ گھائل ہوئے۔ ہمارے بہت سے ٹینک تباہ ہوئے۔ پاک فوج نے ہماری رجمنٹ کے کئی جوانوں کو قیدی بھی بنالیا، جو جنگ کے بعد واپس کیے گئے۔''

''انکل' ویسے میں آپ کی پیشہ ورانہ دیانت داری سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے کھلے دل سے پاک فوج اور پاک فضائیہ کی تعریف کی ہے۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''انسان کو سچ بولنا چاہیے۔ چاہے بات دشمن ہی کی کیوں نہ ہو، اپنی رائے دیانت داری سے دینی چاہیے۔ ڈنڈی نہیں مارنی چاہیے۔''

ویٹر کھانا لے آیا تھا۔ میں نے بھرا ہوا میز دیکھا تو کہا۔

''انکل آپ نے خوامخواہ اتنا تکلف کیا.....'' انہوں نے اپنے لیے صرف چاول اور سبزی کی ڈشز منگوائی تھیں اور میرے لئے بہت اعلیٰ سی فوڈ۔

''نہیں بیٹا! آپ خاص مہمان ہیں آج۔''

''اس محبت کا شکریہ.....''

کھانے کے دوران میں نے یونہی ان سے پوچھ لیا۔

''انکل' اس جنگ کا کوئی ایسا واقعہ آپ کو یاد ہے جو آپ کبھی نہیں بھلا پائے؟''

''بالکل یاد ہے۔ بہت حیران کر دینے والا واقعہ ہے جسے میں چاہوں بھی تو کبھی بھلا نہ پاؤں گا۔''

''میں سننا چاہتا ہوں۔'' وہ سوچ میں ڈوب گئے جیسے یادوں کی راکھ کرید رہے ہوں۔ پھر بتانے لگے۔

''ہماری رجمنٹ نے جب پھلورا گاؤں پر قبضہ کیا تو ہم نے چند پاکستانی فوجی سپاہیوں کے علاوہ کچھ دیہاتی بھی پکڑے۔ ان میں چالیس پینتالیس سال کی عمر کا ایک جھلا سا، بدھوسا آدمی یوسف عرف یوسا بھی تھا۔ سائیں یوسف کی ساری عمر گاؤں کے بزرگوں کا حقہ بھرتے اور ان کی خدمت کرتے گزری تھی۔ ہمارے ٹینک اسکواڈرن کے لوگ اس سے بوٹ پالش کرواتے اور رات کو اپنے جسم اور ٹانگیں دبواتے۔ ایک دن اس نے دستی بم (ہینڈ گرینیڈ) کے متعلق پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ جوانوں میں سے ایک نے بتایا کہ اس کے اوپر جو چھلا لگا ہے اگر اسے کھینچ کر گرینیڈ کسی آدمی یا چیز پر پھینک دیا جائے تو بڑی تباہی پھیلتی ہے۔'' انہوں نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ پانی پی کر سلسلہء کلام وہیں سے جوڑا۔

''اگلے روز پاکستان آرمی نے پھلورا کا قبضہ چھڑوانے کے لیے ہماری پوزیشنوں پر جوابی حملہ

کیا۔ ہمارا اسکواڈرن اسے ناکام بنانے کے بعد شام کو واپس درختوں کے اس جھنڈ میں آ چھپا جو ہمارا ٹھکانہ تھا۔ ہمارے پاس شرمن ٹینک تھے جو سورج ڈوبنے کے بعد اندھے ہو جاتے تھے۔''

''اندھے ہو جاتے تھے! کیا مطلب؟'' موہن نے پوچھا۔

''ملٹری کی زبان میں اندھا ٹینک اس ٹینک کو کہتے ہیں جس میں رات کے اندھیرے میں دیکھنے کے آلات موجود نہ ہوں۔''

''اوکے!'' موہن نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''ٹینک اندھے تھے اس لیے رات کو ہم آرام کرتے اور اگلے روز کی کاروائی میں حصہ لینے کی تیاری کرتے تھے۔ اس رات اسکواڈرن کے چار ٹینکوں میں ایمونیشن لوڈ کیا جا رہا تھا۔ ہم نے یوسا کو دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک کسی کی نظر پڑی تو وہ ہمارے رسالدار روپ چند کے ٹینک پر چڑھا ہوا تھا۔ اس وقت ٹینک اوپر سے کھلا پڑا تھا، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے اس میں کل کی لڑائی میں استعمال کرنے کے لیے ہر طرح کا ایمونیشن لادا گیا تھا۔ اس میں بڑی توپ کے گولے، مشین گنوں کی گولیوں کے باکس اور ذاتی ہتھیاروں کی گولیاں اور گرینیڈ تھے۔ اس کے علاوہ فیول ٹینک پوری طرح بھر کر ریزرو فیول کے جیری کین بھی رکھ دیئے گئے تھے۔ جب جوانوں نے یوسا کو ٹینک پر چڑھے ہوئے دیکھا تو شور مچا دیا کہ اسے نیچے اتارو، یہ وہاں کیا کر رہا ہے؟ اس وقت کسی کے ذہن میں یوسا کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں تھی۔ وہ تو صرف اسے نیچے اتارنے کے لیے شور مچا رہے تھے کہ یہ سائیں اور بدھوسا انسان ہے، کہیں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ شور سن کر میں بھی ادھر لپکا تا کہ دیکھوں کہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے دیکھا رسالدار روپ چند اسے چمکار کر نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ایسے لگ رہا تھا کہ اسے کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔ وہ تو جیسے دنیا جہان سے بے خبر ہو چکا تھا۔ اچانک ایک رسالدار نے کہا۔

''ہے بھگوان اس کے ہاتھ میں تو گرینیڈ ہے!'' یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے گرینیڈ کی پن کھینچنے کے لیے چھلے میں بائیں ہاتھ کا انگوٹھا پھنسا رکھا ہے اور اسٹرائیکر کو دائیں ہاتھ کی چار انگلیوں سے دبائے ہوئے ہے۔ جب کوئی تربیت یافتہ فوجی کسی ٹارگٹ کو نشانہ بنانا چاہتا ہو تو وہ اسی طرح دستی بم کو حملے کے لیے تیار کرتا ہے۔ پورا اسکواڈرن بوکھلا گیا۔ رسالدار میجر روپ چند نے پاس کھڑے جوان کے ہاتھ سے اسٹین گن لی اور اور یوسا پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یوسا وہیں دو ہرا ہو گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر ہماری دوڑیں لگ گئیں کہ وہ دائیں بائیں گرنے کی بجائے کھلے ٹینک کے اندر جا گرا ہے۔ گرتے ہوئے میں نے خود دیکھا کہ اس نے پہلے پن کھینچی اور پھر گرینیڈ اندر ڈراپ کیا۔ میں آج تک حیران ہوں کہ اسٹین گن کا پورا برسٹ اس کے بدن کو چھلنی کر گیا اس کے باوجود اسے گرینیڈ کی پن کھینچنا کیسے

یادرہ گیا؟'' انہوں نے یہاں رک کر فرائی فش کی رکابی میری طرف بڑھائی۔

''بیٹا آپ کھانا ٹھیک طرح سے نہیں لے رہے۔''

''انکل! قصہ اتنا دلچسپ اور سنسنی خیز ہے کہ میں کھانا کھانا بھول گیا۔'' میں نے ان کے ہاتھ سے رکابی لیتے ہوئے کہا۔

''دلچسپ تو ہے لیکن اس سے زیادہ دُکھی کر دینے والا ہے۔'' انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''انسانی جان بڑی قیمتی شے ہے بیٹا! افسوس جنگیں جیتے جاگتے انسانوں کو نگل جاتی ہیں، مگر ہم ان کی اموات کو گلوری فائی کر کے دل کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں۔''

''جب وہ ٹینک کے اندر گرا تو گرینیڈ کے پھٹتے ہی ایک ہزار پونڈ کے بم برابر، کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔ ٹینک کے پرخچے تو اڑے سو اڑے، قریب پڑے فیول کے بیرل بھی اس کی زد میں آ گئے اور اِدھر اُدھر لڑھک کر قیامت ڈھانے لگے۔ ہمارے چار جوان موقع پر شہید ہو گئے اور مجھ سمیت سات بُری طرح گھائل ہوئے۔ بعض جل گئے۔'' انہوں نے اپنی بائیں کلائی دکھائی جس پر جلنے کے واضح آثار اور ٹانکوں کے نشانات تھے۔

''ٹینک پھٹا تو اس کے ٹکڑے اڑ کر میری کلائی اور ٹانگ پر بھی لگے۔ میری بائیں کلائی ٹوٹ گئی۔ ٹانگ کا تو سارا ماس ہی جل اور ادھڑ گیا۔ اسی بنا پر بعد میں مجھے میڈیکل گراؤنڈ پر سروس سے ڈسچارج کر دیا گیا اور کیپٹن کا رینک بطور اعزاز دیا گیا۔''

''ممکن ہے انڈین آرمی میں آپ کی سروس جاری رہتی تو آپ ایک دن جنرل بن جاتے۔'' موہن نے خیال ظاہر کیا۔

''بیٹا انسان کو جیون میں وہی ملتا ہے جو بھگوان نے اس کے لیکھ نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ ویسے میں سوچتا ہوں۔ جو ہوا بھلا ہی ہوا۔''

پھر وہ بتانے لگے کہ جب وہ فوج سے ڈسچارج ہوئے تو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور اپنی تعلیم مکمل کی۔ پہلے ایک دو جگہ ملازمت کی۔ پھر بزنس کی طرف آ گئے۔ سرکار نے جب ملک میں ایمرجنسی نافذ کی تو ان کا دل ملکی حالات سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ جرمنی چلے آئے اور لگ بھگ چالیس سال سے ادھر ہی مقیم ہیں۔ سال دو سال بعد عزیز رشتہ داروں سے ملنے بھارت جاتے ہیں، اور پندرہ بیس دن وہاں گزار کر واپس آ جاتے ہیں۔

''یہاں آ کر سب سے بڑی بات کیا سیکھی؟''

''یہاں آ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' اپنے بیٹے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے ایک آہ بھری۔ ''سب سے بڑا سبق جو مجھے یہاں آ کر ملا ہے وہ یہ ہے کہ ترقی کرنے کے لئے امن اور آشتی کا ہونا بہت

ضروری ہے۔ یدھ سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، یہ تو خود ایک مسئلہ ہوتی ہے۔ جنگ صرف تباہی لاتی ہے۔ اس میں کسی کی جیت نہیں ہوتی، کیول چند لوگوں کی انا جیتتی ہے، انسانیت ہار جاتی ہے۔ لڑائی میں مرنے والے کسی بھی طرف کے ہوں، وہ انسان ہوتے ہیں۔ وہ جنہیں مار رہے ہوتے ہیں وہ اس سے پہلے ان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا ذاتی دشمن نہیں ہوتا وہ کیول قومی انا کے لیے ایک دوسرے کے بچوں کو یتیم اور سہاگنوں کو ودھوا بنا رہے ہوتے ہیں.....''

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ان کے چہرے پر اندرونی کرب کے آثار تھے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، دل سے کہہ رہے تھے۔ عمر کے آخری حصّے میں ایک فوجی جسے صرف جان لینا اور جان دینا سکھایا جاتا ہے، سچ بول رہا تھا۔

''یہ ملک جرمنی دوسری ورلڈ وار میں مکمل تباہ ہو گیا تھا، بلکہ پورا یورپ تباہی سے دوچار ہوا تھا۔ اس شہر ہیمبرگ پر لگاتار ہوائی حملے ہوئے جس سے سارا شہر اور سی پورٹ کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اتحادیوں کی ائیر فورس نے جب ریلوے اسٹیشن پر بمباری کی تو تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس سے آگ کا طوفان پیدا ہوا۔ پورا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ پچاس ہزار شہری اس آگ میں جل مرے۔ گنجان آباد علاقوں سے دس لاکھ شہریوں کو نقل مکانی کرنا پڑی۔ اسی شہر میں سب سے زیادہ یہودی آباد تھے۔ یہیں سب سے بڑا ہولوکاسٹ ہوا۔ یہیں سب سے بڑا کنسنٹریشن کیمپ تھا جس میں نازی انہیں تڑپا تڑپا کر مارتے تھے۔ چالیس ہزار سے زائد لوگ اس کیمپ میں سسک سسک کر مرے۔ شہر کے شمالی حصے میں اوسدوف سمٹری کے نام سے بہت بڑا قبرستان ہے جس میں ورلڈ وار ٹو میں مرنے والوں کو دفن کیا گیا تھا۔ اگر تم دونوں چل پھر کر دیکھو تو تمہیں ورلڈ وار کے دنوں کے بہت سے آثار اب بھی ملیں گے، جنہیں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ دنیا بھر سے آنے والے ٹورسٹ انہیں دیکھنے جاتے ہیں۔'' انہوں نے ایک بار پھر ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے:

''یورپ والوں کو تو ورلڈ وار کی لائی ہوئی تباہی کے بعد امن اور آشتی کی اہمیت سمجھ میں آ گئی اور وہ آج ترقی کے عروج پر ہیں اور ہم جیسے غریب دیشوں کے لوگ ان کے ہاں روزگار ڈھونڈنے آتے ہیں لیکن..... ہم ستر سالوں سے آپس میں بس لڑ مر رہے ہیں۔ کیوں؟ یہ سوچنا ہم بوڑھوں سے زیادہ تم نوجوانوں کا کام ہے۔ معلوم نہیں ہم دونوں دیشوں کا بھیجا کام کیوں نہیں کرتا کہ امن اور آشتی کا راستہ تلاش کریں۔ ہمارا دماغ صرف ایک دوسرے کی تباہی کے منصوبے ہی کیوں سوچتا ہے؟''

''اس لئے پتا جی کہ ہم دونوں دیش یوسا ہیں!''

موہن نے لقمہ دیا تو ہم تینوں اتنا ہنسے کہ ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

◀◀ ● ▶▶

Hno 263, st 23,Sec C, Askari 14, Rawalpindi, Pakistan
03225070707

● **خالد قیوم تنولی**

مداوانہیں کوئی

سرما کے دن تھے۔ ایبٹ آباد کی گزرگاہوں پر اور باغوں اور جنگلوں میں زرد پتے کھنکھنانے لگے تھے۔ شامیں اور صبحیں تند خنکی میں سانس لینے لگی تھیں۔

اُنہی شاموں میں سے ایک شام میں ہم تین دوست کینٹ بازار کے ایک خاموش ریستوران میں شیشے کی دیوار کے پاس کرسیوں پر براجمان ضیائی مارشل لاء، نصابی موضوعات اور مستقبل کے امکانات پر باہم الجھ رہے تھے۔ پروفیسر حبیب جو کہنے کو تو ہمارے استاد مگر دراصل بے تکلف یار تھے، نہایت خوبرو تھے۔ بن پیئے کے گلابی ڈوروں سے بھری آنکھیں۔ موتیوں جیسے دانت جواُن کی مسکراہٹ کو آفت اور قہقہے کو قیامت بنادیا کرتے۔ وحید مراد ان کا ہو بہو عکس تھا۔ گلیات کی برفانی چوٹیوں پر سے ان کی نظر پلٹی تو مسکراتی آنکھوں سے انھوں نے شمروز اور مجھ سے کہا۔

''لڑکو! یقیناً تم نے کبھی محبت نہیں کی ہوگی۔ تو پھر آج سے ہی ٹھان لو۔ محبت کیے بغیر مرجانے سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں۔'' میں ہنس پڑا تو انھوں نے بناوٹی خفگی کے ساتھ اپنی انگشتِ شہادت سے میری چھاتی میں ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہنس کیوں رہے ہو حکمت؟'' میں نے کہا۔

''میرے حبیب! محبت امیروں کی بازی اور ہم ٹھہرے کوزہ فروش...... ہم اس عیاشی کے کہاں متحمل ہو سکتے ہیں۔''

''ابے او ارشمیدس کے ذور پرے کے نواسے! تو اپنے آپ سے آگاہ ہی نہیں ہے۔ محبت میں اجر نہیں مانگا کرتے۔ سا ہو کار مت بنو۔'' فیروز بولا۔

''گرو جی! کوئی گُر تو دسو۔ یہ نہ ہو کچی نیند سے جاگیں اور مارے جائیں۔''

پروفیسر حبیب نے اپنی گردن کے گرد لپٹے مفلر کو ذرا ڈھیلا کیا، سگریٹ کو راکھدان میں بجھایا اور گویا ہوئے۔

''ہر عمل کا دارو مدار نیت پر ہے۔ نیت تو کروتا تاریو۔''

فیروز نے سدھارتھی دھیان کی اداکاری کی، پھر آنکھیں کھول کر کہا۔

''لو جی! ہوگئی نیت۔''

باہر شام رات سے بغل گیر ہو چلی تھی۔ ہم ہنستے ہوئے اٹھے۔ سر حبیب نے بل ادا کیا۔ باہر نکلے تو زمستانی ہواؤں نے مزاج ہی تو پوچھ لیا۔ ہم کینٹ روڈ پر چلتے ہوئے بڑی شاہراہ پر پہنچے۔ سر حبیب کو رخصت کیا۔ فیروز نے ملک پورہ جانا تھا اور مجھے کالج ہاسٹل۔ لہذا میں نے سڑک عبور کی مگر سامنے وکٹورین طرز کے گرجے کی بغلی گلی کو چھوڑ کر تاج محل سینما کا رخ کر لیا کیونکہ وہاں سے تانگہ مل سکتا تھا۔ سینما کے صدر دروازے سے متصل ایک کھوکھے سے ایمبیسی (جونیئر) کی ڈبیا لی۔ دکاندار سے تین برس کی شناسائی بلکہ گالم گلوچ والی بے تکلفی تھی۔ تاج محل کی رعایت سے میں اسے شاہجہاں کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ طبیعت بھی اس کی شاہوں والی تھی۔ میں اس کا دیرینہ مقروض تھا۔ سگریٹ سلگا اور ایک ملنگی سوٹا لگا کر مڑا تو کسی سے ٹکرا گیا۔ دونوں گرتے گرتے بچے۔ سنبھلا تو دیکھا وہ کوچہ گرد مغنیہ تھی۔ اس حادثاتی ٹکراؤ میں سلگتی سگریٹ اس کے ہاتھ کی پشت پر بُجھ کر ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے پھونکوں سے متاثرہ مقام کو ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ پھر دہکتے رخسار پر ڈھلک چکے ننھے سے آنسو کو سگریٹ سے ڈسے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر بولی۔

''کوئی گل نئیں۔''

''نہ جی نہ گل تو بہت بڑی ہے۔ ہتھ سڑا ہے آپ کا۔'' میں نے اس کا سانولا سلونا، صحت مند اور نمکین سا ہاتھ تھاما اور سگریٹ سے جھلسی ہوئی جگہ پر پلکوں سے بوسہ دیا۔

اس سے قبل اتنی فراخ آنکھیں جن میں گلیات کے جنگلوں کے عمیق اسرار ہوں، پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ آریا اور دراوڑ کا امتزاج تھی۔ شرمیلی سی مسکراہٹ جیسے میراجانی کی برفانی چوٹی پر سورج کی کرنیں منعکس ہو رہی ہوں۔ پہناوا میلا تھا مگر یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا ورنہ ستھرے لباس کو خیرات کب ملتی ہے۔

اس نے کے ٹو سگریٹ کی تین ڈبیاں، چھٹانک بھر کترا ہوا چھالیہ اور پان کے پانچ پتوں کا آرڈر کیا تو شاہجہاں نے بہ سرعت عمل کیا اور لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''لکھ دوں جناب کے حساب میں؟'' میں نے بھی حاتم طائی کی سی شان کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا لیکن دل ہی دل میں شاہجہاں کے درجات بلند ضرور کیے۔ اسی اثناء میں راجے کا تانگہ رکا آواز آئی۔

''خان جی! جلسو یا کھلسو؟''

''جلساں یارا! جلساں۔''

ابھی پائے دان پر قدم دھرا ہی تھا کہ سنا۔

''میں بھی جلساں پرالیاسی تک۔''

''آ وَناں بسم اللہ..... بے بے صدقے۔'' راجا چہکا۔

گھوڑا دلکی چال چلا تو لگا جیسے اپنے سموں سے شب کی نیم تاریکی میں دھرتی کے صفحے پر محبت کی کوئی نظم ٹائپ کر رہا ہو۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھی تھی اور اس کی خوبصورت سے ڈھولکی اس کی گود میں۔

''کیا کچھ گا لیتی ہو؟''

''سب کچھ۔''

''واااہ..... شاواشے..... نام؟''

''گیزاں۔''

''ہائے..... سوہناناں اے۔ میں حکمت ہوں، پڑھتا ہوں کالج میں۔ کہاں رہتی ہو؟''

''اسیں جوگی آں۔ کوئی ٹھکانا نئیں۔ آج اِدھر تے کل کِدھرا ور۔''

''خان جی! لہسو یا چکر لگوا آوں؟'' راجا نے پوچھا تو میں نے کہا۔ ''روک او یار۔ اس ٹھنڈ میں چکر شکر کا کوئی ارادہ نہیں۔''

تانگہ رکا۔ میں اترا۔ اور راجا سے کہا۔

''لالے! کرایہ لکھ دینا میرے حساب میں۔''

''ہَلا جی ہَلا۔ گل ای کوئی نئیں۔''

''چنگا جی! اللہ دے حوالے۔ فیر ملساں۔''

تانگہ چل پڑا۔ ایک ہاتھ دھند میں اوجھل ہونے تک لہراتا رہا۔

دوسرے دن جب میں سرمستجاب سے شیکسپیئر کے 'میکبتھ' پر بحثو بحثی ہو رہا تھا تو قریب سے گزرتے سرحبیب کو آواز دے کر روکا اور آنکھ دبا کر کہا۔

''مرشد! بوٹا لگ گیا ہے۔''

سرحبیب نے قہقہہ اچھالا اور منکسرانہ ادا سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''فقیراں دی دعا اے بچہ۔ شام کو ملتے ہیں۔'' اور ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

شام کو کمپنی باغ میں شمروز اور سرحبیب کے حضور گزشتہ شب میں گزرے اس جذباتی 'سانحے' کی مفصل رپورتاژ پیش کی اور کہا۔

''گرو جی! دل تو گیا اس ڈھولکی کے ساتھ۔ اب بہتر ہے کہ آپ دونوں میری وصیت تحریر فرما

لیں۔ میں بھی بس جانے ہی والا ہوں۔ صبح گیا یا شام گیا۔''

''ابے چپ کر ہرکولیس کی اولاد! خبردار ایسی کوئی بکواس فرمائی تو بھوکے شیروں کے آگے پھنکوا دوں گا۔'' شمروز نے بپھر کر کہا تو سرحبیب اپنی مندی آنکھیں پوری کھول کر بولے۔

''وصیت کی قلمبندی زیادہ افضل ہے۔ کم ظرفوں کو محبت اور عزت کبھی راس نہیں آتی۔''

اس کے بعد دونوں تادیر میری بَھد اڑاتے رہے۔

میں نے بھی پختہ تہیہ کیا کہ آئندہ کیفیت کے لفافے کو سرِ عام نہیں کھولوں گا۔

نگاہِ منتظر کب تک آئینہ بندی کرتی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہرا۔ وہ اس طرح کہ ایک دن بانڈہ دلزاک کے رستم نے گھر پر مدعو کیا کیونکہ اس کی بے بے جی کو گھیا کدو کی کڑھی، سنجی کے ساگ، مکئی کی روٹی اور تمبر وانا ردانہ و پودنے کی چٹنی کا اہتمام کرنا تھا..... اور رستم کی بے بے جی کو اپنے جگر گوشے کے جگری سنگی کی خوش خورا کی کا بخوبی علم تھا۔ ہم دونوں چھت پر دھوپ سینک رہے تھے کہ دفعتاً نیچے گلی میں نمی نمی ڈھولکی کی تھاپ کے ساتھ 'میں چوری چوری تیرے نال لالیاں اکھاں وے' کے بول سنے تو بے اختیار نیچے گلی میں جھانکا۔ وہی کوچہ گرد مغنیہ تھی۔ میں اگلی چند ساعتوں میں اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ رکے، پھر گیت تھما..... گویا نظامِ کائنات ٹھہر گیا ہو۔

نہ اس نے کچھ پوچھا نہ میں کچھ بولا۔ بس اس کا ہاتھ تھاما اور تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نیچے بڑی شاہراہ پر تھے۔ اگرچہ اس کے دھندے میں حرج ہو رہا تھا مگر ہم سوزوکی میں بیٹھے اور ٹھیک نصف گھنٹے بعد شملہ پہاڑی جا پہنچے۔ چڑھائی کے بعد جب ذرا ہموار مقام آیا تو ہم دونوں ہی ہانپ رہے تھے۔ جانے کیا سوچ کر وہ ہنسنے لگی اور بے طرح ہنستی ہی چلی گئی۔

کہنے لگی۔

''دنیا بھی گول دائرہ ہے۔ جس سے بچھڑو وہ دوبارہ ملتا ضرور ہے۔''

میں نے اسے متاثر کرنے کو جھوٹ بولا۔

''میں نے نذر مانی تھی۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

''تم سے دوبارہ ملنے کی.....'' اس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ بولی۔

''اور وہ نذر بھی تم اپنے حساب میں لکھواؤ گے یا نقد ادا کرو گے؟'' میں یہ سن کر قدرے جھینپ سا گیا مگر ڈھیٹ پن میں کون مجھ سے آگے نکل سکتا تھا۔

''زیادہ لال مت ہو۔ ایویں ای کہہ رہی ہوں۔'' اس نے میرے گال پر ہلکے سے چٹکی لی اور کھنکھنائی۔

''یہ جو اس میں چٹو (ڈمپل) سا بنتا ہے، اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ڈرتی ہوں تمھیں میری نظر نہ لگ جائے۔ ماں کہتی ہے کہ میں نظر اور زبان کی بھیڑی ہوں۔''

میں نے بناوٹی گھبراہٹ سے کہا۔

''ایسے موقع پر ماشاءاللہ کہہ دیا کرو۔ تم تو میلہ گھومنی ہو، لیکن میں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ سوائے کالج کے۔''

وہ چپ سی ہوگئی تو میں نے کہا۔

''دیکھو! اگر تمھیں اپنی دیہاڑی ضائع ہونے کا غم ہے تو اسے میرے حساب میں ڈال دو مگر اس طرح یتیمنی بن کر نہ بیٹھو۔ کوئی گیت سناؤ۔ تمہاری خاطر آج میں نے دو دل دکھائے ہیں۔ بھوکا اُٹھ کے بھاگ آیا ہوں۔'' اور پھر ہم نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ میں نے جب کہا۔

''کبھی تمہارا جوگیوں والا ڈیرہ دیکھوں گا۔'' تو وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی۔ بولی۔

''نہ سوہنا! وہ تمہارے قابل نہیں۔ ہم پکھی واسیوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ تم وہاں نہ آنا۔ خوامخواہ کی دشمنی پڑ جائے گی۔ ابا میرا اپیجی ہے۔ برادری کا اکھڑ چوہدری بھی۔ اسے اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ ماں غصے کی تیز۔ سمجھو جلّتی انگارہ مرچ۔ تم پڑھو۔ یہی تم پہ سجتا ہے۔ پریت کا کیا ہے۔ نہ نیند کی محتاج اور نہ جاگ کی۔ وگدی ندی دا پانی۔''

واپسی پر وہ اپر ملک پورہ کی طرف نکل گئی اور میں ہاسٹل چلا آیا۔ اگلی ملاقات کا وقت اور مقام طے ہو چکا تھا اور اس کے بعد سرما کی تعطیلات شروع ہونی تھیں۔ اگلے دن رستم ملا تو من من بھر کی گالیاں دیں اور بتایا۔

''بے بے بہت خفا ہے۔ کہہ رہی تھی کنجر نے اچھا نہیں کیا۔'' میں نے میدان سے سوکھی گھاس کا ایک تنکا اٹھایا اور اس کے سر پر رکھ کر پوچھا۔

''سچ بتا، کنجر ہی کہا تھا؟'' وہ ہنس پڑا۔

''نہیں، لیکن خفا تو ہے نا۔ تو چلا کہاں گیا تھا؟'' میں نے وہیں کھڑے کھڑے بے بے جی کے نام ایک معذرت خواہانہ رقعہ گھسیٹا، تہ کر کے رستم کو دیا اور کہا۔

''کھول کر دیکھنا مت ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔ صرف بے بے جی کو پڑھ کر سنانا ہے۔ وہ تیری ہی نہیں میری بھی ماں ہے۔ اور مائیں کبھی دل سے خفا نہیں ہوتیں۔ ایویں ای شوشا ہوتا ہے بس۔ دوبارہ دعوت کرنا۔ اس بار نہیں بھاگوں گا۔''

گیزاں سے اگلی ملاقات تک زندگی جیسے ڈگر سے اتر گئی۔ گریہ یعقوب وصبرِ ایوب کا سا عالم۔ نہ

انگ چیناں نہ نیند نیناں۔ کتاب کھولتا تو کانوں میں ڈھولکی کی تھاپ گونجنے لگتی۔ کلاس میں پروفیسر حضرات کے لیکچرز بخارات ثابت ہوتے۔ صنم آشنائی ہر معمول پر حاوی ہوگئی۔ سگریٹ نوشی کی رفتار و مقدار بڑھ گئی۔ شاہجہانی رجسٹر میں حساب طول پکڑتا گیا۔ حالانکہ محض تین دن کی ہی تو بات تھی۔

ملاقات ہوئی تو وہ بہت دیر مجھے بغور دیکھے گئی۔ پھر میرے داہنے گال پر ہلکی سی چپیڑ مار کر روہانسی ہوگئی۔

''نچڑ کیوں گئے ہو۔ تمہارے ان گالوں کی وہ چکا چوند کہاں گئی۔ یہ کون سا ڈھنگ ہے جیون کرنے کا۔ وے حکمت! اک گل پکی پکی یاد رکھ۔ ریل کی پٹڑیاں دیکھی ہیں کبھی؟ کبھی نہیں ملتیں پر رہتی ساتھ ساتھ ہیں۔ تیرا میرا جوڑ نئیں ہوسکدا۔ توں مقیم، میں مسافر۔ ہاں یہ مایہاوی پریت مک جائے۔ یہ بھی نئیں ہوسکدا۔ زندگی چار دن دا میلہ اے جانی! کھا پی موج منا پر یہ رانڈ (بیوہ) والی صورت نہ بنا۔'' میں نے بمشکل تھوک نگل کر حلق کو تر کیا۔ بولا تو لگا زبان دانتوں تلے آچکی ہو۔

''باقی سب ٹھیک ہے مگر یہ ریل کی پٹڑیاں؟ کیا ہم ریل کی پٹڑیاں ہیں؟ نہیں..... ہم ریل کی پٹڑیاں نہیں ہیں۔''

اس نے اسی ہاتھ کی پشت سے ڈھلکے ہوئے اشک پونچھے جس پر اب بھی سگریٹ دغنے کا نشان خوب واضح تھا۔ بولی۔

''کچھ سچ آک کی بوٹی کی طرح کڑوے ہوتے ہیں۔ نہ اُگلے جاتے ہیں نہ نگلے۔ چھوڑ، جو کہا اسے مان۔ اسی میں فیدہ ہے تیرا بھی میرا بھی۔ تیری ماں جیوندی رہوے۔ اس تنڑی کے بھی سفنے ہوں گے۔''

وہ میرے لیے پنجیری لائی تھی اور میں نے اسے چاندی کی پازیبیں دیں۔ ہم لیڈی گارڈن میں چیڑ کے ایک پیڑ تلے بیٹھے تھے۔ میں مٹھی بھر پنجیری پھانک کر اس کے پاؤں میں پازیب باندھنے لگا تو جیسے بارش کے بعد دھوپ نکل آئی ہو۔ وہی ملاقاتِ رفتہ والی شناسا ہنسی۔ پوچھا۔

''یہ بھی حساب میں لکھوا کے تو نہیں لائے؟'' میں بھی ہنس پڑا۔

''ہاں..... یہی سمجھ لو۔ سارا شہر ہی اپنا واقف ہے۔''

تیسری ملاقات میں عجب تماشا ہوا۔ میں نے کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔ شیو کئی دن سے نہیں بنوائی تھی۔ سر کے بالوں کو شیمپو کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ نہانے سے بھی گریز تھا۔ محلّہ کیہال میں مراد جدون کی آپا جو ریڈیو پر سکرپٹ رائٹر اور آرٹسٹ تھیں، ان سے گزارش کی۔

''کالج میں ایک ڈرامے کی ریہرسل ہے۔ ٹاسک آپ کے اس برخوردار بھائی کو ملا ہے۔ کردار ایک فقیر کا ہے۔ فقیر بھی وہ جو عشق کے شدید تپِ محرکہ میں مبتلا ہے۔ لِلہ گیٹ اپ بنا دیجیے۔'' آپا بہت

ہنسیں۔سارے گھر کو بلا لیا اور اعلان کیا۔

''اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔''

خیر بہروپ کے لیے مراد کے کپڑوں کا ایک پرانا جوڑا ڈھونڈا گیا۔چہرے، گردن اور ہاتھوں پر کچھ مرکبات کی ملمع کاری کی گئی جس سے اصل جلد گہری سانولی دِکھنے لگی۔ایک رخسار پر نمایاں سا مصنوعی مسّا چھپ گیا۔گلے میں مالائیں اور کلائیوں میں آہنی کڑے پڑ گئے۔ہاتھ میں ایلومینیم کا ٹھوٹھا پکڑا دیا گیا۔آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا تو خود کو پہچان نہ سکا۔نسیم رضا کی نقل میں 'اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں' گایا تو آپا نے سب ٹھیک کا اشارہ کیا اور شاباش دی۔تالیاں گونجیں۔مراد نے اپنے ابّا کے ہنڈا افنٹی پر بٹھایا اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے میں نے کمپنی باغ کے پہلو میں لنڈے والی گلی کے باہر پوزیشن سنبھال لی۔

گیزاں آئی اور میری تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔میں اس کی بے چینی اور اپنے انتظار کی کسک کا لطف لیتا رہا۔یہ دورانیہ دس پندرہ منٹ کو محیط تھا اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ تنگ آ کر کہیں اور نکلنے کو ہے تو میں اس کے پاس گیا اور آواز کو بگاڑ کر بولا۔

''سوہنیو! اگر وہ نہیں آیا تو یہ خادم حاضر ہے۔حکم فرماؤ۔'' لیکن برا ہو میری بے اختیار ہنسی کا جس نے موقع پر ہی میرا بھانڈا پھوڑ دیا۔وہ حیرت سے مجھے دیکھے گئی۔سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لے چکی تو اس کی ہنسی کے کتے بھی فیل ہو گئے۔پوچھا۔

''حکمت! یہ واقعی تم ہو..... کمینے؟''

''جی جناب! تساں دا خادم۔" میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔

''کب سے کھڑا دیکھ رہا ہوں۔نہیں پہچان سکی ناتم۔''

''اللہ دی قسمے۔بالکل بھی نہیں۔لیکن یہ تم نے کیوں کیا ایسا؟''

''بات کوئی خاص نہیں۔بس میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بندے کی 'میں' کیسے مرتی ہے۔اور دوسری بات، پڑھائی مکمل ہونے کے بعد نوکری نہ ملی تو ہو سکتا ہے یہی شعبہ اختیار کر لوں۔تم سکھاتی رہنا۔محنت مجھ پر چھوڑ دو۔اب چلو یہاں سے۔آج کی دیہاڑی تیرے نام.....''

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔عدالت سے فوارہ چوک اور وہاں سے لاری اڈہ اور پھر سلہڈاں کی طرف نکل گئے۔راہ میں ایک جگہ رک کر میں نے اس سے ڈھولکی لے لی اور اس فن میں مہارت کا ثبوت بھی دیا۔

اس دن ہم کئی گلیاں پھرے۔در در کھٹکھٹایا اور گا گا کر خیرات مانگی۔وہ مشترکہ کوشش خوب رنگ لائی۔بڑی بکری ہوئی۔میں نے جوان لڑکیوں کو ان کے خوابوں کے شہزادوں کی، زیادہ عمر والیوں کو نرینہ

اولاد کی اور بوڑھوں کو حج و عمرہ کی سعادت کی گلوگیر لہجے میں وہ دعائیں دیں کہ اگر وہ پتھر کے مجسمے بھی ہوتے تو موم بن کر پگھل جاتے۔جس دہلیز پہ بیٹھے کچھ نہ کچھ لے کر ہی اٹھے۔ایک مائی نے ہمیں کھانا دیا اور بیٹھنے کو گھر کے صحن میں کرسیاں.....اور جب ہم کھا رہے تھے تو اس نے التجا کی۔

''بچیو! تم اللہ والے ہو۔میرا پتر ایک مدت سے قتل کے جھوٹے مقدمے میں بند ہے۔پھانسی کی سزا بول گئی ہے۔وہ اُکا بے خطا ہے۔دعا کرو کوئی کرامت ہو۔میرا اک ای پتر ہے۔'' اور ماں رونے لگی۔

میری بھوک مر گئی۔حلق میں نمک سا گھل گیا۔نوالہ ہاتھ سے چھوٹا اور دست ہائے دعا اُٹھ گئے۔ایسی رقت طاری ہوئی کہ رخسار پر بنا مسّا دُھل گیا۔

عصر ڈھلے ہم واپس شہر آ گئے۔تھکن سے چُور مگر سرشار روح کے ساتھ۔وقت رخصت گیزاں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔پیشانی چومی اور بولی۔

''مان گئی استاد؟ جنم جنم کے فنکار ہو.....لیکن یہ پہلی اور آخری بار سمجھو' میں' تو مر جاتی ہے لیکن وقار بھی چلا جاتا ہے۔ہمارا تو یہ جدی پشتی کسب ہے مگر تم یاد رکھنا، بھوکے مر جانا پر کبھی ہاتھ نہ پھیلانا۔حکمت! وعدہ کرو۔''

میں نے وعدہ کیا اور کرتے کی جیبیں خالی کیں۔دن بھر کی 'آمدن' گیزاں کو زبردستی تھمائی۔حالانکہ وہ اصرار کرتی رہی کہ اپنا کوئی نہ کوئی حساب ہی چکا دو۔

اس رات میں نے ایک بار پھر خوب گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اس ماں کا قیدی بیٹا اگر واقعی بے گناہ ہے تو رہا ہو جائے۔

سردیوں کی چھٹیاں ہوئیں۔کالج بند ہو گیا۔میں بڑے بھائی کے ہاں پشاور چلا گیا۔وہاں نئے دوست بن گئے اور ہم سوات و چترال کی سیر کو نکل گئے۔گیزاں کا خیال آتا مگر نئے ہنگاموں اور رعنائیوں کے جھمیلے میں کھو جاتا۔

ایک دن صبح ہوٹل کی مختصر سی لابی میں اخبار کی شہ سرخی پر نظر پڑی۔

''ایبٹ آباد کی نواحی بستی میں خانہ بدوشوں کی جھگیاں جل کر راکھ، کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔''

دل پر جیسے زور کا ایک گھونسا پڑا۔گیزاں کی صورت نگاہوں میں گھوم گئی۔دل اچاٹ سا ہو گیا۔میں ساتھیوں کو طبیعت کی خرابی کا بتا کر واپس پشاور آ گیا۔

باقی دن زندگی سے بیزاری میں کٹے۔حتیٰ کہ تعطیلات ختم ہو گئیں۔بہار آ چکی تھی۔میں ہاسٹل پہنچ گیا۔نارمل ہونے میں دیر تو لگی مگر میری آؤٹ ڈور سرگرمیاں سکڑ گئیں۔شمروز، مراد، رستم اور سر حبیب سے ہاسٹل میں ہی محفلیں ہونے لگیں جو سالانہ امتحانات کے قریب آتے ہی ختم ہو گئیں۔

ایک شام کینٹ بازار سے کچھ ضروری خریداری کے بعد شاہجہاں کے کھوکھے پر پہنچا اور اسے اپنا گزشتہ کھاتے کا حساب بیباق کرنے کو کہا۔ کل ستاون روپے بنے جو میں نے گالیوں کے سود سمیت ادا کر دیے۔ سگریٹ سلگائی اور ایک طویل کش لگا کر پلٹا تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ نظر اُٹھی تو خود کو گیزاں کے مقابل پایا۔ تعجب، خوشی، تذبذب اور گھبراہٹ نے یلغار کی اور میں نے لکنت زدہ زبان سے پوچھا۔

''تتت.....تم.....زندہ ہو؟'' اس نے بالکل روکھے سے انداز میں جواب دیا۔

''دیکھ نہیں رہے؟ اندھے ہو گئے ہو کیا؟؟''

''اور وہ آگ، وہ اخبار کی خبر..... کچھ بھی نہیں بچا۔ کیا وہ جھوٹ تھا سب؟''

''سچ تھا۔ مگر جھگیاں اور تھیں۔'' اس کا لہجہ ہنوز سرد تھا۔

''شکر ہے۔ میں سمجھا کہ.....''

''یہی کہ گیزاں مر گئی ہو گی۔ تم نے کون سی خبر لی۔ سمجھ لیا مر گئی۔ گل مک گئی۔ خس کم جہاں پاک۔''

''نہیں..... ہرگز نہیں.....ایسا نہیں تھا وہ دراصل.....''

''چھوڑ حکمت! جانے دے۔ کوئی بہانہ مت بنا۔ میں نے کوئی صفائی نہیں مانگی تم سے۔''

''اوہو، سمجھ ہی نہیں رہی ہو۔ گل تو پوری سن لو پہلے۔ میں سوات میں تھا..... یہاں سے بہت دور۔ اور پھر وہ خبر ہی کچھ ایسی تھی کہ.....''

''تُو جہنم میں بھی ہوتا تو تجھے آنا چاہیے تھا حکمت! یہ کیسی محبت ہے جو مرتے کا منہ دیکھے نہ جنازے کو کندھا دے؟ ایک لحاظ سے تو میں ہی مر ہی گئی تھی نا؟ پر چھوڑ حکمت!''

''جانی! خبر کے مطابق.....''

''بھاڑ میں گئی خبر.....'' وہ چلا اٹھی۔

''میں مر گئی اور تُو خبر کو لے کے بیٹھا رہا۔ تو میری قبر پہ گیا؟ ایک بار بھی گیا؟ ان جلی ہوئی جھگیوں کی جگہ دیکھنے گیا؟ جہاں ککھ بھی نہیں بچا۔ کب سے تو واپس آیا ہوا ہے۔ میں مر گئی اور تو میری قبر پہ ابھی تک نہیں گیا؟ گیزاں پہلے نہیں مری تھی پر ہُن مر گئی اے۔'' اور یہ کہتی ہوئی وہ تیزی میں آگے بڑھ گئی۔

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرا نچلا دھڑ بے جان ہو گیا ہو۔

◀◀ ● ▶▶

18-G/834, Milaad Road
Wah Cantt. (Pakistan)
Mob: 03154828119

● پروفیسر اسلم جمشید پوری

دانے کی مٹی

شیونگ کے ارادے سے جوں ہی میں نے آئینے میں اپنی صورت پر نظر ڈالی، چونک گیا۔ کان کی لو کے ٹھیک نیچے ایک چھوٹا سا دانا مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے خود پر مسکرانے والے دانے کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا۔ ''کوئی بات نہیں دانے، کبھی کے دن بڑے تو کبھی کی رات بڑی۔ میں نے بھی تجھے دانے دانے کو مجبور نہ کر دیا تو میرا نام نثار صدیقی نہیں۔''

وقت گذرتا گیا۔ دانا اور میری لڑائی ایک عجیب دور میں داخل ہو گئی۔ میں نے عمر کے پانچ دہے پار کر لیے تھے۔ شوگر کا مرض میری لاپروائیوں سے دنوں دن بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ صبح، شام قدرت کے حسین مناظر اور منازل کی سیر بھی کی۔ لیکن شوگر کا لیول کبھی کم تو کبھی زیادہ اور کبھی خطرے کے نشان تک جا پہنچا۔ اس دوران دانوں کو بھی خوب کھُل کھیلنے کے مواقع میسر آئے۔ انہوں نے میرے جسم کو کرکٹ کا میدان سمجھ کر، ہر حصّے میں میں رن بنائے۔ دانوں کی بہتات سے میں پریشان تو تھا لیکن میں ان سے ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ پھٹکری سے دوائی اور کبھی کبھی ان سے آگے کا سفر یعنی دانے کا آپریشن۔ بظاہر دانے کے آپریشن سے دانے کا قتل ہی ہوتا تھا۔ لیکن اس میں دانے کے ساتھ ساتھ میرا جسم بھی لہولہان ہو جاتا تھا۔ جس پر، دم توڑتا اور مرتا ہوا دانا بھی مسکراتا تھا اور خاموشی سے اپنی وراثت جسم کے دوسرے حصّے کو سونپ کر بے دم ہو جاتا تھا۔

مجھے گھوڑ سواری کا شوق زمانہء جوانی سے ہی تھا۔ میں اپنے دوستوں میں کامیاب شہسوار تسلیم کیا جاتا تھا۔ میرے احباب میری چستی، پھرتی، اور کمالِ فن سے نہ صرف واقف تھے بلکہ قائل بھی تھے۔ شوگر کے مرض نے میرے شوقِ شہسواری پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اب میری چستی پھرتی اور میدان کے جوش میں کمی آ گئی تھی۔ لیکن میری انا اور ضد، نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنی شکست تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھا۔

میں متعدد معجون، دواؤں اور کسرتوں کے استعمال سے خود کو چست درست اور مضبوط و مستحکم بنانے میں لگا رہتا۔ میری قد کاٹھی، خوبصورتی اور پھُرتی مجھے بار بار شہسواری کے قابل بنا دیتی تھی۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا رہا۔ دانے، اپنی نادانی کو دانائی سمجھتے رہتے، اور میں اپنی دانائی سے انہیں نادان ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ کہ اصل دانا تو میں تھا، وہ تو صرف نام کے دانے تھے۔ اسی ہیر پھیر میں کبھی دانے

تو کبھی میں، سرخرو ہوتا رہتا۔ کبھی کبھی تو دانے بے شرمی پر اتر آتے، وہ میرے مخفی حصّوں میں بھی دندناتے پھرتے۔ انہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی جبکہ ایسے مقامات پر دانوں کی موجودگی مجھے علاج کے وقت شرمسار کر جاتی۔

میری شہسواری کا بیّن ثبوت میرا گھریلو میدان تھا۔ جہاں میں نے اپنے زور، دم خم اور طاقت سے ہمیشہ خود کو کامیاب سوار ثابت کیا۔ ہاں جب سے شوگر اور دانوں نے میرے اندر اور باہر اپنا زہر انڈیلنا شروع کیا، میری شہسواری پر حرف آنے لگا تھا۔ کبھی گھوڑا اعلانِ جنگ کے بعد تو کبھی دورانِ جنگ یوں پسپا ہوتا کہ میرا سر شرم سے جھک جاتا۔ لیکن گھریلو میدان میں شرمساری کیسی۔ یہ تو ایسا محاذ ہے، جہاں مقابل بھی اپنا اور سب کچھ اپنے تابع۔ ان سب کے باوجود، شکست کا خوف اور احساس مجھ پر کچھ اس طور طاری ہوتا کہ جی میں آتا سب کچھ خاکستر کر ڈالوں۔

وقفے وقفے سے زمینِ جسم پر اُگ آنے والے دانوں نے میرے جسم کو اندر سے کھوکھلا اور کمزور کر دیا تھا۔ میں شوگر کا ہر ممکن علاج کرتا، ہر طریقہ اپناتا، لیکن میرے خون کی مٹھاس کم ہونے کا نام نہ لیتی۔ ایک بار، ایک دانے، نے مجھے ایسا پریشان کیا کہ میں کیا بتاؤں۔ پہلے تو اُس نے ایسے مقام کا انتخاب کیا کہ دشمن ہونے کے باوجود میں اس کو داد دینا چاہوں گا کہ وہ دانا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس کے اُگنے کے کئی دن بعد، اس کا مجھے اُس وقت پتہ لگا جب خارش اور جلن کے باعث میں نے اپنے ہاتھ سے اسے مل ڈالنے کی کوشش کی۔ میری اس کوشش نے اُلٹے دانے کی منصوبہ بندی میں مدد کی۔ کچھ ہی دنوں میں دانا سرخی اور پیلاہٹ کے ساتھ تندرست و توانا ہوتا گیا۔ میں نے پھٹکری کا استعمال کیا۔ اینٹی بایوٹک کیپسول کھائے، لیکن، دانے کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پایا۔ دانے کا دائرے نما جسم روز بہ روز پھیلتا گیا اور پھوڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ بالآخر ڈاکٹر سے رجوع کیا تو مجھ پر حیرت کا پہاڑ گر پڑا۔ ڈاکٹر نے اپنے تجربات سے ظاہر کیا کہ یہ معمولی دانا نہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ کینسر ہو۔

''نہیں.....نہیں.....ڈاکٹر صاحب آپ ایسا کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں۔ ایسے دانے تو مجھے گذشتہ پندرہ بیس برسوں سے نکلتے ہی رہتے ہیں۔ دراصل میں شوگر کا مریض ہوں۔ دانوں کا میرا پرانا ساتھ ہے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے۔؟ بائیوپسی کرانی ہوگی۔ رپورٹ ہی بتائے گی۔''

اور ڈاکٹر کے آگے میری ایک نہیں چلی۔ گھر والوں اور رشتہ داروں نے بھی ڈاکٹر کے مطابق علاج کرانے کو ترجیح دی۔

میں ایک مریض، بے بس، بے دست و پا، ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں بیڈ پر لیٹا ہوں میرے دماغ میں دانے کی دانائی اور چالاکی گھوم رہی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ دانا، اب تک کا سب سے دانا نکلا تھا۔ اس نے بڑی چابکدستی اور ہنرمندی سے مجھے مات دی تھی، اور اپنی دانست میں مجھے ہر طرح زیر کر دیا تھا۔ لیکن

میں بھی کوئی اتنا کمزور اور ناقص نہیں تھا۔ میں بھی دانا تھا اور مجھے اپنی دانائی پر بھروسہ ہی نہیں فخر تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا خواہ مجھے اپنے جسم پر کسی طرح کا بھی ظلم کرنا پڑے، میں اس دانے کو ختم کر کے ہی دم لوں گا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا کہ اسے جو کرنا ہے وہ کرے۔

ایک ماہ بعد بائیوپسی کی رپورٹ آ گئی تھی۔ ڈاکٹر کا شک صحیح نکلا تھا۔ وہ دانا، دراصل موذی سرطان کی شکل میں آیا تھا۔ گھر کے افراد پریشان ہو گئے تھے۔ میرے علاج کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹر، ہاسپٹل اور نرسنگ ہوم کے مشورے چل رہے تھے۔ آخر کار مجھے لندن لے جانے کی بات طے ہو گئی۔

☆ مجھے لندن آئے ہوئے تین ماہ ہو گئے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر علاج نے مجھے ٹھیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ دانے کی ذرا سی نادانی، میرے لیے نعمت ثابت ہوئی۔ دراصل میرا علاج مرض کے ابتدائی مراحل ہی میں ہونے لگا۔ جس کے نتیجے میں، مجھے کم وقفے ہیں ہی راحت مل گئی۔ میری صحت بھی اب ٹھیک ہونے لگی تھی۔ دورانِ علاج مجھے ایک دن اچانک خبر ملی کہ میری ایک بہت پرانی کالج کلیگ سیما چڈھا بھی لندن میں رہتی ہے۔ سیما اور میں بی ایس سی میں ساتھ تھے۔ کالج کیمپس میں گھومتے پھرتے، موج مستی کرتے، دن یوں ہوا ہوئے کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ سیما قد کاٹھی میں خاصی مضبوط تھی۔ ڈر خوف، اسے چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ نجانے کتنے لڑکے، اس سے مار کھا چکے تھے۔ وہ مرد مار مشہور ہو گئی تھی۔ مجھ سے اس کی خوب بنتی تھی۔ بعد میں سیما نے پیرامیڈیکل کورس میں داخلہ لے لیا تھا اور میں ایم بی اے کرنے لگا تھا۔ ہماری راہیں جُدا ہو چکی تھیں۔ کچھ زمانے تک دونوں کے دل و دماغ میں چہرے محفوظ رہے پھر زندگی کی سخت دھوپ میں یاد کے ساتھ ساتھ چہرے پہلے کمہلائے، اور پھر دھندلا گئے تھے۔

ایک دن اخبار میں دیکھا کہ لندن میں شہسواری کا مقابلہ ہونے والا ہے، اور سیما چڈھا نام کی خاتون اس کی میزبان ہے۔ میں نے پتہ کیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ سیما چڈھا سے سامنا ہوا تو دونوں ایک لمحے کے لیے جم سے گئے۔

''ارے تم.....نثار.....؟''

''اور تم سیما.....؟''

دونوں والہانہ طور پر گلے ملے۔ گلے شکوے، پرانے قصّے، یادیں، موجودہ حالات۔ زندگی کے رنگ۔ سب کچھ کا تبادلہ ہوا۔

''یار نثار تم تو بڑے اچھے شہسوار تھے۔ اب کیا حال ہے؟''

''ہاں یار.....اب تو بہت دن ہوئے.....خلیل خاں نے فاختہ نہیں اُڑائی۔''

''خواہش ہے تو بتاؤ۔''

''کیوں نہیں۔انسان کی خواہش کبھی نہیں مرتی سیما! اور جب تم جیسی میزبان ہو تو پھر خواہشیں، قبر سے بھی باہر لا سکتی ہیں۔''

''تو پھر دیکھتے ہیں، میرے شہسوار میں کتنا ہے دم۔ایک بات یاد رکھو، مجھے ہارنا پسند ہے نا ہارنے والے لوگ۔''

اگلے دن، شہسواری کا مقابلہ منعقد ہوا۔ میری اور میرے گھوڑے کی چستی پھرتی اور طاقت نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو میں مقابلے سے باہر تھا لیکن پھر میرے جوش نے دوسروں کے ہوش اُڑا دیے۔ ہر گذرتے لمحے کے ساتھ میں آگے اور آگے بڑھتا گیا، اور فتح کا علم میرے ہاتھ میں تھا۔گھوڑے میں بلا کا جوش بھر گیا تھا۔ سیما بہت خوش تھی کہ اُسے مجھ سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ سیما نے خوشی سے مجھے لپٹا لیا میں اپنی خوشی کی ساری سیمائیں پھلانگ چکا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا گویا کوئی پری مجھے آسمان کی آخری سیما تک اُڑائے لیے جا رہی ہے۔

وہ رات! اُف کتنی خوش گوار تھی۔ایک اور میدان میرے سامنے تھا۔شہسواری کی تیاری ہو چکی تھی ۔اعلان ہوتے ہی میرے گھوڑے نے جوش اور رفتار سے میدان کی دھول اُڑانی شروع کر دی تھی۔نشانِ فتح قریب ہی تھا کہ اچانک گھوڑے کی روح پرواز کر گئی ۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن میری ساری کوشش رائیگاں گئیں۔روحیں کبھی واپس نہیں آتیں۔

''کوشش کرو.....کوشش۔''

میری حوصلہ افزائی ہوتی رہی ۔ کچھ ہی دیر میں آواز کا رنگ بدلنے لگا۔غصّہ اور انتقام میں شرابور آواز میرے کانوں کے ساتھ میری روح کو نوچ رہی تھی۔ میں میدان کی گیلی زمین میں دھنسنے لگا تھا مٹی مجھے اپنے اندر سمیٹنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔مٹی کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔اس کا جوش اور جنون اس قدر بڑھ گیا تھا کہ میرے انگ انگ میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھی۔میرے گھوڑے کی موت نے مجھ پر غشی طاری کر دی تھی۔میرے زخم جو، نارمل ہو چکے تھے، پھر رسنے لگے، گویا زخموں کے دہانے کھل گئے ہوں میں زخموں سمیت مٹی میں سمایا جا رہا ہوں۔

مٹی فتح یاب ہو گئی تھی کہ اس نے بے شمار دانوں اور شہسواروں کو خاک میں ملا دیا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

CCSUNIVERSITY,
MEERUT,UP,250004

● تنویر احمد تماپوری

اینٹی وائیرس

ایک عورت کا سب سے بڑا مسئلہ دوسری عورت ہوتی ہے۔مسئلہ زیادہ حسین ہو تو زیادہ سنگین بھی ہوتا ہے۔اُم علی کا مسئلہ بھی زیادہ حسین تھا اور جان کو آ رہا تھا۔ایسا نہیں تھا کہ وہ خود کچھ کم حسین تھی۔ایسا بھی نہیں تھا کہ آدھے درجن بچوں نے اس کے حسن کو بھی آدھا کر دیا ہو۔ اور ایسا بھی نہیں تھا کے چالیس پت جھڑوں نے اس کی ذات سے وابستہ ساری بہاروں کو نگل لیا ہو۔ الٹا یہ سب تو اس کی خوبصورتی کو جلا بخش رہے تھے۔بالوں میں چھپی چاندی اور سنہری عینک کا سونا اس کے حسن کے پروفائیل کو مزید بیش قیمت بنا رہے تھے۔

مگر اس نوخیز ملازمہ کے حسن بلا خیز کی بات اور تھی..... بلکہ زیادہ ہی اور تھی۔چنار قد، چاند چہرہ، تیکھے نین نقش، سونے جیسے بال اور انہیں کشمیری شال کی طرح کندھوں پر اوڑھے رکھنے کا سلیقہ۔کل ملا کر عرب کے اس انتہائی خوبصورت پیکیج میں عناصر کی اجزائے ترکیبی بجائے گوشت پوست کے گل وگلقند پر زیادہ منحصر تھی۔ حالانکہ اُم علی نے اس کے گھر آمد پر آمرن ان شن کی دھمکی تک دے ڈالی تھی۔مگر مردوں کے اپنے فنڈے ہوتے ہیں۔سو اس طرح عافیہ نامی وائرس گھر کے سسٹم میں گھس آیا اور اُم علی کی عافیت کی لگ گئی۔

عورتیں چاہے مشرق کی ہوں یا مغرب کی یا چاہے مشرق وسطی کی، ان کے معاملات بھی ان ہی کی طرح پیچیدہ ہوتے ہیں۔جس گھر کی ملازمہ زیادہ حسین ہو، وہاں مالکن کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔اور اگر ساتھ میں ناک نقشے کو ڈیمانڈ ڈرافٹ کی طرح بھنانے کا ہنر بھی رکھتی ہے تو مالکن کے رت جگے اور کام سے چھٹیاں لازمی ٹھہرے۔ایک ہفتے سے اُم علی بھی کام پر نہیں جا پائی تھی۔اس کی ساری پیشہ ورنظم کا اس لڑکی نے دھڑن تختہ کر دیا تھا۔ وہ ملک کے ایک بڑے سرکاری اسپتال میں پرسنل ڈپارٹمنٹ کی بڑی آفیسر تھی۔مگر اب ترجیحات بدل چکی تھیں۔اس کے اپنے پرسنل معاملات توپ کے دہانے پر تھے اور توپ بھی ایسی کہ الامان والحفیظ۔

عافیہ کا تعلق علاقہ عجم کے کسی ملک سے ہوتا تو اُم علی کی نیند اور مٹی یوں پلید نہ ہوتی۔تھوڑے دن کا کھیل تماشا پھر جمورا اپنے گھر۔مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا۔وہ عرب کے کسی ملک میں چھڑی خانہ جنگی کی پیداوار تھی۔اس کی ذات میں بلا کا حسن اور زمین کی روایتی بود و باس تھی۔ دعوت نظارہ دیتا ہوا سرخ وسفید رنگ اور دل کش سراپہ صنف مخالف کے لیے لٹتے ہوئے لنگر سے زیادہ پرکشش تھا۔وہاں آنکھوں کی زبان

ہی کیا کم تھی کہ وہ اہل زبان بھی تھی اور اوپر سے جسمانی خط وخال کی بھول بھلیاں الگ..... بندے کی نگاہیں واپسی کا راستہ ہی بھول جائیں۔ اُم علی مصروف ہوتی تب بھی اور فارغ ہوتی تب بھی..... عافیہ کے وسوسے اسے اکیلا نہ چھوڑتے۔ آج کل اس کے دماغ کی ساری برقی لہریں ایک ہی سمت دوڑ رہی تھیں۔ پھر کام سے چھٹیوں کا دور شروع ہوا۔ ایک آدھ بار سے ہوتے ہوتے بار بار ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں دو کے بجائے دو درجن ہوتیں تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔ انہیں سی سی ٹی وی کیمرے کی طرح گھر کے ہر کونے میں ٹانگ کر اپنے پیچھے ہونے والی ٹامک ٹوئیوں کی ٹوہ لیتی۔

ایک دن جب وہ اسپتال سے گھر پہنچی تو گھر کی فضا اسے کچھ عجیب سی لگی جیسے چڑیوں نے کھیت کو چگ دیا ہو۔ جیسے اس کی سلطنت کی مضبوط دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہوں۔ اپنے سر کے شاہین کو کسی دوسرے کے ہاتھ کا کبوتر بنتے دیکھ اس کے اپنے ہاتھوں کے طوطے پر تولنے لگے۔ وہ دو دھاری تلوار کی زد میں تھی، نہ روسکتی تھی اور نہ سوسکتی تھی۔ لہٰذا شریفوں کی طرح محتاط رہ کر ہوا کے موافق ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ویسے بھی بڑھتی عمر کا ہاتھی بڑا کمزور ہوتا ہے۔ اس کے لیے تو ابابیل کی چونچ کے کنکر ہی کافی ہوتے ہیں۔ یہاں تو کسی حسینہ عالم سے پالا پڑا تھا۔

آج پہلی بار اسے گذرے ہوئے ماہ وسال پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ ماضی کے چاند سورج بھی ابوعلی کے سامنے بے بس ہی رہے ہوں گے یا الٹا اس کی شخصیت پر کچھ رعونت اور دبدبے کا مانجھا ہی چڑھا گئے تھے۔ عرب کے روایتی لباس کے بجائے ارمانی سوٹ پہن لے تو کوئی امریکی اداکار جیسا لگتا تھا۔ اداکار تو وہ تھا ہی۔ بس کردار بدلتا رہتا تھا۔ آدھی صدی پرانا ابوعلی اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی کے ساتھ آج کل رومانس کی اداکاری میں مصروف تھا یا کم سے کم اُم علی کا یہی خیال تھا۔

آج کل رت جگے کسی کاغذ پر پڑے پیٹرول کے دھبوں کی طرح بڑی تیزی سے اُم علی کی زندگی اور عقل پر پھیل رہے تھے۔ چونکہ قطری بیگمات کے پاس نوکر چاکر، پیسہ، پاور اور بڑی بڑی گاڑیاں تو بے شمار ہوتی ہیں، مگر ان کا بس اپنے اختیارات کی ایکسپائیری ڈیٹ پر نہیں ہوتا تھا۔ ان سب سامان تعیش کی کنجیاں یہاں مردوں کے اشاروں پر کھلتی ہیں۔ دوسری صبح کے سورج کی بے یقینی ہی ان بیگمات میں بے چینی اور بے وقعتی کی واحد وجہ تھی۔

اس وقت بھی سونے اور جاگنے کے بیچ نیند میوزیکل چیر کا کھیل، کھیل رہی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے لگا ابوعلی اپنے بستر پر نہیں تھا۔ رات کے اس پہر کسی مرد کا اپنے بستر سے غائب رہنا ایک بہت بڑا حادثہ ہی مانا جائے گا جو اس کی عورت کے دل میں دوڑ رہے شک کے گھوڑوں کی مہمیز کے لئے کافی ہوتا ہے۔ دماغ کے اندر اندیشوں کا پینڈولم بگ بین کی طرح دونوں کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اسی وقت

ہڑبڑا کر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

''ارے تو کیا یہ سب خواب تھا؟'' وہ بڑبڑانے لگی۔ مرض بڑھتا جارہا تھا۔ آج کل سونا درحقیقت اس کے لیے سونے جیسا ہی ہوگیا تھا۔ نیند کسی نیتا کے وعدوں کی طرح بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ پھر تو..... باقی بچی رات ام علی کی نیند اور ابوعلی کے خراٹے آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہے۔

گرما کی سالانہ چھٹیاں شروع ہوئیں۔ ابوعلی کا قافلہ خانہ بدوشوں کی طرح پچاس میل اندر صحرا میں چھٹیاں گذارنے کی خاطر خیمہ زن ہوا۔ پانچ گاڑیاں، تیرہ انسان، کچھ مویشی اور ایک عقاب پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ ضرورت کی ہر چیز سے لیس تھا۔ صحرا کے بیچوں بیچ چٹیل میدانوں میں اچانک اُگ آنے والی آدھا درجن خیموں کی چھوٹی سی یہ بستی کسی کہنہ مشق مصور کا شاہکار لگ رہی تھی۔ ان کے پاس کھانے پینے کے سارے سامان سے لے کر شکار کے بھی ضروری اوزار جمع تھے۔ دن بھر بچے کھلونا کاروں اور فٹ بال کے پیچھے پڑے رہتے۔ بڑوں کے عتاب سے زمین پر رینگنے والے حشرات بچتے نہ آسمان میں اُڑنے والے پرندوں کی گلوخلاصی ہوتی۔ شام ہوتے ہوتے سارے ہی لوگ کھانے اور پکانے میں جٹ جاتے۔ جس دن شکار نا کافی ہوتا اس دن ساتھ لائے گئے بکروں میں سے کسی کی ماں خیر مناتی ہی رہ جاتی۔

صحرا میں گرمیوں کی راتیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔ اگر پورے چاند کی چاندنی بھی ساتھ ہو تو لگتا ہے پریاں زمین پر بیلے ڈانس کر رہی ہیں۔ اوپر اللہ کی رحمت کی طرح پھیلا ہوا آسمان اپنے دامن میں چاند ستاروں کی کشیدہ کاریوں پر اترا رہا تھا۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ اُم علی اپنے بستر پر نیند کی منتیں کرنے میں مصروف تھی۔ نیند کی دیوی دور شاید عافیہ کے علاقے میں کہیں عیش لکھ رہی تھی۔ بغل میں ابوعلی حسب معمول خراٹوں کی نشریات پر معمور تھا۔ باہر چاندنی اُم علی کے خیالات ہی کی طرح دھول بن کر اُڑتی پھر رہی تھی۔ صحرا کی یہ حسین رات اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ مگر حالات ضرور نئے تھے چونکہ پہلے یہاں ایسی راتوں میں ابوعلی اور اس کی محبت اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ راوی اس کا اپنا غلام ہوا کرتا تھا۔ ہمیشہ عیش ہی عیش لکھے گئے تھے۔ مگر معاملات اب دوسری نہج پر تھے۔

اچانک خیمے کے باہر کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ان پراسرار آوازوں سے اسے کچھ ڈر سا لگا۔ لگا شاید وہ صحرائی لٹیروں کے بیچ گھر گئی ہے۔ یا شاید کچھ مویشیوں نے اپنی رسی تڑوالی ہے۔ یا شاید یہ کچھ انسانوں کے قدموں کی چاپ تھی جو نہایت احتیاط سے دُم دبا کر چل رہے تھے۔ اچانک اس کے دماغ کا وہ حصہ متحرک ہوا جہاں عافیہ کا ناجائز قبضہ تھا۔ وہ آناً فاناً خیمے سے باہر تھی اور باہر کے حالات اس کی پہنچ سے باہر، کیونکہ وہاں کا منظر وہی تھا جس کا اندازہ اسے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ نوکروں کے خیمے کی طرف جاتے

ہوئے اس انسانی ہیولے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ جو کسی ڈرون کی طرح پلٹ پلٹ کر حملے کر رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے روکے، اسے پوچھے اور دھمکائے۔ مگر خود ہی اپنے خیال کو رد کرنا پڑا کیونکہ جب حسن حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو زر اور پر نکل ہی آتے ہیں۔ اس وقت اس کی اداس آنکھوں میں اس لڑکی کا جاتا ہوا منظر برف بن کر جم گیا۔ لہٰذا نیند کے لیے وہاں کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ پھر تو باقی بچی رات وہ دل و دماغ کے ان حصوں میں مشغول رہی جہاں شک اور اندیشوں کے کارخانے قائم تھے۔

صحرا سے واپسی پر وہ کسی قدر خوش ہوئی۔ گھر کی چاردیواری کے علاوہ بھی اس کی اپنی ایک پہچان تھی اور وہ اپنے آپ کو آج کل اس کردار میں زیادہ کامیاب اور اہم محسوس کر رہی تھی۔ وہاں لوگوں کو اس کی بات کی، اس کی ذات کی اور اس کے کام کی پرواہ تھی۔ اپنے گھر میں جہاں کی بلا مبالغہ وہ کل تک رانی تھی آج معاملات اور رتبے بدل رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عافیہ کے چنگل سے کیسے بچائے۔ اسے لگ رہا تھا ابوعلی دھیرے دھیرے عافیہ نام کے دلدل میں گلے گلے تک دھنس رہا ہے۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ والے اس گیس چیمبر میں اپنے آپ کو کب تک زندہ رکھ سکتی تھی۔ اسے اس جان لیوا ماحول سے جان چھڑانا تھا۔ وہ اپنا حال اپنی دوست حلیمہ جیسا نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا اسے خود کا اپنا ایک دفاعی نظام بنانا تھا، اور مشکل یہ تھی کہ کسی بھی نئے نظام کو بنانے کے لیے جس پاس ورڈ کی ضرورت تھی وہ صرف ابوعلی کے پاس تھا۔

ان دونوں کی جملہ چھے اولادیں تھیں۔ جن میں دو جوان لڑکے علی اور خالد، دو نو عمر لڑکیاں اور دو چھوٹے بچے شامل تھے۔ کل ملا کر آٹھ افراد کے اس چھوٹے سے گھرانے میں عرب کی روایتی خوشحالی دراصل تیل کی دولت کی مرہونِ منت تھی۔ چونکہ سوتن یا سوتیلی ماں جیسی کوئی جنس اس کے در و دیوار نے پہلے کبھی دیکھی نہیں تھی اس لیے اسے منفرد بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اچانک عافیہ نامی غلط ہوا مخالف سمت سے چلنے لگی اور دھیرے دھیرے ایک زوردار آندھی میں بدلنے لگی۔

آج اسپتال سے واپسی میں ام علی نے اپنے شوہر سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر میں اپنی حیثیت کا دوبارہ تعین چاہتی تھی۔ اسے اپنے اندیشوں کی تہہ میں چھپی سچائیوں کو بھی کھنگالنا تھا۔ اسے پتا تھا اس اقدام کے نتائج اس پر پلٹ بھی سکتے تھے۔ پھر بھی وہ اٹل تھی۔ لہٰذا اسپتال سے سیدھا بیڈ روم میں گھس آئی اور ابوعلی پر سوالات کے گولے داغنے شروع کر دیے۔

''اس گھر میں یا تو میں رہونگی یا وہ......اب بات برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔''

''کس کی بات کر رہی ہو تم......؟'' ابوعلی بات کو سمجھ تو گیا تھا مگر اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''جیسے آپ کچھ جانتے ہی نہیں۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو......اس سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں......تم تو جانتی ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

اور یہ سچ تھا ابوعلی کو جاننے والا ہر ذی نفس اس بات کی گواہی دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ ہو سکتا تھا مگر جھوٹا بہر حال نہیں تھا۔ اسے عرب کا ہریش چندر بھی کہا جا سکتا تھا اور اس بات کی اُم علی بھی قائل تھی۔

''تو پھر اس وائیرس کو گھر میں رکھنے کی وجہ؟''

''علی اور خالد......''

''ہائیں......'' اُم علی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''آپ دنیا کے پہلے ایسے باپ ہوں گے جو اپنے جوان بچوں کی بربادی کا خود ہی انتظام کر رہے ہیں۔''

''پاگل عورت! میں اپنے جوان بچوں کی بربادی کا نہیں بلکہ اپنے چھوٹے بچوں کی حفاظت کا اہتمام کر رہا ہوں۔ تم بات کو سمجھے بغیر ادھم مچانے لگتی ہو۔''

پھر اُم علی چپ ہو رہی۔ شاید وہ ''بات'' سمجھ گئی تھی۔

◄◄ ● ►►

Post Box No. 4398
Alriyadh 1191 KSA
+966501724826

نام کتاب: معرض اظہار صنف: تنقید مصنف: محمد رضا کاظمی سن اشاعت: ۲۰۱۳ء صفحات: ۱۳۶ قیمت: ۴۰۰ روپے رابطہ: C/o AlfazFoundation,B-116/A, Amroha Society, Sector-37/A,Scheme 33, Gulzar-e-Hijri,Karachi-75290 (Pakistan)	نام کتاب: اعتراف وانحراف صنف: تنقید مصنف: صبا اکرام سن اشاعت: ۲۰۱۲ء صفحات: ۲۰۰ قیمت: ۳۰۰ روپے رابطہ: C-102,Rafi Sweet Home,Gulshan-e Umair,Opp:Race Club,Main University Road,Karachi-75280(Pakistan) Ph:0300-2164282

● رابعہ سلیم

کپاس کا کتا

چالیس سال کا خصم جب بیس سال کی لڑکیوں کے ساتھ ٹی ٹونٹی کھیل رہا ہو تو کیا ضرورت ہے گھر کے آنگن میں چیئر لیڈر بننے کی؟ اس نے تو سدھرنا نہیں۔ شور مچانے سے بچوں کو گوگلی اور باؤنسر کا فرق مفت میں سمجھ آجاتا ہے۔ اسٹیج والی نرگس نے ایک بار کہا تھا۔

''مرد سرہانے کا سانپ ہوتا ہے۔ غلطی سے چار پیسے آجائیں تو دو جی ڈھونڈنے نکل پڑتا ہے۔

شکر ہے میرا شوہر ایسا نہیں، وہ بہت اچھا ہے۔

غریبی میں بھی رج کے بیوفا تھا اور فراخی میں تو اور نکھار آگیا ہے۔ مقدر کھلنے سے پہلے ہی دھوتی کھول کر کندھے پہ رکھ لی۔ اگر اسے اپنی ماں کا ڈر نہ ہوتا تو گھر میں ڈربہ کھول لیتا۔ بیٹے بال بچوں والے ہوں تو مائیں کماؤ پوتوں سے بات کرتے جھجکتی ہیں۔ مگر میری ساس، بات کرنے سے پہلے ہی پلاسٹک کی چپل دے مارتی ہے۔ بیٹوں کو جوتے کا تلا سمجھتی تھی۔ بہوئیں خود ہی جرابوں کی طرح پیروں سے لپٹی رہتیں۔

میں نے سیدھا ان سے جا کر شکایت کی تو کھلکھلا کر ہنس پڑیں، کہنے لگیں۔

''کاکی! کتا کپاس میں سے گذر جائے تو کھیس نہیں بُن لیتا۔ پھر بھی آج آلینے دے اس کنجر کو۔''

وقار کی کتے خوانی تو قصہ خوانی سے بھی زیادہ ہوئی۔

مگر کنجر خانہ وہیں کا وہیں رہا۔

میرے پاس تین بچے تھے۔ بچے خود کے بارے میں سوچنے کا وقت کہاں دیتے ہیں۔ سو دھیرے دھیرے میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ اب ویلے کویلے سے بھی جان چھوٹی۔ اور تو اور رازداری کا میرا تکلف بھی ختم ہوگیا۔ اب نئے معاشقوں کے قصے، لڑکیوں کے نام، موبائل پہ تصویریں، روزمرہ کا حصہ بن گئے۔ وقار سب سنا دیتا۔ میں سب سن لیتی۔ ان کے فون بھی اٹینڈ کر لیتی۔

''باہر گئے ہیں، آتے ہیں تو بات کرواتی ہوں۔''

دھیرے دھیرے میری نظر میں ان سب کی اہمیت پبلک ٹوائلٹ سے زیادہ نہ رہی۔ وقار کی ایک بات اچھی تھی۔ وہ خود بھی انہیں پینٹ کی اگلی اور پچھلی جیب تک محدود رکھتا تھا۔ کتا کھیس کے چکر میں نہیں

پڑا۔ بس مجھے ان پیسوں کا دکھ ہوتا، جو بچوں کے مستقبل میں کام آنے تھے۔ اب، گشتیوں کے ہاں جا رہے تھے۔ پھر سوچتی، کماتا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے! اگر لٹاتا ہے، تو بھی اسی کی کمائی ہے۔

اس کا نام فائزہ تھا جس نے میری آواز سنتے ہی بڑبڑا کر فون بند کر دیا۔ تین سال میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ عورت کتنی بھی سیدھی ہو۔ لیکن اگر شوہر آئن سٹائن نکل آئے تو ماڑی چنگی سائنس پڑھ ہی لیتی ہے۔

میں سمجھ گئی یہ ایڈہاک، مستقل ہونے کے چکر میں ہے۔ دو دن بعد رات کو جب وقار کا موڈ خوشگوار تھا میں نے فارمولہ لگایا۔

''فائزہ کی آواز کتنی پیاری ہے۔'' انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

''اچھی لڑکی تھی۔ فون نہیں کرتی اب؟'' میں نے ایک رگ اور دبا کر دیکھی۔

انہوں نے جھٹ سے نمبر ملایا اور دو چار واہیات جملے، اور مسکراتی گالیاں دیتے ہوئے مجھے اپنی مردانگی کا ثبوت دیا۔ میں نے اشارے سے کہا، ''میری بات کروائیں۔''

''لو میری بیوی سے بات کرو۔'' ادھر سے فائزہ نے شاید چٹا جواب دے دیا تھا۔ اب بات گالیوں سے ہوتی ہوئی ترلوں تک آگئی۔ مردانگی گئی تیل لینے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ملے نہ ملے پانی یہیں ہے۔ انہوں نے فون بند کر دیا۔ بندہ سیانہ تھا۔ کچھ کہا نہیں۔ کروٹ بدل پڑا رہا۔ صبح تڑکے ہی میں نے مطالبہ کر دیا۔

''چاہے دس اور بھرتی کر لو۔ فائزہ کو چھوڑ دو؟''

''کیوں؟'' اسے ایسے احمقانہ احتجاج کی امید نہیں تھی۔

''وہ گشتی مجھ سے اپنا موازنہ کر رہی تھی۔ مجھے سوتن سمجھ رہی ہے۔ مجھے وہ اچھی نہیں لگتی۔ میں نے لاڈ سے کہا۔ وقار کو میرے اچھے برے لگنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ چلا گیا۔

رات گیارہ بجے فلم دیکھتے دیکھتے اچانک اس نے فائزہ کو کال کی ادھر ادھر کی ہانک کر فون مجھے تھما دیا۔

''لو بات کرو۔'' میں سمجھ گئی کہ چڑیل قابو کر کے آیا ہے۔ میں نے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔

دن گذرتے رہے۔ کاروبار جتنی تیزی سے اوپر گیا تھا۔ دوگنی تیزی سے نیچے آیا۔ دو وقت کی بھی مشکل ہوگئی۔ وقار نے نوکری کر لی۔ اور بچ بچا ہوگیا۔

پانچ چھ سال بعد ایک دن بازار میں مجھے وہ نظر آگئی۔ میں نے قریب جا کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ سوہنی تھی۔ شاید وقار نے اسے میری تصویر نہیں دکھائی تھی۔ اس نے مجھے پہچاننے سے

انکار کر دیا۔

''آپ فائزہ ہو؟'' میں نے پوچھا تو، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کون؟''

''میں وقار کی دوست ہوں، وقار نے آپ کی تصویر دکھائی تھی۔'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔ دو چار کھڑے کھلوتے جملوں کے بعد ہم دونوں بازار میں رکھے پتھر کے بنچ پہ آ بیٹھیں۔

''آپ بھی وقار سے.....؟'' اس نے بیٹھتے ہی پوچھ لیا۔

''نہیں میرا بس دوست تھا..... وہ تمہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا'' میں نے اس کے چہرے کے تل کو بغور دیکھا، اصلی تھا۔

''مجھے لگا تھا کہ تم وقار سے شادی کرو گی۔'' میں سیدھا مدعے پہ آ گئی۔

''وقار مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی ماں کا اس پہ بہت دباؤ تھا۔ وہ اسے جائیداد سے عاق کر دیتی، اگر میں، اس سے.....'' میری ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''آخری بار کب ملے تھے تم دونوں؟'' میں نے پوچھا تو اس نے گہرا سانس لیا۔

''تین سال پہلے۔ تب وہ مجھ سے لپٹ کے بہت رویا تھا'' فائزہ کی آنکھوں میں نمی تھی۔

میں وہاں سے اٹھ گئی۔ اس سے ہاتھ ملایا اور چل دی۔

مجھے پندرہ سال پہلے، اپنی سہاگ رات یاد آ گئی۔ تب وقار نے مجھے اپنی پہلی محبت کے بارے میں بتایا، جس کے ساتھ اس کی ماں نے شادی نہیں ہونے دی تھی۔ وہ کتنا رو رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمیٹا تھا۔ مگر وہ اب بھی رو رہا تھا۔

کاش میں فائزہ کو بتا سکتی کہ میری ساس کتنی اچھی ہے۔ اور نہ ہی میں اپنی ساس کو بتا سکتی ہوں کہ تمہارا پتر کتنا کمینہ ہے۔

کتاب اب بھی کپاس میں ہے۔

◂◂ ● ▸▸

"Dar Goods"
G. T. Road
Kamoke, Gujranwala
03225649991

● ناهید طاهر

وارث

زندگی جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی کٹھن!! خاص کر ایک نامکمل شجر تلے، تپتی دھوپ سہنا کوئی آسان کام نہیں جو مایا سہہ رہی تھی۔ غموں سے بوجھل زیست خون کے آنسو بہانے پر مجبور تھی۔ وہ گھنٹوں سوچتی، یہ راتیں کیوں اس قدر عجیب ہوتی ہیں۔

''گلابی راتیں.....''

''بھیگی راتیں.....''

''متوالی راتیں.....''

ہر رات ایک نیا زخم، ایک نیا عذاب.....! بے زور امنگیں.....نا کام آرزوئیں.....وحشتیں اور بے بس حسرتیں.....اور.....خلش میں ڈوبی سسکتی ہوئی چادر کی سلوٹیں.....!! یخ بستہ راتوں میں لہکتے شعلوں کو بجھانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا شاور کا یہ ٹھنڈا پانی.....!

''دسمبر کی خنک راتیں ہی میرا مقدر کیوں؟'' بے شمار سوال ذہن کو تھکا دیتے لیکن ہر سوال کا جواب ندارد.....!!!

مایا کی زیست یاسیت کا کفن اوڑھے سسک رہی تھی۔ سماج اور اس کے ٹھیکیدار نے کبھی لب کشائی کا موقع بخشا اور نا ہی حوصلہ! ذہن میں ہزار سوالات کے ساتھ ایک اور سوال ناگ کی طرح ڈستا رہتا۔

''کیا مرد، یوں یخ بستہ راتوں میں شاور کے نیچے کھڑا زیست کی اتنی قیمتی راتیں قربان کر سکتا ہے؟'' پھر وہ خود ہی جواب دیتی۔

''کبھی نہیں! بلکہ آوارگی اسے بند گلیوں میں پوشیدہ کوٹھوں تک پہنچا دے گی، جہاں وہ مدہوش عیاشی کا جام ہونٹوں سے لگائے جھوم رہا ہوگا..... یا پھر شرعی حق کا استعمال، ایک اور نیا ساتھی.....!!

اکثر وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے عکس سے سوال کرتی ''مایا! معاشرے کی مستند ذہنیت کا تجھے علم ہے؟'' عکس جواب دینے لگتا

''نہیں۔''

''ارے.....جواب ہوگا.....مرد میں قوت برداشت کہاں؟ برداشت تو صرف عورتوں کا شیوہ ہے۔''

''شریک حیات کا فوت ہونا.....نہایت غم کا مقام.....''

''سن مایا! بیوی اگر بیمار.....کسی مرض میں مبتلا.....تکمیل ضروریات.....؟ ایک اہم سوال، جو نہ صرف مرد بلکہ پورا خاندان، سماج مضطرب.....پھر تو مکمل جہاں مرد کا ہمدرد.....''عکس دھندلا ہونے لگتا.....دراصل اس کی اپنی آنکھیں سیلاب کا شکار تڑپ رہی ہوتیں جس میں عکس کے ساتھ دنیا کی ہر شے ڈوبتی نظر آتی۔

داستانِ مایا! جہاں اس کا خاوند خوفناک خراٹے لیتا ہوا شب بھر ''جاگتے رہو!'' کی صدا بلند کیے رات کی چادر کا کفن اوڑھے جیسے لحد میں مدفن ہوتا.....اور.....مایا.....جسے راتوں سے عشق تھا وہ تو شب بھر جاگتی۔ جی میں آتا اس زندہ لاش کو لحد سے کھینچ نکالے اور اس کے بازو پر سر رکھے گہری نیند سو جائے۔ لیکن مشرقی خاتون، دنیا کی سب سے بزدل اور کمزور خاتون ہوتی ہے۔ پس اس آرزو کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر، اپنی وحشتوں کو دور کرنے کی کوشش میں کبھی کوئی رسالہ پڑھ لیا، کبھی ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھ لیا۔ آخر تھک جاتی تب شاور کے نیچے کھڑی سوچتی۔

''ہر شب کی قسمت میں صرف محرومیاں ہی کیوں؟'' افسوس کوئی جواب وجود میں لہراتی تپش کو سرد نہیں کر پاتا۔ جسم نڈھال، کراہ اٹھتا، ناک سرخ انگارہ، مسلسل بہنے لگتی۔ شدید زکام کا حملہ.....پھر وہ بڑی بے بسی محسوس کرتی ہوئی لحاف میں خود کو چھپا لیتی۔ بے رحم نیند کو کچھ رحم آتا اور وہ اس کی بوجھل پلکوں پر چلی آتی اور اگر نیند نے رحم نہ کیا تو وحشت زدہ شاہ زیب سے سوال کرتی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے، کیا کروں؟'' جواب ملتا۔

''تم ایک ذہنی مریضہ ہو۔''

''الزام تراشی.....'' وہ تڑپ اٹھتی۔

''بہت ڈھیٹ اور بے شرم ہو۔'' وہ خواہ مخواہ ہی غراتا۔

''بیوی ہوں آپ کی.....یہ میرا شرعی حق ہے۔'' وہ نڈھال ہو جاتی۔

''نماز روزے میں دل لگایا کرو، شیطان تمھارے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

''واقعی شیطان مردود پیچھے لگا ہے، پلیز اس سے چھٹکارہ دلا دو.....کوئی علاج کرلو.....تاکہ شیطان سے رہائی حاصل ہو۔''

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو'' اس قدر اونچی آواز میں چلاتا کہ وہ سہم جاتی۔

شادی کے تین سال بعد بھی جب مایا نے خاندان کو کوئی وارث نہیں دیا تو خاندان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ متوسط درجے میں بہت سے بنیادی اصول وضوابط میں یہ بھی شامل کہ شادی کے فوراً زندگی کچھ ترقی کرے یا نہ کرے لیکن آبادی میں اضافہ بے حد ضروری ہوتا۔ اگر یہ نہیں تو پھر ایسی عورت کو بانجھ کے لقب سے نوازا جاتا جو ایک عورت کے لیے سب سے بڑی گالی اور زخم ناسور ہوتا ہے۔

''تیری بیوی بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں۔'' ایک دن ساس صاحبہ سینے میں دبی آرزو کے ساتھ چیخ پڑیں۔

''میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟ اپنی بہو کا علاج کروائیں۔'' اِس موضوع سے جان چھڑانے کی خاطر اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

کچن میں کھڑی مایا شوہر کی بات پر غصے سے کانپ اٹھی۔ کوئی اس قدر جھوٹا اور سفاک کیسے ہو سکتا ہے؟

''آپ.....!'' وہ کپکپاتی ہوئی باہر آئی۔ اس سے پہلے کہ مایا کوئی لب کشائی کرتی اس نے نہایت سفاکی سے وار کیا۔

''امی! اس عورت کا کچھ کرو.....یہ آدھی رات کو شاور لیتی ہے.....کبھی یخ بستہ راتوں میں کمرے سے نکل کر کھلی چھت پر تارے گننے بیٹھ جاتی ہے۔ شاید بھوت پریت کا سایہ ہے۔'' جواب میں مایا نے لب سی لیے، ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی بوندیں سرخ رخسار پر پھیلتی ہوئیں اپنی بے بسی پر تڑپتی نظر آئیں۔ روح کو چھلنی کرتا ہوا وہ تو آفس چلا گیا اس کے بعد چار گھنٹوں تک مسلسل ساس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ آخر ساس صاحبہ، منصف بن کر یہ فیصلہ سنا کر قلم کی نب توڑ ڈالی کہ شاہ زیب دوسری شادی کرے گا۔

شاہ زیب! عزت کی پردہ پوشی کی خاطر ایک اور مرتبہ گھوڑی پر سوار سہرے کے پیچھے چہرہ چھپائے کھڑا تھا۔

یہ کیسا سماج تھا.....خطا کار کو معصوم اور بے گناہ کو سزا کا مستحق قرار دے رہا تھا؟'' مایا نے سسکاری بھری۔

فیروزہ سرخ کٹھڑی سی بنی گھر میں داخل ہوئی تو شاہ زیب نے مایا سے نظریں چراتے ہوئے اپنی خواب کا دروازہ بند کیا۔ مایا کے ہونٹوں پر تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ نفرت سے بڑبڑائی

''آپ شکاری نہیں ہیں۔''

چند ہی ماہ بعد فیروزہ کی سرخ انگارہ بنی ناک اور بے پناہ زکام سے ساس جھلائیں۔

''اررر ے خاندان کو وارث چاہیے۔ تم بھی بڑی کی طرح مریضہ نکلیں۔ ہمیشہ کی بیمار.....!

مایا! تلخی سے مسکرائی اور بڑبڑانے لگی

''ممی جی.....! یخ بستہ راتوں میں شاور لینے سے انسان بیمار ہی ہو سکتا ہے.....!''

◀◀ ● ▶▶

W/O Abu Tahir Ahmed
Project manager, Saudi ceramic co.P. O.Box No#40487
Second industrial city,Alkharj road RIYADH-11499.K.S.A
Mobile: 00966504509215 nahidtahir2000@yahoo.com

● ابصار فاطمہ

یخ بستہ تپش

''اظہر! میں بتا رہی ہوں، یہ بندی ٹھیک نہیں ہے۔ میں بس آج ہی اس کا حساب کر دوں گی۔''

اظہر آفس جانے کے لیے تیار ہوتا جا رہا تھا اور اپنی بیوی زوبیہ سے نئی کام والی کی شکایت بھی سن رہا تھا۔ وہ کئی دن سے اسے نوٹ کر رہی تھی اور ہر بار جھنجھلا جاتی تھی۔

''یار زوبی پلیز، خود پہ نہیں تو مجھ پہ رحم کرو، ایک تو یہاں میڈ مشکل سے ملتی ہیں جو ملتی ہیں ان سے تمہارا مزاج نہیں ملتا۔ اور جن سے مزاج بھی مل جائے ان کے پیسے سن کے پیروں سے زمین نکل جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے پیسوں سے اپنی نسلوں تک کے محل بنا کے دم لیں گی۔ دیکھو تمہیں تھوڑی بہت نظر تو رکھنی پڑے گی۔ تمہیں اندازہ تو ہے اس قوم کا۔ اچھا میں نکل رہا ہوں آج میٹنگ ہے۔ زین اور حسنین کو اسکول سے لینے تم چلی جانا میں نہیں نکل پاؤں گا۔''

اظہر نے باہر نکلنے کے لیے کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک دم ایسا منہ بنایا جیسے کسی بہت ناگوار چیز سے سامنا ہوا ہو۔

''توبہ! گرمی دیکھو جیسے گھر میں گھس کے گلا دبا کے مار ہی دے گی۔ یار ظلم ہے اتنی گرمی میں بھی آفس بلاتے ہیں۔'' اسے ایئر کنڈیشنڈ کمرے سے نکل کر ایئر کنڈیشنڈ گاڑی تک جانا بھی ناگوار لگ رہا تھا۔ آج کی میٹنگ نے کم از کم ایک دفعہ تو دھوپ میں جھلسنے سے بچا لیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آج اس کی واپسی تک زوبیہ کا مزاج گرم رہے گا۔ کچھ کام والی کا مسئلہ اور کچھ گرمی میں نکلنے کا غصہ۔ اس نے آفس پہنچنے کے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد زوبیہ کو کال کر لی۔ کافی دیر تک دوسری طرف بیل بجتی رہی۔ آخر کار مشینی پیغام چلنے لگا۔

''آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال جواب.....'' اس نے لائن کاٹ دی۔ اسے پتا تھا کہ موبائل زوبیہ کے ہاتھ میں ہی ہوگا لیکن یہ بھی ناراضگی دکھانے کا ایک طریقہ تھا۔ اس نے مسکرا کے دوبارہ نمبر ملایا۔

''اظہر آپ کو بالکل میرا خیال نہیں ہے۔'' چار پانچ بار بیل جانے کے بعد آخر کار زوبیہ نے کال اٹھا ہی لی۔

''ارے یار ہے خیال تبھی تو ہم ایک سال میں تین میڈ زبدل چکے ہیں۔''

''اف فو! زاہدہ کی بات نہیں کر رہی۔ اتنی گرمی میں رکشہ میں سڑتے ہوئے جاؤ اور بچوں کو لے کر آؤ۔ آپ خود تو اے سی والی گاڑی میں گھومتے ہیں آپ کو کیا پتا کتنی گرمی ہوتی ہے۔''

''کریم یا اوبر منگا لو یار، اس میں کیا مسئلہ ہے۔ چلو دونوں مسئلے حل ہو گئے۔ اب خوش؟''

''دونوں کہاں سے حل ہو گئے؟ زاہدہ کو نکالنے پہ مان جو نہیں رہے آپ۔'' زوبیہ کو زاہدہ پہ تو غصہ تھا ہی ساتھ اظہر پہ دُہرا غصہ تھا۔ گھر کیسے چلتا ہے اظہر کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن پھر بھی ہر اہم فیصلہ خود ہی کرتا تھا۔ والدین سے الگ ہونے سے لے کر بچوں کو بس کی بجائے خود لانے لے جانے تک ہر فیصلہ ہی اس کا تھا۔ یہ الگ بات کہ ان سب فیصلوں کی وجہ وہ زوبیہ کو قرار دیتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا موقف تھا جو چاہیے میں دوں گا لیکن گھر میں تنکا بھی میری مرضی کے بغیر نہ ہلے۔ گھر کے پردے کیا، زوبیہ کے جوتے تک اظہر کی پسند کے تھے۔ ان دونوں کے عموماً جھگڑے اسی بات پہ ہوتے تھے۔ اظہر کو لگتا تھا کہ زوبیہ جان بوجھ کے اس کے فیصلوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتی اور زوبیہ کو لگتا تھا کہ اظہر جان بوجھ کے وہ فیصلہ کرتا ہے جس سے اسے مشکل ہو۔ ابھی بھی دونوں کی بحث بنیادی مدعے کی بجائے ایک دوسرے سے اپنی بات منوانے پہ ہو رہی تھی۔ زوبیہ کو لگ رہا تھا کہ زاہدہ بہت مشکوک شخصیت کی مالک ہے اور اسے روز گھر میں آنے دینا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اور یہ پوائنٹ اظہر کو اپنی فیصلے کی صلاحیت پہ الزام کی طرح لگ رہا تھا۔ اظہر نہیں چاہتا تھا کہ اس کی منتخب کی ہوئی کام والی بدلی جائے۔ بڑی مشکل سے انہیں کوئی دو ماہ کے بعد یہ کام والی ملی تھی، شکل سے ہی پریشان حال اور مسکین سی لگتی تھی اسی لیے اظہر اور زوبیہ جلد مطمئن ہو گئے تھے لیکن اس کے کام پہ لگنے کے ایک ہی ہفتے میں زوبیہ کو اس کی حرکتیں مشکوک لگنے لگیں۔ پہلے چند دن تو زوبیہ کافی مطمئن ہو گئی کیوں کہ بیڈ روم کی ہر ہر چیز اس نے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کے دو دو بار صاف کی، بیڈ کے نیچے سے مٹی نکالی، الماریوں کے پیچھے سے سال بھر کا کچرا نکالا جو کہ پچھلی کام والیوں نے چھوڑا ہوا تھا۔ بیڈ کے کراؤن پہ بنے ڈیزائین تک کو گیلے کپڑے کے کونے کو بتی بنا بنا کر صاف کیا۔ لیکن یہ تفصیلی صفائی جس میں تقریباً گھنٹہ لگ جاتا تھا روز کا معمول بن گیا کہ زوبیہ الجھنے لگی چلو پورا گھر ہی اتنی باریکی سے صاف ہوتا تو الگ بات تھی۔ مگر باقی گھر میں اس سے بھی برا حال ہو گیا تھا جیسا پچھلی کام والیوں کے وقت تھا۔ پنکھا چلتے میں الٹی سیدھی جھاڑو مار کے بیڈ روم کے دروازے سے لگ کے بیٹھ جاتی تھی۔ اور تو اور زوبیہ کی شکل دیکھ کر فوراً بیان دیا جاتا باجی بس ابھی بیٹھی تھی، تھوڑی سی صفائی رہتی ہے باقی تو کر لیا۔ پتا نہیں کتنی دفعہ زوبیہ نے ڈانٹ کے پنکھا بند کروایا، بھلا چلتے پنکھے میں بھی کوئی جھاڑو دِلتی ہے۔ یہاں کا کچرا وہاں وہاں کا کچرا یہاں سارے گھر میں مٹی اور جالے کے بگولے اڑتے پھرتے ہیں۔ زوبیہ کو آہستہ آہستہ

یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ یا تو کسی ڈاکوؤں کے ٹولے کی مخبر ہے یا پھر اکرم صاحب کے گھر جا کر گھر کی ہر بات بتاتی ہے، زوبیہ تو پہلے ہی کھٹک گئی تھی کہ کہاں تو اکرم صاحب کی بیگم ہر بات میں زوبیہ سے منہ ماری کو تیار ہوتی ہیں اور کہاں ایک بار کہنے پہ اپنی کام والی بھیج دی۔ اور یہی سب اب وہ اظہر کو سمجھانے میں لگی ہوئی تھی۔ اب تو اسے زاہدہ کی موجودگی میں کسی سے موبائل فون پہ بات کرتے ہوئے بھی الجھن ہوتی تھی۔

وہ اظہر سے بات کر ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسے اندازہ تھا کہ زاہدہ ہی ہوگی اس نے کال بند کی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے پسینے کی بو کا بھبھکا اندر داخل ہوا۔ زاہدہ روز کی طرح پسینے میں شرابور نڈھال سی دروازے پہ کھڑی تھی۔ زوبیہ نے جان بوجھ کے کراہیت آمیز منہ بنایا تا کہ زاہدہ کو اندازہ ہو کہ اسے بو آ رہی ہے۔ اس نے روز کی طرح غور سے زاہدہ کے برقعے کا جائزہ لیا۔ کندھوں اور سر پہ سے اس کا رنگ اڑ کے بھورا سا ہو رہا تھا کمر اور چھاتی کے نیچے ساحل پہ آنے والی لہروں جیسا پہلے گیلا اور پھر سفید حاشیہ سا بنا ہوا تھا۔ روز یہ حاشیہ الگ ہی ڈیزائین کا ہوتا تھا۔ زاہدہ کا کہنا تھا کہ وہ روز گھر سے نہا کے نکلتی ہے اور برقع بھی گھر جاتے ہی دھو کے ڈالتی ہے۔ لیکن ہر بات کی طرح زوبیہ کو اُس کی اِس بات پہ بھی اب زیادہ یقین نہیں رہا تھا۔ کنجوس کہیں کی، ذرا سے پیسے بچانے کے چکر میں گھنٹہ بھر پیدل چل کے آنے کی کیا ضرورت۔ ویگن سے آ جائے تو یہ بھبھکے تو نہ اٹھیں۔ یہ مشورہ اس نے زاہدہ کو دینے سے اجتناب ہی کیا کیوں کہ پھر وہ ویگن کا کرایہ بھی اسی سے مانگ لیتی۔ زاہدہ نے برقع اتار کے پیچھے والی گیلری میں الگنی پہ پھیلایا نلکے سے ہاتھ منہ دھویا اور وہیں پہ رکھا صفائی کا سامان اٹھا کر دوبارہ اندر آ گئی۔ زوبیہ وہیں کھڑی اسے غور سے دیکھتی رہی۔ زاہدہ نے کچن میں سنک کے سامنے بنی کھڑکی میں رکھے بدرنگ پلاسٹک کے گلاس کو اٹھا کر روز کی طرح رگڑ رگڑ کے دھو کے پانی پیا تو زوبیہ نے بیڈروم کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ وہ کمرے کے دروازے پہ پہنچی ہی تھی کہ زاہدہ نے ہال کا پنکھا چلا دیا۔ زوبیہ یک دم رک گئی۔

''پنکھا تو بند کرو، چلتے پنکھے میں کوئی جھاڑو دی جاتی ہے، سارے کمرے میں مٹی اڑتی پھرے گی اور محترمہ اِدھر اُدھر ہاتھ چلا کر فارغ ہو جائیں گی۔ صفائی کے باوجود بھی پتا ہی نہیں چلتا کہ کسی نے ہاتھ بھی لگایا ہے کمرے کو۔ ساری توجہ تمہاری بیڈروم کی صفائی پہ ہوتی ہے۔ اچھا ہاں یاد آیا بیڈروم کی صفائی آج چھوڑ دینا۔''

زاہدہ نے فوراً پنکھے کا بٹن بند کیا اور سوالیہ نظروں سے زوبیہ کو دیکھنے لگی، اسے فضول کوفت محسوس ہوئی پھر بھی جواب دے ہی دیا۔

''آج اظہر بزی ہیں۔ مجھے ساڑھے بارہ سے پہلے نکلنا ہے، بچوں کو لینے۔'' زاہدہ سر ہلا کر صفائی میں لگ گئی۔ زوبیہ نے سکون کا سانس لیا۔ اور بیڈروم میں چلی گئی

زاہدہ جلدی جلدی جھاڑو نکالنے لگی تا کہ زوبیہ کے بتائے وقت تک فارغ ہو جائے۔ اس کی پیشانی پہ پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں جلد ہی مل کے بڑی بوند بن گئی اور وہ بہتی ہوئی ٹھوڑی سے نیچے ٹپک گئی۔ زاہدہ نے ایک لمحے کو رک کر کندھے سے نیچے بازو ماتھے پہ پھیرا اور دوبارہ صفائی میں لگ گئی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پسینہ دوبارہ اسی مقدار میں جمع ہو گیا۔ کمر سے شروع ہونے والا پسینہ پنڈلیوں سے ہوتا ہوا چپل کو بھیجے دے رہا تھا۔ حبس سے سانس لینا دوبھر لگ رہا تھا۔ اس نے جھاڑو سائیڈ پہ رکھی اور بیڈروم کے دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ مگر چند ہی لمحوں میں چونک گئی دروازے کے نیچے چوکھٹ میں موجود ذرا سا گیپ اب بند تھا شاید کل رات ہی فوم لگایا گیا تھا۔

زاہدہ نے تھکی ہوئی سانس لی اور دوبارہ جھاڑو اٹھا کے کام میں لگ گئی۔

◂◂ ● ▸▸

Flate #202 Al Amin Towers
Minara Road Sukkur Sand
Pakistan
033113162917
absarfatima@hotmail.com

اقبال حسن آزاد
کا
تیسرا
افسانوی مجموعہ
پورٹریٹ
(۲۰۱۷ء)

● ڈاکٹر صوفیہ شیریں

سمندر پر جھاگ

سہاگ رات، زندگی کی سب سے خوبصورت رات، جس میں تھوڑی گھبراہٹ، شرم وحیا اور ایک عجیب قسم کی بے چینی ہوتی ہے۔ نازنین بھی سجی سجائی، زیوروں سے لدی، خوشبوؤں میں بسی، سمٹی سمٹائی، سہاگ کی سیج پر بیٹھی آنے والے خوشنما لمحوں کا گھبراہٹ اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ انتظار کر رہی تھی۔ اور کیوں نہ کرتی کسی بھی وقت اس کے سپنوں کا شہزادہ مجسم سامنے آنے والا تھا۔ اسے کالج کے دنوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''یار تو اتنی خوبصورت اور دلکش ہے نازو! تیرے لیے تیرا دولہا ڈھونڈنے میں تیرے ماں باپ کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔'' زہرا نے سلمہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... ہاں ..... آخر کو چاند کی جوڑی سورج سے ہی ہوتی ہے۔'' سلمہ نے بھی مسکراتے ہوئے زہرا کا ساتھ دیا۔

نازنین کا سر ناز سے تھوڑا اور اوپر اٹھ گیا۔ وہ ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔

''ہاں! کیوں نہیں؟ میرے لیے تو کوئی خوابوں کا شہزادہ ہی آئے گا۔ دراز قد، کسرتی جسم والا بالکل ریتک روشن کی طرح۔ اتنا گورا چٹا نہ ہو تو بھی چلے گا' پر اس کی جیب نوٹوں سے بھری ہونی چاہئے۔ آخر کو اسے نازنین کے ناز بھی تو اٹھانے ہیں۔''

سلمہ کے چہرے پر ناگواری کا ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''میڈم نازنین اتنا بھی ناز ونخرہ اچھا نہیں ہوتا۔ پروردگار نے اگر اچھی صورت دی ہے تو تمہیں اچھی سوچ بھی رکھنی چاہئے۔ ہم سفر کے جسم اور پیسوں سے محبت نہیں کی جاتی بلکہ یہ تو ایک روحانی رشتہ ہے جسے محبت، وفا اور قربانی کے جذبوں سے جوڑا جاتا ہے نہ کہ دولت کی زنجیر سے۔ بہتر ہوگا کہ خوابوں کی دنیا سے نکل آؤ اور کسی عام سے مرد کی عام سی بیوی بننے کی تیاری کرو۔ ویسے بھی بڑے بزرگوں نے کہا ہے کہ شادی سمجھوتے کا دوسرا نام ہے۔'' زہرا نے نازنین کو سمجھانے کی ناکام سی کوشش کی۔

''ہوں! جل گئی۔'' یہ زہرا بھی نا! خود تو معمولی شکل وصورت کی ہے اس لیے مجھے بے وجہ درس

دینے بیٹھ گئی۔ جلے گی کیوں نہیں کالج میں کوئی لڑکا اس کی طرف دیکھتا بھی تو نہیں۔ سبھی تو ہماری جیسی سلم، اسمارٹ اور بیوٹی فل لڑکیوں کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔''

نازنین نے اپنی سوچ کو زبان دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بس ایک تحقیر بھری مسکان کے ساتھ دونوں کی جانب دیکھا۔

اس کے خیالوں کا پرندہ یوں ہی اڑان بھر رہا تھا کہ کمرے میں کسی کے داخل ہونے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ نازنین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''یا اللہ..... وہ آ گئے۔'' شرما کر وہ اور بھی سمٹ گئی۔

جمیل نے دروازہ بند کر والہانہ مسکراہٹ کے ساتھ نازنین کو سلام کہا اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے گھونگھٹ اٹھایا تو بے ساختہ اس کی زبان سے میرؔ کے اشعار نکلے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی ان کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

جمیل نے منہ دکھائی میں نازنین کو سونے کا ہار پہنایا اور ساتھ ہی اپنی بانہوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال منزلِ مقصود کی جانب سفر شروع کر دیا۔

یوں جمیل کی محبتوں، عنایتوں اور دلفریبیوں میں نازنین کا ازدواجی سفر شروع ہوا۔ جمیل جس قدر وجیہ اور صحت مند تھا اتفاق سے اتنا مالدار بھی تھا۔ وہ ایسے سرکاری عہدے پر فائز تھا جہاں تنخواہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں کی زندگی بہاروں میں گزر رہی تھی۔ ہر ویک اینڈ پر جمیل اسے مختلف مقامات کی سیر کے ساتھ بڑے ہوٹلوں میں ڈنر بھی کراتا۔ کبھی کبھار دونوں ایک دوسرے کے والدین سے ملنے بھی جاتے۔

نازنین کے والد ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ والدہ گھریلو خاتون تھیں۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی شادی کے بعد والدین تنہا ہو گئے تھے۔ چوں کہ اس کا گھر میکہ سے قریب تھا اس لئے اکثر ہی وہ وہاں جایا کرتی جہاں اس کے بڑی امی، بڑے ابو اور چچا، چچی بھی رہتے تھے۔ پشتینی مکان ہونے کی وجہ سے سب علیحدہ ہو کر بھی ایک ساتھ تھے۔ جمیل نے اپنے اخلاق اور بذلہ سنجی سے تمام لوگوں، خاص کر خواتین کا دل جیت لیا تھا۔ وہ جب بھی سسرال جاتا عورتوں سے خوب گپ لڑاتا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ داماد ہے۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ خوبرو اور مالدار شوہر، شہر میں کشادہ فلیٹ، کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں، خوابوں جیسی زندگی۔ جیسا سوچا تھا اس سے بھی کہیں زیادہ حسین۔

پر؟..... پر ہر دو چار دن میں وہ ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو جاتی۔ اکیلی بیٹھی نہ جانے

کیا سوچتی رہتی۔نظریں اٹھا کر گھر کی ہر شے کو بغور دیکھتی، جیسے کسی خاص شے کو ڈھونڈ رہی ہو۔وہ خاص شے جس کی کمی کا احساس تو اسے ہوتا پر.....وہ کیا شے ہے سمجھ نہیں پاتی۔اچانک اسے اپنی زندگی کے تمام رنگ پھیکے لگنے لگتے۔اسے اکثر ایسا لگتا کہ اس کے سامنے دسترخوان بچھا کر انواع واقسام کے لذیذ کھانے چن دئے گئے ہیں لیکن کھانے میں ذرا سی نمک کی کمی ہے، جس نے کھانے کے تمام ذائقہ کو کرکرا کر دیا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو جھٹکنے کی کوشش کرتی۔خود کو سمجھاتی۔

''سہیلیاں بالکل ٹھیک کہتی تھیں، تم بڑی ڈیمانڈنگ ہو۔آخر اور کیا چاہئے؟ تمہاری قسمت پر لوگ رشک کرتے ہیں۔والدین بھی وارے جاتے ہیں۔جمیل کی وجاہت اور اس کے رتبے کا لوگ بظاہر تو تعریف کرتے ہیں لیکن ان کے لہجے میں چھپی جلن تم محسوس نہیں کرتی؟ اس دن کی بات بھول گئی جب چھوٹی چچی جان بڑی امی کو جمیل کی تعریف کرتے ہوئے مسکرا مسکرا کر آنکھ مار رہی تھیں۔یہ جلن نہیں تو کیا ہے؟ جلتے ہیں سب تمہاری قسمت سے۔''اس کے اندر کی مغرور لڑکی کی آواز اس کی سوجھ بوجھ پر حاوی ہو جاتی اور وہ اپنے خیالوں کو وہم سمجھ کر جھٹک دیتی۔

اس دن نازنین بن سنور کر جمیل کے ساتھ مال جانے کیلئے تیار بیٹھی تھی۔جمیل نے آتے ہی خوبصورت نئی نویلی دلہن کو سجا سنورا دیکھا تو ہاتھ نچا کر شرارت سے بول اٹھا۔

''اوہو.....بجلی بن کر کہاں گرنے کا ارادہ ہے میڈم؟''نازنین ہنس پڑی۔

''ارے! یہ کس طریقہ سے بات کرتے ہیں آپ؟ چھی.....اچھا نہیں لگتا۔''جمیل خجل سا ہو گیا۔

پلان کے مطابق دونوں نے مال سے شاپنگ کی اور اوپری منزل جہاں فوڈ کارنر تھا، پہنچے۔جمیل کو واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔وہ نازنین کو بٹھا کر''ابھی آتا ہوں''کہہ کر چلا گیا۔وہ جمیل کو پیچھے سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

''جمیل ایسے کیوں چلتے ہیں۔ابھی آئیں گے واش روم سے تو ٹوکوں گی۔''یہ سوچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔آس پاس اس کے جیسے اور بھی شادی شدہ، غیر شادی شدہ جوڑے اور فیملی والے سبھی ہنس ہنس کر شام اور اسنیکس کا لطف لے رہے تھے۔کالج کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا کس طرح اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔وہ تو گھر رشتہ بھیجنے کو بھی تیار تھا۔کئی بار سلمہ کے ہاتھوں محبت نامہ بھی بھجوایا۔وہ سلمہ کے دور کے رشتے کا بھائی تھا۔سلمہ سے فون نمبر حاصل کر کئی بار فون پر بھی گفتگو کرنے کی کوشش لیکن نازنین نے اسے بلاک کر دیا کبھی پلٹ کر بھی اس کی جانب نہیں دیکھا۔سلمہ نے ایک دفعہ اس کا ذکر بھی چھیڑا۔

''لڑکا اچھا ہے ناز۔اگر تم ہاں کہو تو میں تمہیں اپنی بھابھی بنانے کے لیے آنٹی سے بات کروں۔''

''نہیں.....نہیں سلمہ ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔''

''کیوں؟ کیا کمی ہے میرے کزن میں؟ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔محنتی ہے۔دیکھنے میں برا بھی نہیں ہے۔اس کا اپنا ٹیلرنگ شاپ ہے۔سب سے بڑھ کر تمہیں چاہتا ہے۔ہمیشہ خوش رکھے گا۔''

''دیکھو سلمہ! میں کہنا نہیں چاہتی پر یہ سچ ہے کہ وہ میرے لائق نہیں۔میں کسی معمولی شکل و صورت والے درزی سے تو کبھی شادی نہیں کروں گی۔میرے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔''

''خدا کے لیے خوابوں کی دنیا سے باہر نکلو۔اتنا غرور اچھا نہیں۔شکل وصورت تو خدا بناتا ہے اور تم میں خوبصورتی کے علاوہ ہے ہی کیا؟''

نازنین کو سلمہ کا حقیقت پسندانہ لہجہ بہت ناگوار گزرا۔وہ دن اور آج کا دن اس نے سلمہ سے کبھی بات نہیں کی۔اس طرح بچپن کی دوستی غرور اور تکبر کی نذر ہو گئی۔

''کن خیالوں میں گم ہو میری جان''جمیل نے نازنین کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔نازنین چونک کر ماضی سے حال میں لوٹ آئی اور جمیل کے خوبصورت چہرے کو تکنے لگی، جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو:

''خواب سچ ہوتے ہیں سلمہ!''

یوں ہی ہنستے مسکراتے دن گزرنے لگے۔پر.....وہ اکثر افسردہ ہو جاتی۔کچھ تھا جو اس کے لاشعور میں کھٹک رہا تھا۔کیا تھا؟ سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس دوران ایک نئی بات ہونے لگی تھی، جس نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔جمیل کی ہر بات، ہر انداز اور ہر رویئے پر نہ جانے کیوں نازنین کو اپنے چچازاد بھائی امتیاز کی یاد آ جاتی۔بچپن سے ہی وہ امتیاز کے ساتھ پلی بڑھی تھی۔وہ نازنین سے عمر میں سات سال بڑا تھا۔وہ جب میتھ کے کسی پیچیدہ سوال کر حل کرنے سے قاصر رہتی تو بلا جھجک امتیاز کے پاس چلی آتی جسے وہ چٹکیوں میں حل کر دیتا۔بس اتنا ہی، پھر وہ اپنی کتابوں میں سر ڈال دیتا۔بڑا ریزروسا نیچر تھا اس کا۔خواتین سے بڑے ادب واحترام سے باتیں کرتا اور ان کے سامنے اپنی نظریں نیچی رکھتا۔عورتوں کے کمروں میں داخل ہونے سے قبل گلا صاف کرنا نہیں بھولتا۔

بڑی بجیا کی شادی میں سب نے مل کر کتنا ہلڑ مچایا، ناچ گانا، عورتوں کا ڈھولک بجانا، تمام لڑکیوں کا ڈھولک کی تھاپ پر کمر مٹکانا، دوپٹوں کی سرسراہٹ، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، شرمیلی ہنسی، کانا پھوسی، پر کیا مجال کہ کوئی چیز امتیاز کو متاثر کر لے۔وہ ہمیشہ خود کو لیے دیے رہتا۔اس کی عادتوں کی وجہ کر خاندان کی لڑکیاں بھی اس سے بے تکلف ہونے میں ہچکچاتیں۔نازنین بھی ایک حد تک ہی اس سے گفتگو کر پاتی، ویسے بھی نازنین کے نیچر میں اتنا تکبر تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو اہمیت ہی نہیں دیتی تھی، جو اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔

پھر بھی آج کل وہ غیر اہم سا بندہ بڑا اہم لگنے لگا تھا جب کہ ان کے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں تھا، جسے یاد کیا جائے۔ امتیاز میں یاد رکھنے والی کوئی خاص خوبی بھی نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک ایسا مرد تھا جو اپنی دنیا میں ہی گم رہتا، عورتوں کی دنیا میں دخل دینا جیسے کوئی گناہ ہو۔ مردانہ لب ولہجہ اور عادات واطوار کا حامل امتیاز کی گہری اور سنجیدہ آنکھیں اکثر نازنین کی تنہائیوں میں جھانکنے لگتیں، جنہیں دیکھتے ہوئے ہی وہ بڑی ہوئی تھی اور اب اپنے گھر کی ہوگئی تھی۔ پچھلی بار جب میکے گئی تو سیڑھیوں پر ہی امتیاز سے ملاقات ہوگئی، چند لمحوں کیلئے آنکھیں ملیں۔ دعا سلام کے بعد حسب عادت وہ نظریں جھکائے اس کے قریب سے گزر گیا۔ امتیاز کا مردانہ رکھ رکھاؤ اور پروقار شخصیت اب نازنین کو متاثر کرنے لگی تھیں، پر جمیل کی موجودگی میں اس کی محبتیں اور چاہتیں اسے ہر فکر اور الجھن سے بے گانہ کر دیتیں۔

یوں ہی وقت کا کارواں گزرتا رہا اور نازنین کی شادی شدہ زندگی کے چھ مہینے گزر گئے۔ چند دنوں سے اس کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی تھی۔ کوئی نیا مہمان اپنے آمد کی اطلاع دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے پر اب وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتی اور آرام کرتی۔

ایک ویک اینڈ پر جمیل نے کہا ''آج شام میرے چند کالج فرینڈز گھر پر تشریف لا رہے ہیں۔''

نازنین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر خم کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کے مہمان ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہم خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں رکھیں گے۔''

شام پانچ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ نازنین سوالیہ نظروں سے جمیل کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔

''مہمان اتنی جلدی آ گئے!''

جمیل نازنین کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کندھے اچکا کر دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے اس کے جگری دوست اکبر اور ناظم کھڑے تھے۔

''ارے یار! آؤ۔ آؤ۔'' کہتا ہوا دونوں سے بغل گیر ہوا۔ مسکراتے ہوئے نازنین سے ملوایا اور ڈرائنگ روم میں لے جا کر ''ابھی آتا ہوں تم لوگ آرام سے بیٹھو'' کہتا ہوا نازنین کے پاس آیا۔

''نازنین یہ لوگ کافی پہلے آ گئے ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مغرب بعد آئیں گے۔ بہر حال تم انہیں کولڈ ڈرنکس دو، میں ذرا باہر جا کر ان کے لیے کباب، سینڈوچ وغیرہ لے آؤں۔'' جمیل اپنا منی پرس جینز کے پاکٹ میں ڈالتا ہوا بولا۔

جمیل کے جانے کے بعد نازنین نے فریج سے لمکا کا بوتل نکالا اور دو گلاسوں میں انڈیل کر

ڈرائنگ روم کی جانب بڑھی۔ پردے کے پیچھے ہنسنے کی آواز کے ساتھ کوئی بول رہا تھا۔

''ارے یار اس کی شادی بھی ہوگئی!''

''ہاں یار! ہمیں تو لگا تھا کہ اتنے رشتے ٹوٹے یہ بھی ٹوٹ جائے گا۔''

''اصل میں غریب لوگ ہیں نا، چمک دمک میں کچھ نظر نہیں آیا۔''

ہاں بھئی! زمانہ ہی ایسا ہے۔ پیسہ، رتبہ' گھر ہی دیکھ کر لوگ رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور کچھ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

''ہوں! تجھے یاد ہے وہ ریشمہ؟ جس کے ساتھ چھ مہینے تک اس کا زبردست معاشقہ چلا تھا اور پھر اچانک بریک اپ.....''

''ہاں یاد ہے! شاید ریشمہ جمیل کی زنانہ حرکتوں سے بیزار ہو چکی تھی۔''

ایک فلک شگاف قہقہہ کے ساتھ نازنین کو اپنی الجھن کی وجہ مل گئی۔

◂◂ ● ▸▸

34 Abdul Halim Lane 4th Floor
Kolkata 700016 (WB)
Mob : 9748904329

اقبال حسن آزاد

کی تنقیدی کتاب

نثری اصناف ادب
اور
طنز و مزاح کی روایت

منظرِ عام پر

● ناول کا ایک باب

● اقبال حسن خاں

راج سنگھ لاہوریا

(گذشتہ سے پیوستہ)

''کاں جارئے ہو؟'' اُنہوں نے پوچھا تھا۔

''جمعہ پڑھنے۔تم نئیں پڑھو گے ضامن بھائی؟'' شاید وہ کچھ شرمندہ ہوئے تھے لیکن پھر فوراً ہی بولے تھے۔

''یار کپڑے سئی نئیں ہیں میرے۔'' میں نے حیرت سے کہا تھا۔

''یہ تو بالکل نئے کپڑے ہیں ضامن بھائی۔دیکھو ہفتے میں ایک دفعہ تو نماز پڑھ لیا کرو۔'' اس پر اُن کا ناریل چٹخ گیا تھا اور وہ تلخی سے بولے تھے۔

''یہی خرابی ہے آج کل کے لمڈوں میں۔ذرا منہ کیا لگالیا، سر پہ چڑھنے لگے۔اماں اب تمہیں کیا پتہ میرے کپڑے کیوں سئی نئیں؟ کہہ دیا تو تمہارا فرض ہے کہ مان لو۔'' میرے پاس ماننے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔بعد میں پتہ چلا کہ وہ جلدی میں اس لئے تھے کہ اُس روز کوئی نئی فلم ریلیز ہوئی تھی اور اُنہیں ٹکٹ نہ ملنے کا خوف تھا، چنانچہ وہ نماز کو ٹال کے فلم دیکھنے چلے گئے۔میں نے کئی روز بعد اصلیت کا علم ہونے پر یہ بات کی تھی تو مسکرا کر بولے تھے۔

''اماں یار تم لوگ ذرا ذرا سی بات کو ثواب عذاب کا مسئلہ بنا لیتے ہو۔میں بڑے دنوں سے اس فِلم کا انتظار کر ریا تھا۔اب میں اگر نماز پڑھنے چلا جاتا اور میرا جی فِلم میں اٹکا رہتا تو کیا فائدہ تھا وِس نماز کا؟ بولو، جواب دو۔اس لیے بھائی اگلے جمعے دل لگا کے نماز پڑھیں گے۔ٹھیک کئے ریا ہوں نا؟'' مگر مجھے پتہ تھا کہ وہ اگلا جمعہ کہ جس میں ضامن بھائی کو نماز پڑھنا تھی، کبھی نہیں آئے گا۔شوکی کا دوست احسن اس گفتگو کے دوران خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔شوکی نے تلخی سے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی انسان کو ڈرا دھمکا کے اُس کا مذہب تبدیل کروانا انسانی حقوق کی سنگین

خلاف ورزی ہے۔میں اُس مولوی کے بچے کا دماغ درست کردوں گا۔'' میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات اس حد تک بڑھے۔مولوی صاحب سے جھگڑا مول لینے پر یقیناً مولوی صاحب کی طرف سے بھی بہت سے حمایتی کھڑے ہو سکتے تھے۔معاملہ سکھ اور مسلمان کا تھا اور محلے کے لوگ کسی صورت بھی ایک مسلمان کے مقابلے میں ایک سکھ کی حمایت پر تیار نہ ہوتے۔چنانچہ میں نے کہا۔

''شوکی بھائی۔میرے خیال میں اس بات کو زیادہ نہ بڑھائیں کیونکہ راج سنگھ نے مولوی صاحب کے بھیجے ہوئے آدمی کو برا بھلا کہہ کر اپنی دکان سے نکال دیا تھا۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب ختم ہو گئی ہے۔'' احسن نے سگریٹ بجھا کر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

''میری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن ایسا لگتا نہیں۔تم لوگ بتاتے ہو کہ اصل جھگڑا مذہب کا نہیں بلکہ اُس گھر کا ہے جس میں راج سنگھ رہتا ہے۔میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ راج سنگھ مذہب تبدیل کر بھی لے تب بھی یہ قصہ موجود رہے گا۔'' ضامن بھائی نے سگریٹ کے دو ٹکڑے اس غصے سے کئے جیسے مولوی صاحب کے دو ٹکڑے کر رہے ہوں۔پھر ایک طویل کش لے کر بولے۔

''ابے میں کہتا ہوں سالو اِتے سارے مسلمان جو ہر طرف پھر رئے ہیں وِس پاکستان کے اندر تو ایک اور کی کیا اشد ضرورت آن پڑی وِن کو؟'' اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔بہر حال یہ طے تھا کہ اگر راج سنگھ کو مزید تنگ کیا جاتا تو اُس کی طرف سے بولنے والے بھی موجود تھے۔راج سنگھ اپنے گھر میں خوش تھا۔اُس کا کاروبار چل رہا تھا۔اُس کی بیٹی سکول میں پڑھ رہی تھی اور اُس کی بیوی اپنی پرانی سہیلیوں سے پرانے وقتوں کی طرح مل جل رہی تھی۔بظاہر سب ٹھیک لگتا تھا لیکن سب ٹھیک نہیں تھا۔

اُنہی دنوں ضامن بھائی نے مجھ سے راولپنڈی چلنے کو کہا۔اُنہوں نے کہا تھا۔

''وِس سالے محلے کے اندر میں ایک ہی آدمی پہ بھروسہ کرتا ہوں اور وہ تم ہو۔میری زندگی موت کا سوال آن پڑا ہے۔جب سے یہ خبر ملی ہے میرا دل ادھ ذبحے بکرے کی طرح پسلیوں میں پھڑ پھڑا ریا ہے۔کبھی دیکھا ہے ادھ ذبح بکرا؟ یوں یوں تڑفتا ہے سالا۔'' اُنہوں نے بستر پہ لیٹ کے عملی مظاہر کیا۔

بات یہ تھی کہ اُنہیں کل ہی پتہ چلا تھا کہ اُن کی محبوبہ کے بھائی اُن کی محبوبہ کا رشتہ کہیں طے کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور ضامن بھائی اس ممکنہ واقعے کو یوں روکنا چاہ رہے تھے کہ اپنی محبوبہ کو اپنے ساتھ لاہور لا کر اُنہیں رشتہ مناکحت میں باندھنا چاہ رہے تھے۔اُنہوں نے زور دے کر کہا تھا کہ وہ بس تیار بیٹھی ہوں گی۔بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

''میں چلا چلوں گا تمہارے ساتھ راولپنڈی مگر یہ تو بتادو کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟'' ضامن بھائی نے

پان کی پیک تھوکنے کو جگہ تلاش کی اور پھر گلی میں پچکاری مار کے بولے۔

''قسم قران کی کبھی کبھی مجھے تمہاری فراست پہ شک ہونے لگتا ہے۔اماں اغوا کرنے جارئے ہیں اور کیا؟'' میں کانپ گیا۔میں نے یہ کام کبھی کیا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔میرے چہرے کے تاثرات پڑھ کر مسکرائے اور خانہ ساز وطبع زاد اُن محاوروں میں سے ایک ایسا محاورہ نکال کے بولے جو اگر سننے والے کی سمجھ میں اُسی وقت آجایا کرتا تو چھریاں چل جایا کرتیں۔

''بس ہو گیا تمہاری اٹھنی کا روپیہ! یہ وہ والا اغوا نہیں ہوگا جس کی خبریں اخباروں میں آئے دن چھپتی ہیں اور جس کا انجام تھانے میں اُلٹا لیٹ کے تشریف پہ لگا تار ظلم سہنا ہوتا ہے۔میں نے کہا۔

''اغوا، اغوا ہوتا ہے ضامن بھائی۔مجھے تو اس لفظ سے ہی ڈر لگتا ہے۔'' تب پان کے جملہ اجزا سے اپنے منہ کو پاک کر کے اور بچے کھچے کو لپ لپاتی زبان سے چاٹ کر بولے۔

''دیکھو وہ تیار بیٹھی ہوں گی اپنے گھر میں۔ہم اُنہیں وہاں سے لوا لائیں گے اور یہاں پہنچتے ہی نکاح کر لیں گے۔وِس میں کیا برائی ہے؟'' پھر مزید صراحت کی اور اغوا کی تیکنیکی اقسام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

''اغوا کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جیسے اغوا بالجبر اور اغوا بالرضا۔یعنی زبردستی اغوا کرنا اور مرضی سے اغوا ہونا۔انہی الفاظ کے بعد ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے جو میں نہیں بتا رہا، کس واسطے کہ اُس کو سرانجام دینے کے واسطے زورِ بازو کے علاوہ ڈھیر ساری حرمزدگی کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔'' میں لفظوں کی اس گنجلک میں سے کچھ بھی نہ نکال سکا۔طے یہ ہوا کہ ہم ہفتے کو علی الصباح لاہور سے روانہ ہوں گے۔میں نے کہا۔

''تم نے اُن کا گھر دیکھا ہے ضامن بھائی؟'' مسکرا کر بولے۔

''تم وِس کی فکر مت کرو۔اور تم یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیوں سونچ رئے ہو۔بڑے کام کی سونچو۔بڑے کام کی۔'' پھر مجھے لیے ہوئے دلاور کے ہوٹل پہ آئے اور چائے کا کہہ کر قدرے آگے جھکے اور بولے۔

''اور سنو۔وِس بات کی کسی کو ہوا نہ لگے۔میں وِس دفعے تمہیں قسم تو نہیں دے رہا مگر یہ کہے دے رہا ہوں کہ اگر میں نے کسی اور سے یہ بات سنی تو مجھے افسوس ہوگا بس۔اور میں اپنے ہونے والے بچوں کے کان میں یہ بات ضرور ڈالوں گا کہ کسی سالے پنجابی پہ بھروسہ مت کریو۔'' اُنہوں نے اس لسانی تذکرے کے ساتھ گرم توے وغیرہ کا حوالہ اپنے متوقع بچوں کو شامل کر کے، خوب کھول کر میرے ذہن نشین کرایا اور بولے۔

''کچھ سامان لکھواؤں گا تمہیں صبح۔بازار سے لے لیجو۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''کیسا سامان؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ ہم انہی کپڑوں میں چلیں گے اور کام ہوتے ہی واپس آ جائیں گے۔'' مسکرا کر چند لمحوں تک میری آنکھوں میں دیکھا اور چائے کی پیالی سے چائے پرچ میں اُنڈیل

کر اور اُس میں دو تین پھونکیں مار کر پہلے ذرا سی ہونٹوں سے چھوئی اور جب یقین ہو گیا کہ زبان اور ہونٹ جلنے کا خدشہ عمل مذکور کی وجہ سے ٹل چکا ہے، ایک زوردار آواز سے پی کر اور مزید اُنڈیل کر بولے۔

''مجھے لگ ریا ہے تم پہلے وِس قسم کے کام میں ملوث نئیں رئے؟ ہے نا؟'' میں نے اس سلسلے میں اپنے تجربے کی کمی کا اعتراف کیا تو کہا۔

''ایک ڈنڈا۔ایک رسی اور ہو سکے تو لمبے دستے کا ایک چکو۔اماں یہاں ایسے چکو کاں ملتے ہیں؟ ہماری دلی میں رامپور سے آیا کرتے تھے۔وہاں کے سالے پٹھان کیا کمال کا چکو بناتے ہیں۔کمر بند سے باندھ کے رکھا جاتا ہے اور دشمن کے سامنے آتے ہی کھل جاتا ہے۔''

''کیا؟ کمر بند؟'' باقی کی چائے حلق سے اُتار کے بولے۔

''اب بنومت۔چکو کی بات کر ریا ہوں۔'' پھر مسکرا کر مجھے آنکھ ماری اور قدرے عصبیت کا اظہار یوں فرمایا۔

''ہماری دلی میں الگ الگ دشمن کو الگ الگ ہتھیاروں سے مارنے کا دستور ہے۔تم پنجابیوں کی طرح نئیں کہ جس سالے کو بھی مارنا ہو، بس لٹھیا چلا دو۔اونہہ!'' میں نے صراحت چاہی تو بولے۔

''ہماری دادی کی اماں نے تو اپنی سوت کو باتوں سے مار دیا تھا۔سنا ہے اِتی لمبی زبان تھی وِن کی۔کوئی وِن کا جھوٹا پانی نئیں پیتا تھا۔زہر بھر جاتا تھا پنڈے میں۔میرے پیدا ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ہمارے پڑوس میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔بہادر شاہ ظفر کی آنکھیں دیکھے وے تھے۔اسی لیے اُن درباری سازشوں سے خوب واقف تھے جنہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا سورج غروب کروایا تھا۔چوتھی شادی کو مرے جارئے تھے مگر دوسری بیوی فضیتا کر رئی تھیں۔'' میرا تجسس جاگا۔

''اور تیسری کچھ نہیں کر رہی تھیں؟'' تلخی سے بولے۔

''پوری بات سن لیا کرو۔ایک وخت میں دو رکھا کرتے تھے۔پہلی کو طلاخ دے چکے تھے۔چنانچہ اُن کا علاج ایسا کرا کہ دلی بھر میں دھوم ہوگئی۔''

''کیا علاج کیا اُنہوں نے دوسری والی کا؟''

''گیارہ برس میں تیرہ بچے پیدا کرے۔مجبور ہوگئیں ازاجت دینے پہ۔مگر بھیا اگلی شادی تین مہینے بھی نئیں چلی۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں چلی؟''

گھور کے بولے۔

''اب تم اِتے بھی للے نئیں ہو۔اماں گیارہ سال میں تیرہ بچے پیدا کرنے والا اور سب کچھ کر سکتا

ہے،ایک اور بیاہ نئیں کرسکتا۔ چمگادڑ جیسی صورت نِکل آتی ہے ایسے جنوں کی۔ چمگادڑ دیکھی ہے کبھی؟ ہر وخت اُلٹی لٹکی رہتی ہے۔'' پھر اپنی بات کو چشم تصور سے غالباً حقیقت بنتے دیکھا، مسکرائے اور سگریٹ کا آخری کش لے کر مجھے دینے کی کوشش کی، میں نے سر کے اشارے سے نفی میں جواب دیا تو آخری کش میں اُنگلی اور انگوٹھے کو اس واسطے شامل کیا کہ بچے کھچے سگریٹ میں شریفانہ انداز سے تھامے جانے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی اور کہا۔

''تم اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا لیتے ہو۔ چکو کا بندوبست میں خود کرلوں گا۔ایک رسی تم سویرے خرید لینا۔ پیسے میں دے دوں گا۔خوب بٹی ہوئی اور مضبوط ہو۔'' میں نے کہا۔

''کیا اُنہیں باندھ کے لاؤ گے؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ اس فعل پہ آمادہ و تیار بیٹھی ہیں۔'' پھر غصے میں آگئے اور بولے۔

''اماں باندھنے کو کون کئے ریا ہے؟ آئیں؟ ہوسکتا ہے گھر کی دیوال پہ چڑھنا پڑے۔اُس وخت رسی کاں سے لائیں گے؟'' مجھے لگ رہا تھا کہ شاید میں اس ساری کارروائی کا حصہ نہیں بن پاؤں گا۔میں نے کہا۔

''تو کیا ہم رسی کے ذریعے گھر میں کودیں گے؟ مطلب رسی کے ذریعے؟ نہیں ضامن بھائی۔ میں یہ سب نئیں کرسکوں گا۔ بلکہ میں کسی ایسی تجویز کا حصہ نہیں بن سکتا۔غضب خدا کا۔تم تو سارے طریقے جرائم پیشوں جیسے بتلا رہے ہو۔'' اب اُن کا غصہ دیدنی تھا۔کڑک کر بولے۔

''تو وِسی وخت میں تم سے دوستی ختم کرنے کا اعلان کر ریا ہوں۔وہ سالا کس منہ سے دوستی کا دعویٰ کرسکتا ہے جو مصیبت کے وخت دوست کے کام نہ آئے؟ ہمارے دل کو لگی وی ہے۔ ہمارا کام ہے۔ہم جانتے ہیں اکیلے نئیں ہو پائے گا۔اور کسی پہ بھروسہ نئیں کرسکتے۔ٹھیک ہے بھیا۔اکیلے کرنے کی کوشش کریں گے۔پکڑیں جاں گے۔گرفتار ہو جاں گے۔ہوسکتا ہے مارے بھی جائیں۔اللہ حافظ۔اب میرے سامنے بیٹھے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رئے ہو۔فوراً نِکل لو مجھ نصیب ور کے سامنے سے۔'' کبھی غصے میں بھی خود کو بدنصیب نہیں کہتے تھے۔میں نے غور سے دیکھا۔شاید اُن کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔میرا دل پسیج گیا۔میں نے کہا۔

''ارے ارے یہ کیا؟ اُف! میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔مگر میں کسی کے گھر میں نہیں کود سکتا۔یہ میں پہلے سے بتا رہا ہوں۔'' فوراً ہی عیاری سے مسکرائے اور بولے۔

''مجھے پتہ تھا تم میرا ساتھ ضرور دو گے۔تو بھیا میں کیا کئے ریا تھا؟''

کڑاکے کی سردی تھی جب ہم صبح پانچ بجے لاہور سے نکلے۔ہم میں سے کوئی بھی اس سے پہلے راولپنڈی نہیں گیا تھا۔اُس زمانے میں زیادہ تر سفر ریل کے ذریعے ہی طے ہو کرتا تھا۔ہم دونوں کو اتفاقاً

ایک ایسے ڈبے میں جگہ ملی جس میں پہلے سے ہی چند ایسے حضرات بیٹھے تھے جو بہت شدت سے انگریزوں کے مخالف تھے اور بات بات پر اُنہیں گالیاں دے رہے تھے۔

''ارے صاحب۔انتہائی نامعقول، ظالم اور کمینے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا ہندوستان۔خدا کا صد صد شکر ہے کہ ملک اس نحوست سے پاک ہوگیا۔'' ایک صاحب نے جو ترکی ٹوپی کا پھندنا نجانے کیوں اگلی طرف کئے ہوئے تھے، کڑک کر بولے۔ضامن بھائی ایسے موقعوں پر کب خاموش رہنے والے تھے۔وہ جواباً ویسے ہی کڑک کر بولے۔

''معاف کیجئے گا حضرت۔ ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ میں کس کی حماقتوں کی وجہ سے گیا تھا؟''

ریل کسی بہت ہی چھوٹے سے سٹیشن پر رکی ہوئی تھی اس لیے میں ہر کسی کی گفتگو آسانی سے سن سکتا تھا۔ضامن بھائی کے سوال کے جواب میں چند لمحوں تک خاموشی رہی، پھر وہی بزرگ بولے۔

''یہ انگریزوں کی سازش کی وجہ سے ہوا تھا۔'' ضامن بھائی نے فوراً سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر سگریٹ کے دو ٹکڑے کیے اور مسکرا کر بولے۔

''بہت خوب۔ملک آپ کا تھا، فوج آپ کی تھی، اقتدار آپ کا تھا۔آپ جوابی سازش کر کے انگریزوں کو جواب دے سکتے تھے، پھر آپ نے ایسا کیوں نئیں کرا؟'' ترکی ٹوپی والے صاحب نے ضامن بھائی کو غور سے دیکھا اور بولے۔

''کاں سے تشریف لائے ہیں جناب؟ دلی سے؟'' ضامن بھائی نے کش لیا اور دھواں تقریباً اُن کے منہ پہ چھوڑ کے بولے۔

''جی۔کوئی اعتراض؟ ہم دلی کے ہیں۔''

ایک اور صاحب جو شاید سابق فوجی رہے ہوں گے کیونکہ اُن بیٹھنے کا انداز بالکل مختلف تھا، اور بعد میں یہ اندازہ درست نکلا، تہدیدی انداز میں بولے۔

''دلی کے ہیں؟ ہوں گے دلی کے۔اب آپ پاکستانی ہیں۔آپ اب بھی خود کو دلی کا کہتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ویسے یہ صاحب جو پچھلے سٹیشن پہ اُترے ہیں رامپور سے تشریف لائے تھے۔ایک دفعہ نئیں کہا کہ وہ رامپوری پٹھان تھے بس دو حرکتوں سے پتہ چلا۔ایک تو اُنہوں نے ناشتہ پسند نہ آنے پر ٹرے چلتی ریل سے باہر پھینک دی اور دوسرے اُس وقت جب وہ پیسے مانگنے پر بیرے کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا چاہ رہے تھے۔کمال کے ہوتے ہیں رامپور کے پٹھان بھی۔'' ضامن بھائی نے اپنا رخ اُن کی طرف پھیرا اور بولے۔

''دلی سے آئے ہیں تو دلی ہی کہیں گے جناب۔ اشرافوں کے شہر سے۔ رامپور سے نئیں آئے ہیں جہاں بات بات پہ پٹھان چکو نِکال لیتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے، یوپی کی جیلوں میں سب سے زیادہ روہیلکھنڈ کے پٹھان پائے جاتے ہیں اور رامپور بھی روہیلکھنڈ کے اندر واقع ہے۔ رامپوری پٹھان جو بات بات پہ ران پہ رکھ کے چکو کھول لیتے ہیں۔ لاحول ولا۔''

میں نے پہلے اُن صاحب کو نہیں دیکھا تھا جو مخمل کی رامپوری ٹوپی اس قدر جھکا کے اوڑھے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آنکھ قدرے چھپ گئی تھی۔ وہ شاید نیم غنودگی کے عالم تھے۔ وہ ضامن بھائی کی بات سن کر ہڑبڑا کر اُٹھے اور کھڑے ہو کر بولے۔

''یہ کون رامپور والوں کی غیبت کر رہا ہے گا؟ آئیں؟ ذرا سامنے تو آئیو اگر ماں کا دودھ پیا ہے گا۔'' میرے جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ حضرت لوگ ماں کا ہی دودھ پیتے ہیں مگر اُن کا حلیہ دیکھ کر خاموش رہا۔ سرخ و سپید رنگ، لمبا قد اور ادھ کھلی آنکھیں دوڈھائی سو سال پہلے ہندوستان کی طرف پہاڑوں سے ہجرت کی داستان صاف کہہ رہی تھیں۔ پینتیس اور چالیس کے بیچ رہے ہوں گے۔ سفید کرتا اور تنگ موری کے پاجامے کی جگہ اگر اُنہیں ملیشیا کی قمیص شلوار پہنا کر اُن کے کندھے پہ چادر رکھ دی جاتی تو دیکھنے والا اُن سے پشتو میں ہی بات کرتا۔ مگر یہ وقت تاریخ کے صفحات کھنگالنے کا نہیں تھا۔ وہ اب ضامن بھائی کے سر پہ کھڑے ہوئے اُنہیں ایسی ادھ مچی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جن میں کینہ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ ضامن بھائی ذرا بھی نہیں گھبرائے اور اپنی جگہ سے ذرا سرک کے بولے۔

''تعریف کر رہا تھا حضور رامپور والوں کی۔ کیا یہ بات غلط ہے کہ روہیلکھنڈ کی جیلوں میں سب زیادہ رامپوری پٹھان پائے جاتے ہیں؟ خاں صاحب۔ یہ فخر کی بات ہے نہ کہ شرمندگی کی؟ جیل کون جاتا ہے؟ وئی مرد کا بچہ جس نے ڈنکے کی چوٹ کچھ کرا ہوتا ہے؟ اب ہجڑے زنخے تو جیل جانے سے رئے؟'' واقعی وہ اصلی خاں صاحب تھے۔ مسکرائے اور اپنے بڑے سے ہاتھ سے ضامن بھائی کا شانہ تھپتھپا کر بولے۔

''خوش کر دیا خاں صاب۔ کاں کے ہو؟'' جب ضامن بھائی نے اپنا وطن مالوف بتایا تو ضامن بھائی کے قریب بیٹھے اور مسکرا کے بولے۔

''کئی دفعے گیا ہوں دلی۔ مگر بھیئے جی نئیں لگا۔ کس واسطے کے پانچ سات دن گالی نہ دوں تو منہ کا ذائقہ سالا خراب ہو جاتا ہے گا۔ بالکل ایسے جیسے تم بجھے ہوئے سالے حقے کا دم لگانے کی کوشش کرو۔ دلی میں بڑی کوشش کری مگر سالے ہاتھ باندھ کے سر جھکا دیتے ہیں گے۔ اور جوابی گالی نہ دینے والوں کو ہم زنخا سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں گے۔''

ریل جہلم سے نکلی تو خاں صاحب نے بتایا کہ وہ رامپور سے اکیلے ہی پاکستان آئے تھے اور یہ بھی بتایا کہ کوئی دسویں دفعہ مردان جا رہے تھے، جہاں وہ پاکستان بننے سے پہلے سے ہی گنے کے سیزن میں کسی شوگر مل میں کام کرنے آتے تھے۔ وہ بہت مزے کے آدمی نکلے۔ جب ہم راولپنڈی کے ریلوے سٹیشن پہ اُترے تو وہ ہمارے ساتھ ہی اُتر گئے حالانکہ اُنہیں اسی ریل سے آگے جانا تھا۔ بولے۔

''خاں صاب، کسی سالے کا نوکر نئیں ہوں۔ سیزن لگا کے واپس چلا جاتا ہوں۔ اس دفعہ ہمیشہ کو رہنے کے خیال سے آیا ہوں۔ دیکھوں گا۔ اگر جی لگ گیا تو ٹھیک نئیں تو واپس نِکل لیں گے۔''

ہم ریلوے کی صاف ستھری کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، جب خاں صاحب نے پہلی دفعہ پوچھا۔

''اماں کس سلسلے میں سفر ہو رہا ہے بھیئے؟'' جب ضامن بھائی نے اُنہیں بتایا کہ ہم ایک خاتون کے اغوا کے سلسلے میں آئے تھے تو خاں صاحب اُچھل کر بولے۔

''قسم قران کی؟'' میں نے کئی گھنٹوں کے سفر میں اُن کے چہرے پہ ایسی خوشی بھری مسکراہٹ پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پھر بولے۔

''خاں صاب۔ معشوقہ ہے گی کیا؟'' ضامن بھائی نے سرد آہ بھر کر مختصراً سارا واقعہ بیان کیا۔ خاں صاحب یہ سوچے بغیر کہ کس کو دے رہے ہیں ایک مرصع گالی دے کے بولے۔

''اماں پار کرو ادو سالے کو۔'' پھر کچھ سوچ کر مزید ارشاد فرمایا۔

''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تمہیں قسم ہے گی پاک پروردگار کی مجھ سے ضرور کہیو۔ بلکہ اب نہ بھی کہو تو میں اسی وخت دل ہی دل میں قسم کھا چکا ہوں کہ تمہارا کام نبیڑ کے ہی آگے کو سفر کروں گا۔ بھیئے برا متی مانیو۔ دلی والوں سے ایسی اُمید تو نئیں تھی مگر تم نروں والا کام بتا رئے ہو تو دل نئیں مانتا کہ اپنے یاروں کو مصیبت میں چھوڑ کے مردان کو نِکل لوں۔ پروگرام کیا ہے؟ ویسے میرے کنے طمنچہ ہے گا رامپور کا بنا وا۔ بھورے خاں سے بنوایا تھا۔ اماں بھورے خاں کو تو جانتے ہو گے؟ محلّہ نالے پار کے ہیں گے۔'' میں نہیں چاہتا تھا کہ خاں صاحب کو اس کام میں شریک کیا جاتا لیکن شاید ضامن بھائی میری طرف سے مشکوک تھے اور اب جو یہ خدائی مدد اُنہیں حاصل ہوئی تھی تو وہ اس پہ پھولے نہیں سماتے تھے، چنانچہ اُنہوں نے کہا۔

''بس ایک دسراہٹ کی ضرورت تھی خاں صاب۔ یہ لمڈا ویسے میرے ساتھ آیا ہے مگر ابھی کچا ہے۔ اب تم نے حامی بھر لی ہے تو میرے دل سے بوجھ اُتر گیا۔'' خاں صاحب نے اپنی بھوری مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

''بھیئے بعضے بعضے آدمی پیدائشی حرامی ہوتے ہیں گے۔ میں نے اپنے مرشد کے کہنے پہ لڑنا بھڑنا چھوڑ دیا ہے گا۔ کسی بھی زیادہ غصہ آجائے تو سالے کے کانوں کے تلے بجا کے چھوڑ دیتا ہوں۔ کسی اصلی

والے حرامی سے واسطہ پڑ جائے تو واردات چچازاد مسیتا خاں سے کرواتا ہوں۔کوئی ضرورت پڑی تو اُنہیں بلوالیں گے۔اُنہوں نے پہلا قتل سن چھتیس میں کرا تھا۔ہاتھ کھلا واہے گا اُن کا۔پروامتی کر یو کسی قسم کی۔کہو تو تمہارے سالوں، سالوں کو رستے چلتے اُٹھوا کے رامپور پہنچوا دوں؟ آئیں؟'' میں یہ گفتگو سن کر لرز رہا تھا مگر ضامن بھائی پوری طرح لطف لے رہے تھے۔وہ بولے۔

''یار ہو تو تم جیسا ہو خاں صاب۔اس کی ضرورت پڑی تو تمہیں ضرور تکلیف دوں گا۔اماں ناشتے میں کیا کھاؤ گے؟''

خاں صاحب ہمیں اپنے ساتھ ایک ٹوٹی پھوٹی سرائے میں لے گئے۔وہ وہاں پہلے بھی قیام فرما چکے تھے اور کہتے تھے کہ سالے تندوری روٹی اور 'گوش' بہت عمدہ پکاتے ہیں۔میں کچھ دیر کو سو گیا۔آنکھ کھلی تو خاں صاب ایک لمبا کوٹ پہنے ہوئے دکھائی دیئے۔ضامن بھائی نے سفر ہی ایسے ایک کوٹ میں کیا تھا۔خان صاب نے اپنی نگرانی میں 'گوش' تیار کروایا اور کوئی ساڑھے نو بجے ہم چلنے لگے تو ضامن بھائی نے یہ منحوس انکشاف کیا کہ وہ کاغذ جس پہ مجوزہ مغویہ کے گھر کا پتہ لکھا تھا، کہیں گم ہو گیا تھا۔میں نے فکرمندی سے کہا۔

''اب کیا ہوگا؟ ضامن بھائی تمہیں کاغذ سنبھال کے رکھنا تھا۔یاد ہے کہاں گرا ہوگا؟'' ضامن بھائی کو دس پندرہ منٹ ذہن پہ زور ڈالنے پر یاد آیا کہ اُنہوں نے ریل میں جو ناشتہ منگوایا تھا، اُس کے پیسے بیرے کو دیتے ہوئے وہ کاغذ وہیں گرا تھا۔

اب ہم بالکل اندھیرے میں تھے۔خاں صاحب بولے۔

''اماں محلے کا نام یاد ہے؟''

ضامن بھائی کو محلے کا نام یاد تھا اور اُنہوں نے کبھی سنا تھا کہ اُن کی محبوبہ کے گھر کے عین سامنے پانی کی وہ ٹنکی بھی تھی جس سے علاقے کو پانی سپلائی ہوتا تھا۔

ایسی سہولت اُن دنوں خال خال تھی۔انگریزوں نے یہ کام شروع ہی کیا تھا کہ وہ یہاں سے روانہ ہو گئے۔خاں صاحب بولے۔

''آدھا کام ہو گیا خاں صاحب۔ایسی پانی کی ٹنکیں کتی ہوں گی شہر میں؟ فکر مت کرو۔تانگے والے سالے سب جانتے ہیں۔تم نکلنے کی تیاری کرو۔کس واسطے کہ اس آدھے شہر میں بجلی نئیں ہے گی اور رات زیادہ ہو جائے تو تانگے والے آدمی سے اپنی ماں کے خصم بن جاتے ہیں گے اور ڈبل کرایہ مانگتے ہیں گے۔''

تین آدمیوں پر مشتمل مجرموں یا ملزموں کا یہ قافلہ جب سرائے سے نکلا تو واقعی شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اُس زمانے میں بجلی خال خال علاقوں میں تھی۔تانگوں کا اڈا سرائے سے قریب

تھا اور ہمیں وہاں کھڑا ایک ہی تانگہ دکھائی دیا۔ہم قریب پہنچے۔میونسپلٹی کے اندھے لیمپ کی ملگجی روشنی میں تانگے والا ہمیں سکڑا سمٹا اور چادر کی بکل مارے اگلی نشست پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔خاں صاحب اور ضامن بھائی پیچھے اور میں آگے بیٹھ گیا۔خاں صاحب نے تانگے والے کو محلے کا نام بتایا اور بولے۔

''ابے دیکھا ہے وہ محلّہ؟'' تانگے والا جو تانگے کے بم پہ بیٹھا تھا، گھوڑی کو ہلکی سے چابک مار کر بولا۔

''ویکھیا ہے جی۔ویکھیا ہے۔تسی فکر نہ کرو۔'' خاں صاحب نے غالباً اچانک آ جانے والے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ہوں آں (وہاں) پانی کی ٹنکی بھی ہے گی۔یہ بڑی سی۔ابے وہ بھی دیکھی ہے؟'' تانگے والا بولا۔

''ہاں جی۔تسی فکر ہی نہ کرو۔''

چند لمحے خاموشی کے گزرے۔تانگہ ویرانے میں چل رہا تھا۔رات اندھیری اور سرد تھی۔آسمان پر غالباً گہرے بادل تھے کیونکہ ایک تارہ بھی نہیں دِکھ رہا تھا۔میں اپنے آپ کو جی ہی جی میں کوسنے لگا کہ میں نے ضامن بھائی کے ساتھ یہاں آنے کی حامی ہی کیوں بھری تھی۔مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا۔زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا۔ضامن بھائی ناراض ہی ہو جاتے۔دو چار دن میں خود ہی من بھی جاتے۔اگر میں نے یہ بلا خود اپنے گلے میں نہ ڈالی ہوتی تو اس وقت میں مزے سے اپنے کمرے میں گرم لحاف اوڑھے سو رہا ہوتا۔میں ابھی یہیں تک ہی سوچ پایا تھا کہ تانگے والے کی آواز آئی۔

''ویسے کدھر سے آئے ہو جی خیر سے؟ بمبئی سے؟'' خاں صاحب ڈپٹ کے بولے۔

''ابے ہم تجھے بمبئی کے لگتے ہیں گے سالے؟ تجھے اشرافوں کی ذرا بھی پہچان نئیں؟'' میں نہیں چاہتا تھا کہ چلتے تانگے میں کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا، چنانچہ میں نے کہا۔

''ارے یونہی پوچھ رہا ہے خاں صاحب۔اُس بیچارے کو کیا پتہ کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' خاں صاحب ہنسے اور بولے۔

''مگر اِتا اندازہ تو ہونا چاہئے انسان کو۔خیر!'' تانگے والا بیڑی سلگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''اس لیے پوچھا تھا جی کہ میں چار پانچ سال بمبئی میں رہ کے آیا ہوں۔ویسے اپنا وطن یہی شہر ہے۔جب مارکاٹ شروع ہوئی تو اِدھر آ گیا۔''

وہ بمبیا چھاپ کی اُردو وہ کوشش کر کے بول رہا تھا۔خاں صاحب غالباً اس وقت ممکنہ اغوا کی جزئیات پر غور کر رہے تھے، چنانچہ اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو ضامن بھائی بولے۔

''کتی دور رہ گیا بھائی؟''

تانگے والے نے گھوڑی کو پھر چابک سے عادتاً چھوا اور بولا۔

''دس پندراں مِنٹ اور لگیں گے جی۔ پانی والی ٹینکی کے قریب کس کے گھر جانا ہے جی؟'' ضامن بھائی کے بولنے سے پہلے خاں صاحب بولے۔

''جانا ہے کسی کے گھر۔ چپکا تانگہ چلا۔'' تانگے والے نے ہمیں پانی کی ٹنکی کے عین سامنے اُتار دا۔ خاں صاحب نے واپسی کا کرایہ دے کر کہا۔

''ابے ہم تیرا تانگہ سٹیشن تک بُک کررئے ہیں واپسی کے لئے۔ گلی کے باہر انتظار کریو اور دیکھ بھاگنے کی کوشش مت کریو نئیں تو سالے گھوڑا مر جائے گا تیرا۔'' تانگے والا اس نوع کی دھمکی اور وعدہ خلافی کی صورت میں اس کے بددعا میں تبدیل ہونے کے خوف سے لرز گیا اور بولا۔

''فکر ہی نہ کرو بادشاہو۔ جب بلانا ہو بندہ بھیج دینا۔ ویسے یہ گھوڑا نئیں ہے جی۔ گھوڑی ہے۔'' اس پہ خاں صاحب کو غصہ آ گیا اور وہ بولے۔

''سالے دل لگی کر رہا ہے اس وخت؟ ہمیں کیا خبر کہ کیا ہے؟ اور رات میں گھوڑا گھوڑی ایک ہی طرح کے دِکھتے ہیں۔ اب ٹٹول کے تو دیکھا نئیں تھا۔ ویسے ای کوشش کری تھی دیکھنے کی۔ پتہ نئیں چلا تو تُو چِلے پن پہ اُتر آیا۔ آئیں؟''

ہم ٹنکی کے عین سامنے کھڑے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ٹنکی کے سامنے ایک ہی گھر ہوگا۔ وہاں پرانے دکھائی دینے والے گھروں کی ایک قطار تھی جس میں دس بارہ گھر تو رہے ہی ہوں گے۔ ضامن بھائی گھروں کی قطار کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے اور کبھی نفی میں۔ خاں صاحب کچھ دیر تو یہ حرکت برداشت کرتے رہے پھر بولے۔

''اماں یہ کیا کررئے ہو پارے؟ ایسے تو قیامت تک پتہ نئیں چلنے کا۔ یار تم نے پتہ گما کے بڑی غلطی کری۔''

غلطی ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ انتظار کرتی ضامن بھائی کی محبوبہ کو کیسے ڈھونڈا جائے۔ ہم تینوں انتہائی مشکوک حالات میں کھڑے تھے اور کسی بھی وقت کسی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ ضامن بھائی کبھی ٹہلتے، کسی گھر کے آگے رکتے اور پھر نفی میں سر ہلا کر یوں ٹھوڑی مسل کر آگے بڑھ جاتے جیسے کسی خیال کو رد کیا ہو۔ مجھے اُس وقت سے شدید اُلجھن ہو رہی تھی جب سے پتہ چلا تھا کہ ضامن بھائی مطلوبہ کا پتہ کہیں گم کر چکے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس سارے معاملے پہ خاک ڈال کے ہم واپس اپنے شہر چلے جاتے۔ یہ ایک کھلی گلی تھی۔ ایک طرف مکانات بنے ہوئے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا اور میدان میں پانی کی وہ ٹنکی بنی ہوئی تھی کہ جس کے سامنے واقع دس بارہ مکانات میں سے، ایک سے ہمیں بقول خاں صاحب کے لونڈیا

لِکالنی تھی۔ پھر خان صاحب نے ایک انوکھی تجویز پیش کی لیکن اُس سے پہلے اُنہوں ضامن بھائی سے سگریٹ مانگ کر سلگایا کیونکہ وہ اپنے پان ختم کر چکے تھے۔ پھر بولے۔

''اماں ضامن خاں۔ وہ تمہاری آواز تو پہچانتی ہوں گی۔ آئیں؟'' ضامن بھائی حیرت سے بولے۔

''میں یہ سوال نئیں سمجھا خاں صاب!'' خاں صاحب نے سگریٹ کا کش لگایا اور بولے۔

''اِتی آسان سے بات نئیں سمجھے؟ صاب حیرت ہے۔ میں کے رہا ہوں کہ کیا وہ تمہاری آواز پہچانتی ہیں گی یا نئیں؟'' ضامن بھائی مسکرا کر بولے۔

''خوب پہچانتی ہیں۔ کیوں نئیں پہچانتیں؟ ابھی ہماری جدائی کو عرصہ ہی کِتا گزرا ہے۔ اور وہ تو مجھ سے فرمائش کر کے گانے بھی سنتی تھیں۔'' یہ سن کر خاں صاب پھڑک اُٹھے اور بولے۔

''گانا بھی سنتی تھیں؟ اماں کونسا والا؟'' ضامن بھائی نے سن پیتالیس کی کسی فلم کا گانا بتلایا۔

جیا بھرما کے چلے نہیں جانا۔ خاں صاحب جھوم اُٹھے اور بولے۔

''اماں بس بس۔ کیا یاد دلا دیا؟ بہت سنا ہے گا میں نے یہ والا گانا رنڈیوں سے۔ دو مہینے پہلے ہی شبن خاں کے لونڈے کی شادی میں بھی سنا تھا مگر سارا 'لفظ' ولیمے کے کھانے نے غارت کر دیا۔ بھیئے ہم تو بڑے ارمان سے گئے تھے مگر باورچی سالا شاید اُس روز اپنی جرو اسے لڑ کے آیا تھا۔ پھینکا سالن پکا دیا تھا سالے نے۔ خیر یہ قصہ کسی اور دن سناؤں گا۔ پارے بہت ہی بڑھیا گانا ہے۔ کام ہو گیا۔ اب سنو۔ یہ گانا گاتے وے ہیاں سے ہو آں تک چلے جاؤ۔ وہ سنیں گی اور لپک کے گھر سے باہر آ جاں گی۔''

مجھے یہ صورت حال بڑی عجیب لگی۔ رات کے بارہ بجے ضامن بھائی یہ گانا گاتے ہوئے قطار کے مکانوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلیں گے۔ میں نے ضامن بھائی کو دیکھا۔ وہ اس پر تیار یوں دِکھ رہے تھے کہ کئی مرتبہ کھنکھار کر گلا صاف کر چکے تھے۔ مجھے اُس لمحے ضامن بھائی کی محبوبہ کے ٹیسٹ کا اندازہ دو باتوں کی بنا پر ہوا۔ ایک تو میری دانست میں یہ ایک انتہائی واہیات اور بازاری گانا تھا اور دوسرے یہ کہ ضامن بھائی کی آواز اس یا کسی بھی گانے کو گانے کے لیے قطعی موزوں نہیں تھی۔ مگر صاحب عشق انسان سے کیا کیا نہیں کراتا۔ چنانچہ ضامن بھائی گاتے ہوئے آگے بڑھے۔ لیکن مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ خاں صاحب بھی اس صورت حال پر پریشان دِکھ رہے تھے۔ پھر اُنہوں نے اپنے کسی پیر و مرشد کا نام لیا اور بولے کہ وہ ہر وخت اُن پر نظر رکھتے ہیں اور اس وقت بھی یقیناً ایسا ہی ہو رہا ہوگا۔ پھر اُنہوں نے ایک مختصر سا واقعہ سنایا جو میری دانست میں اُن کے پیر صاحب کی شرافت پر دھبہ ہی تھا۔ بولے میں رنڈی کا ناچ دیکھنے گیا۔ غلطی سے پانچ کی جگہ سو کا نوٹ جیب سے نِکل گیا۔ دینے کو ہی تھا کہ ظاہر ہوئے اور میرے

منہ پہ ایک چنکٹ مار کے سب سے خفیہ بولے۔سالے کیا کر رہا ہے۔دینے سے پہلے نوٹ پہ نظر ڈال۔اب جو دیکھا تو پتہ چلا کہ میں کیا کرنے والا تھا۔پھر زبان نکال کے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑے اور توبہ کا بصری تاثر دیتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا۔

''ہر نوچندی جمعرات کو سارا رامپور اُن کے مزار شریف پہ جمع ہوتا ہے گا۔اُسی روز رامپور میں سب سے زیادہ چکو چلتے ہیں گے۔لوگ کہتے ہیں کہ پٹھانوں کی 'جاہلیت' کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ نئیں بھئی بڑا اجلالی مزار ہے گا۔ویسے بھی جس جگہ دو پٹھان جمع ہو جائیں اور اُن میں اور کچھ نئیں کم از کم گالی گفتار نہ ہو تو سمجھ لو کہ ایک اصلی نئیں ہے گا اُن میں سے۔بھیئے نیفے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھنا پڑتا ہے گا۔اس واسطے کہ کس وخت کون حرامی پن کر دے اور چکو کھینچنا پڑ جائے۔''

رامپوری پٹھانوں اور اُن کے اصلی یا نقلی ہونے کا کلیہ بتا کر چند لمحوں تک سوچا اور پھر بولے۔

''اماں ضامن خاں۔اسی گلی میں رہتی ھینگی۔تمہیں یقین ہے نا؟''

ضامن بھائی نے اپنے حافظے پر زور دیا۔لکھے ہوئے پتے کو یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر قدرے شرمندگی سے بولے۔

''یقین سے نئیں کہہ سکتا خاں صاب۔میرے خیال میں گلی تو یئی ہے۔کس واسطے کے پانی کی ٹنکی کا ذکر میں نے کئی دفعے سنا ہے۔''

خان صاحب نے طویل سانس لی اور پھر ایک سگریٹ ضامن بھائی سے مانگ کر پیا اور کچھ دیر ٹہل کر ہمارے قریب رکے اور بولے۔

''میں لکھ کے دے رہا ہوں کہ وہ اس گلی میں نئیں رہتیں۔کس واسطے کہ اگر رہتی ہوتیں تو گانے کی آواز پہ ضرور بے قرار ہو کے نِکل پڑتیں اور تمہارے گلے سے چِپٹ جاتیں اور اس وخت لیلیٰ مجنوں والا سین چل رہا ہوتا۔'' یہ کہہ کر مجھے آنکھ ماری اور اطمینان سے سگریٹ پینے لگے۔

بیان کے اس آخری حصے سے مجھے بھی اتفاق تھا۔ضامن بھائی کی آواز سن کر تو مردے تک قبروں سے 'نِکل' پڑتے۔خاں صاب شاید تھک گئے تھے۔وہ میدان میں پڑے ایک بڑے سے پتھر پہ بیٹھ کے بولے۔

''اب کیا کرا جائے؟ بڑی کوشش کر رہا ہوں مگر پیر صاب بھی مدد کو نئیں آ رئے۔اصل میں، مَیں اس وخت باوضو نئیں ہوں۔تم نے اِتی چائے جو پلوا دی۔میں اسی مارے رات میں چائے نئیں پیتا۔پیشاب سالا اُدھیڑ کے رکھ دیتا ہے۔'' جی میں تو آیا کہہ دوں کہ جس تقریب میں آپ کے مرشد نے آپ کی مدد کی تھی وہاں کیا آپ باوضو ہو کر وہ فعل سرانجام دے رہے تھے جو اُس قصے میں کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔مگر میں

دونوں سے عمر میں چھوٹا تھا اس لیے خاموش رہا۔پھر ضامن بھائی نے سالم سگریٹ سلگایا اور بولے۔

''خاں صاب۔اگر ہمیں آج کی رات ناکامی ہوئی تو میں کیا کروں گا۔ارے میرا تو دل یہ سوچ سوچ سوختہ کے ہو رہا ہے کہ میری معشوقہ کسی اور کی بغل گرم کر رئی ہوگی؟ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔خاں صاب۔میں ڈر رہا ہوں کہ میں کوئی حرام کام نہ کر بیٹھوں۔''

خان صاحب نے ضامن بھائی کے ہاتھ سے سگریٹ لیا۔دو کش لگائے اور زمین پر پھینک کر بولے۔

''صبر کرو بیرن۔اللہ سب خیر کرے گا۔'' ضامن بھائی سگریٹ پھینکنے والی حرکت پہ تڑپ گئے اور سگریٹ اُٹھا کر اُسے صاف کر کے اُس کا کش لے کر بولے۔

''خاں صاب۔فضول خرچی کرنے والوں کے لئے بڑا سخت حکم آیا ہے۔ابھی وِس سالے میں کچھ نئیں تو دس 'دم' باقی ہوں گے اور تم نے پھینک دیا۔توبہ کرو۔''

خاں صاحب نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کے توبہ کا بصری تاثر دیا اور بولے۔

''تو پھر اب کیا ارادہ ہیگا یارے؟''

اگر وہ مجھ سے پوچھتے تو میں صاف کہہ دیتا کہ گھر واپس چلے چلیں۔مگر وہ ضامن بھائی سے پوچھ رہے تھے۔میں نے شروع ہی سے اس معاملے میں خاں صاحب کی مداخلت اور مدد کو پسند نہیں کیا تھا۔ضامن بھائی اُن سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک ایک بات میں اُنہیں شاملِ مشورہ کر رہے تھے۔ضامن بھائی نے انگوٹھے اور اُنگلی کی مدد سے سگریٹ کا ست نکالا اور پھر اُسے نیم دلی سے نالی میں اُچھال کر بولے۔

''مغز کچھ کام نئیں کر رہا ہے خاں صاب۔یہ تو طے ہے کہ اس وخت انہی مکانوں میں سے کسی میں خواب خرگوش کے مزے لے رئی ہوں گی اور اُنہیں پتہ بھی نئیں ہوگا کہ ایک سوختہ جان اُن کے لیے کیسے دربدر ہو رہا ہے؟''

میں جانتا تھا ضامن بھائی نے اس وقت حال میں ہی دیکھی فلم لیلیٰ مجنوں کے مکالمے بولے تھے مگر میں خاموش رہا۔خاں صاحب ہنسے اور بولے۔

''خاں صاحب اس وخت تم پریشانی میں ہو ورنہ میں ضرور ٹونکتا کہ سوختہ جاں نئیں سوختہ پدر کہتے ہیں گے ایسے جنے کو ہمارے ہیاں۔'' شاید ضامن بھائی نے اُن کی بات غور سے نہیں سنی۔پھر وہ بولے۔

''چلو بھائی اب جو بھی نصیب میں ہو۔'' پھر آسمان کی طرف دیکھا اور اپنی ناکامی میں اللہ میاں کو شامل کیا اور بولے۔

''تُو کہتا ہے کہ بندہ اگر کوشش کرے تو میں ضرور مدد کرتا ہوں۔ہم نے اپنی سی پوری کوشش کری۔اب اگر تیری مرضی نئیں تو کیا ہو سکتا ہے؟''

واپسی میں جب ہم تانگے میں ریلوے سٹیشن جا رہے تھے خان صاحب نے ایک دفعہ پھر اپنے پیر و مرشد کے دو چار ایسے واقعات سنائے جن سے نالوں کا فوری اور مثبت جواب آنا ثابت ہوتا تھا۔ پھر اُنہوں نے اس کی وجہ بھی بتلائی۔

''خاں صاب۔ سن اکتالیس کی بات ہے گی۔ میرا ایک کام پھنسا وا تھا۔ ہو کے ای نئیں دے ریا تھا۔ میں نے دو تین دفعے مرشد کے مزار پہ گڑگڑا کے دعا بھی مانگی۔ مگر کچھ نئیں ہوا۔ پھر ایک روز پٹھنو لی جوش میں، میں نے طمنچہ اُن کے مزار پہ رکھا۔ دعا مانگی اور چلتے وخت صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کام کے لیے دوبارہ نہ آنا پڑے۔ کہے دے ریا ہوں۔ وہ دن اور آج کا دن۔ میرے مزار میں گھسنے سے پہلے میرا کام ہو جاتا ہے گا۔''

تانگے والے نے یہ واقعہ سن کر توبہ کرنے کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ خان صاحب کو مردان جانا تھا۔ جدائی کے وقت وہ مجھ سے اور ضامن بھائی سے گلے ملے اور رقت آمیز لہجے میں بولے۔

''اللہ کے سپرد کرا پیر ن۔ دیکھو خط ضرور لکھیو اور حالات سے ضرور آگاہ کیجیو۔ میں پھر گے ریا ہوں کہ (یہاں فرط جذبات میں اُنہوں نے ضامن بھائی کی مجوزہ بیوی کے لیے جو لفظ استعمال کیا، وہ لکھا نہیں جا سکتا) سے ہی بیاہ کریو کس واسطے کے مرد کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے گا کہ اُس کی معشوقہ (ایک اور نا گفتنی لفظ) کسی اور (مزید ایسا ہی لفظ) کی بغل گرم کرے اور وہ سالا کسی (انتہائی معیوب ایک اور لفظ جس میں ایک قابل اعتراض وصف کی طرف بھی اشارہ تھا) کی طرح صرف روتا پیٹتا رہ جائے۔ میں تو گے ریا ہوں میں تمہارے ساتھ چلا چلتا ہوں مگر تم تکلف کر رئے ہو۔ مگر خیر اس دفعے خوب ٹھونک بجا کے منصوبہ بنایو۔ دس مِلٹ میں اُٹھالائیں گے۔ نکاح کی فکر مت کریو۔ اِتا علم مجھے بھی ہے گا۔ کھٹ سے تمہاری جوزہ بنا دوں گا۔''

خاں صاحب کی ریل نے سیٹی بجائی تو وہ بھاگ کے اُس پہ سوار ہوئے اور آخر تک کچھ کہتے رہے جس میں سے سوائے چند گالیوں کے میری سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ ضامن بھائی واپسی کے سفر میں زیادہ تر خاموش ہی رہے اور بولے تو محض اپنے سالوں کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا! (جاری)

◂◂ ● ▸▸

C/o Dr. Rehana Iqbal Hazara Road
Hasan Abdal Dist. : Attock 47000
(Pakistan)

ثالث پر تبصرے

رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

● **عشرت ظہیر**

''ثالث'' شمارہ نمبر ۱۷ پیش نظر ہے۔

اداریہ کا پہلا جملہ ہے۔

''۲۰۲۰ء کا سال پوری دنیا کے لئے ایک ڈراؤنا خواب جیسا تھا۔'' اس جملے نے گزرے سال کی تمامتر المناکی کو گویا تازہ کر دیا ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ ایک سال کی طویل مدت کی صعوبتوں کے ذکر میں ادبی شخصیتوں کے بچھڑنے کا غم کمال ہنرمندی کے ساتھ آتش کے اس شعر کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
رویئے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجئے

زیرِ نظر شمارہ کی فہرست پر نظر ڈالتے ہی احساس ہوتا ہے، یہاں بہ نسبت دیگر اصناف کے مضامین کا پلّہ بھاری ہے۔ شامل اشاعت ۱۲ مضامین میں سے، سلمان عبدالصمد کا مضمون ''سوالات کے آئینے میں .... شعر شور انگیز'' کو خانہ استثنا میں رکھیں، تو دوسرے تمام مضامین توصیفی لب ولہجہ کے غماز ہیں اور سارے مضامین متعلقہ فنکار کی تخلیقی کاوشوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندی فلموں میں اردو کی خوشبو (ڈاکٹر منور عالم) اور اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب کی اہمیت ومعنویت (محمد شارب) موضوعی نہج کے مضامین ہیں۔ اگر فنکار ڈیزرو کرتا ہے تو، توصیفی انداز کے مضامین قلم بند کئے جانے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ لیکن بادی النظر میں یہ احساس جاں گزیں ہے کہ ہمارا ادبی تنقیدی نظام شاید اپنے منصب سے بھٹک گیا ہے۔

سلمان عبدالصمد کا مضمون ''سوالات کے آئینے میں .... شعر شور انگیز'' ان کی عرق ریزی اور مشقت انگیزی کا حاصل ہے۔ سوالات جسارت کا بھی اظہار کرتے ہیں اور ذہانت وذکاوت کی غمازی بھی کرتے ہیں۔

ایک طرح سے سلمان عبدالصمد نے بھولی بسری تنقیدی روایت کی خوبصورت پیروی کی ہے، کہ اس طرح کے سوالات دراصل فنکار کی بے چینی کی نمائندگی کرتے ہیں، جس کے ذریعے فنّی سربلندی کی جستجو مقصد ہوتا ہے۔اس بے باکانہ مضمون تحریر کئے جانے کے لیے سلمان عبدالصمد کو، اور مضمون کو شامل اشاعت کئے جانے کے لئے اقبال حسن آزاد کو مبارک باد۔ڈاکٹر انور ایرج نے اپنے مضمون ''اجتہادی لہجے کا شاعر...وہاب دانش'' میں گہرائی کے ساتھ ان کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ان کا سپورٹنگ انداز تحریر مدلل اور استدلالی ہے۔ڈاکٹر ارشد اقبال نے '' اسرار گاندھی کی تخلیقی ارتقاع'' میں اسرار گاندھی کے افسانوی کائنات کے ارتقاعی (Elevation) پہلو کو نہایت خوبصورت مباحث کے ذریعے منکشف کیا ہے۔ڈاکٹر صفدر امام قادری کے خاکوں کا مجموعہ ''جانے پہچانے لوگ'' کے تعلق سے ڈاکٹر شمیم اختر کی تحریر متعلقہ کتاب کے مطالعہ کی خواہش جگاتا ہے۔ڈاکٹر شازیہ کمال نے عبدلصمد کے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کے تنقیدی مطالعہ میں عبدالصمد کی فکشن نگاری کو مختصراً نمایاں کرتے ہوئے ناول کی کہانی کے اہم پہلوؤں کا پُرکشش تجزیہ پیش کیا ہے۔

حضرت محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم جیسی شخصیت کی ہم سری، ان سے قربت ایک اعزاز ہے۔اور ایسی فرشتہ صفت، قابل تقلید شخصیت کا خاکہ لکھنا، باعث افتخار بھی ہے اور لائق ستائش بھی۔اقبال حسن آزاد نے محترم شخصیت کا خاکہ نہایت بردباری اور مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

''ہنستا ہوا نورانی چہرہ، ستواں ناک، چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی روشن آنکھیں، دیدہ زیب ریش، سر پر گول ٹوپی اور کافی سے بھی کچھ زیادہ لمبا لبادہ، ہاتھ میں چھڑی، اور کمر قدرے خم، ان کی آواز صاف اور بلند تھی اور لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بالکل کھرے ہیں.....اور پھر احمد فراز کا شعر، گویا انہیں کے لئے کہا گیا ہو۔

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

افسانوی حصّہ میں راجبد رسنگھ بیدی کا افسانہ ''کوارنٹین'' کی شمولیت مدیر کی دور نگاہی اور دور اندیشی اور وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے کی بہترین مثال ہے۔اس افسانہ کی اشاعت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فن کبھی از کار رفتہ نہیں ہوتا۔اگر فن سچا اور کھرا ہے تو اس کا آفاقی پہلو ہمیشہ رر تازہ کار اور خیال انگیز رہے گا، زندہ رہے گا۔افسانہ کے فن کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ:

''کردار محض ایک کھونٹی ہے جس پر کسی بھی قسم کا لباس ٹانگا جا سکتا ہے۔''

لیکن بیدی کے اس افسانے میں ولیم بھاگو کے کردار کا استحکام، اس کی سچائی اور کہانی کے تھیم میں اس کی حصہ داری اور کہانی کے نشیب و فراز میں بھاگو کی ہم آہنگی 'فن کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے اور یہ فاروقی کے کلیہ کا

نفی بھی کرتا ہے۔شموئل احمد کا افسانہ ''قصاب کی محبوبہ'' ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔افسانے کی فضا بندی میں مہارت اور نازک مرحلے کے لطیف اشاروں نے افسانے کو پُر وقار انداز میں مقام اعلیٰ پر متمکن کیا ہے۔اسرار گاندھی کا افسانہ ''ہڈیاں'' یوں تو موضوع کے لحاظ سے از کار رفتہ اور پائمال ہے، لیکن اسلوب کی تازگی اور برتاؤ نے افسانے کو اثر انگیز بنا دیا ہے۔یوں بھی آج کا افسانہ موضوع کا نہیں' طرز اظہار کا متلاشی ہے۔دادی ماں روایت کم گشتہ یا لا یعنی رواج کی علامت کے طور پر افسانہ میں اس طرح موجود ہیں کہ ایک عجیب سحر انگیز ماحول خلق ہو گیا ہے۔افسانہ اسرار کے دھند لکے میں قاری کو باندھے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔لیکن افسانہ تو اس جملے کے ساتھ ہی مکمل ہو جاتا ہے ''اس کا نگاہیں شمع دان پر ٹک گئیں۔''اس کے بعد ''رات کے ابھی دس ہی بجے تھے .....کمبخت بجلی کو بھی آج ہی جانا تھا'' یہ چھ سطریں وضاحتی ہیں جو افسانے کو کمزور کرتی ہے۔احمد رشید کا افسانہ ''سفید لباس، سیاہ راتیں'' اور تنویر تماپوری کا افسانہ ''وائرس'' کامیاب اور اثر انگیز ہے۔

غزلوں میں ارشد عبدالحمید، عین تابش، اور فردوس گیاوی کی غزلیں عصر حاضر کے تفکر کے پیش کش میں کامیاب بھی ہیں اور متاثر کن بھی۔

خورشید اکرم کی نظم ''پریمی کی پتنی کو.... پریم گیت کھلنائکہ کا'' خوبصورت فکر اور ندرت خیال کی دلپذیر نظم ہے۔انہوں نے فٹ نوٹ کے طور پر رشمی بھاردواج کی نظم (مطبوعہ ثالث 16-15) ''شوہر کی محبوبہ کے نام'' کی پذیرائی کی ہے اور اسے فیض احمد فیض کی نظم ''رقیب سے'' کے مقابل، اہم قرار دیا ہے۔متعلقہ نظم کو پڑھ کر فیض کی نظم کی بازیافت بذاتِ خود رشمی بھاردواج کے لئے اعزاز کا باعث ہے۔لیکن یہ فیض کی نظم کے ہم پلّہ تو نہیں۔یہ درست ہے کہ یہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے ہندی کویتا کے روایتی عمومی انداز فکر سے آگے نکلتی ہوئی سی ہے۔ہندی کویتا کا لب و لہجہ، اردو زبان کی نغمگی، الفاظ کی شیرنی اور مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صفتوں کو نہیں پا سکتی۔

رشمی بھاردواج کی نظم کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

تمہیں جو ملا تھا وہ
میری محبت کا بچا کھچا تھا
ہمارے تعلقات سے بچی رہ گئی
خواہشوں کا بھوت

اور فیض کی نظم کے یہ مصرعے دیکھیں:

تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور

جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جس کے تصور میں لٹا دی ہم نے

دلچسپ اور خیال انگیز ہوتا، اگر دونوں نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا، لیکن تنگیٔ وقت اور طوالت کے خوف سے ایسا ممکن نہیں۔

ثالث کا یہ شمارہ اپنی اہمیت کے اظہار میں گویا کہہ رہا ہے

رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

◂◂ ● ▸▸

● ڈاکٹر شاہد جمیل

کتابی سلسلہ ''ثالث'' مونگیر کا شمارہ 17 جنوری تا مارچ 2021 بھی حسبِ روایت قابلِ مطالعہ عمدہ تخلیقات کا گلدستہ ہے۔ 'پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا' رضا نقوی واہی کا یہ مصرع ضرب المثل بن چکا ہے۔ میں احباب کی ناراضگی کو جھیل جاتا ہوں، لیکن بغیر پڑھے کبھی نہ بولتا اور نہ لکھتا ہوں۔ البتہ جب کوئی کتاب یا رسالہ مجھے تقریری یا پھر تحریری اظہارِ خیال کے لیے مجبور کر دیتا ہے، تب میں اُس کا حق ادا کر دیتا ہوں۔

'اداریہ' رقم کرنا تپائی پر کتھک نرتیہ جیسا دشوار عمل ہے۔ اقبال حسن آزاد کے اداریے بیباک، عصری حقائق کے مظہر ہوتے ہیں اور دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے، ''اس دور میں کرونائی ادب کے نام سے اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ان نگارشات میں کتنے لعل و گہر تھے اور کتنے سنگ و خشت.....اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ شعر و ادب کی رفتار رکنے نہیں پائی اور ساتھ ہی ساتھ مقامی اور ملکی سطح کے بیشمار شاعر و ادیب بھی ''بین الاقوامی'' ہو گئے۔ لیکن ادبی سطح پر جو کام واقعی لائق ستائش تھا وہ کتب و رسائل کی اشاعت کا تھا.....انہی رسائل میں 'ثالث' بھی شامل ہے جس نے 596 صفحات کا 'عالمی خواتین ادب نمبر' نکال کر ایک تاریخ رقم کر دی۔''

میں مذکورہ حقائق سے متفق ہوں اور اقبال حسن آزاد کے اِس عزم و حوصلے کو سلام کرتا ہوں کہ موصوف نے کرونا مرض کو شکست دے کر 'ثالث' کے شمارہ-17 کو بروقت منظر عام پر لایا۔ اردو اور ہندی کے کئی رسائل کی ادارت کے ذاتی تجربے کی بنیاد پر میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ رسالے پیسے اور دیگر ذرائع سے نہیں بلکہ عزم و حوصلے سے معیار و وقار کے ساتھ جاری رہتے ہیں۔

مشمولات کی فہرست سے قارئین کو شمارہ-17 کے معیاری ہونے کے ساتھ اِس بات کا بھی

بخوبی اندازہ ہوگا ہے کہ مدیر اعلیٰ کو بین الاقوامی سطح کے تخلیق کاروں کا بھی ادبی تعاون حاصل ہے۔ یہ بڑی نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے۔

'منتخب افسانہ' کے تحت شامل راجندر سنگھ بیدی کے افسانے 'کوارنٹین' کا انتخاب اقبال حسن آزاد کے علم و آگہی اور مدیرانہ اختصاص کا عکّاس اور حاصلِ شمارہ ہے۔ یہ ایک لازوال تخلیق ہے۔ لازوال تخلیق کی قدر و قیمت اور افادیت پر عہدِ رفتہ اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ وہ اقوالِ زرّین کی طرح ہر عہد میں اثر انگیز، مطلوب و محبوب اور سکّۂ رائج الوقت سا ہوتا ہے۔ اِس افسانے کا امتیازی اختصاص یہ ہے کہ چوہوں سے پھیلنے والی خطرناک وبا پلیگ کی جگہ کوویڈ ۱۹ درج کر دیا جائے تو اسے بلاشبہ 'کرونا کال' میں تخلیق کردہ سمجھ لیا جائے گا۔

مرض کی شدّت اور اِس کے پھیلاؤ کی سونامی، اموات کا لامتناہی سلسلہ، چہار سو خوف و دہشت کا ماحول، عالمِ تنہائی کی گھٹن اور جبراً گوشہ نشینی کا عذاب عظیم، بے بسی کی انوکھی چبھن، کچھ کرنے کی للک اور کچھ نہ کر پانے کی تڑپ و اذیّت، اعلیٰ انسانی اقدار کا انحطاط و زوال، خونی رشتوں سے بھی گریز کی ناگزیر مجبوری، حرص و ہوس کے بڑھتے ناخن، خوف کی تجارت، بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا بڑھتا مسابقتی رجحان بلکہ بہت کچھ منفی و مثبت اور بھی..... اِسی پس منظر میں 'پلیگ' کی وبا میں اپنی جان اور اپنے پریوار کی فکر و پرواہ کیے بغیر رات دن ڈاکٹر بخشی کی معاونت میں لگا، مریضوں کا تیمار دار اور مردوں کو ٹھکانے لگانے والا نو عیسائی ولیم خاکروب سے جب ڈاکٹر بخشی پوچھتے ہیں، ''تمھیں پلیگ سے ڈر نہیں لگتا؟'' تب وہ کہتا ہے، ''نہیں بابو جی.....! بن آئی بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بابو جی! میں کس لائق ہوں مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے، میرا یہ نکمّا پن کسی کے کام آ جائے، اِس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔''

ولیم حاشیئے پر کھڑا رہ جاتا ہے اور ڈاکٹر بخشی کو اُن کی نمایاں خدمات کے صلے میں انعام و اعزاز کے ساتھ لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا جاتا ہے۔ انسانیت اور پیشے کو شرمساری سے بچانے کی مہم میں منہمک، بیوی کو بلی بیدی پر چڑھا کر اور نوزائیدہ بچے کو سینے سے لگائے خدمت و ایثار کے ٹمٹماتے چراغ کو اپنے لہو سے جلائے رکھنے والا ولیم، جب ڈاکٹر بخشی کو مبارکباد پیش کرتا ہے، تب وہ کہتے ہیں، ''دنیا تمھیں نہیں جانتی بھاگو، تو نہ جانے..... میں تو جانتا ہوں۔ تمھارا یسوع تو جانتا ہے۔ پادری ل آبے کے بے مثال چیلے.....تم پر خدا کی رحمت ہو۔'' یہ افسانہ قاری کے ذہن میں مستقل جگہ بنا لیتا ہے۔

شموئل احمد کا افسانہ 'قصاب کی محبوبہ' ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی بے بسی اور اُس کے ذہنی عذاب کی کوکھ سے جنما آکروش اور جائے پناہ کی تلاش کی ناگزیت کا عکّاس ہے۔ اِس کے کئی کردار سیاسی

ہیں، جنھیں پسِ چلمن لا کھڑا کیا گیا ہے۔ کپڑوں سے پہچان لینے والوں کی طرح اُن کی پہچان بھی دشواری نہیں کہ اُن کی گفتگو، سوچ و ذہنیت اور اعمال سے اُن کے نظریئے اور منافقت بخوبی منعکس ہوتی ہیں۔ سیرت سازی کا یہی فنّی کمال ہے۔ نام لیے بغیر صفاتی جملے سیاستدانوں کے شعار رہے ہیں، جس کا استعمال افسانہ نگار نے بھی نہلے پر دہلا جیسا کیا ہے۔ واقعات اور مکالموں میں فاشزم کی جھلک واضح ہے۔ 'لنگی' کی طرح یہ افسانہ بھی بولڈ اور عہدِ حاضر کا آئینہ دار ہے۔ اِس میں بھی جنس کا فلیور، جلیبی میں شیرے کی طرح پیوست ہے۔ پھر بھی ہم فحاشی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ نفسیاتی کیفیت سے بڑا کام لیا گیا ہے۔ سادھونی دورانِ اختلاط عالمِ بالا میں پہنچ کر ہر بار اول فول بکنے لگتی ہے، جن سے ماضی کے کئی بڑے واقعات و حادثات جبّار کے ذہن میں رقص کرنے لگتے ہیں اور وہ ذہنی اذیّت کا شکار ہو جاتا ہے۔ قاری کو بھی ایسا لگتا ہے گویا سادھونی کا نارکوٹسٹ چل رہا ہے اور یہ سمجھتے دیر نہیں لگتی کہ اُسے مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔ وہ بھی ہندو راشٹر اور مسلمان مکت بھارت کی حامی ہے اور حصولِ مقصد کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی اور کروا سکتی ہے۔ بلّی، چوہا کو کھانے سے قبل اُس سے کھیلتی اور محظوظ ہوتی ہے، اُسے چوہے سے محبت نہیں ہوتی۔ ماب لینچنگ میں بھی ایسا ہی کھیل ہوتا اور ایسا ہی لطف و سرور ملتا ہے۔ جبّار بھی سادھونی کے نرغے میں پھنسا چوہے سا ہے، جو اُس کی جنسی آسودگی کا ذریعہ ہے۔

جنسی خواہش اُپلے کی آگ سی ہوتی ہے، جس کی میٹھی آنچ خواہش کی تکمیل چاہتی۔ 'لت' عادی مجرم سی پرانی حرکتوں کے اعادے کے لیے اُکساتی ہے۔ سادھونی کی نظر میں ہٹا کٹّا جبّار چڑھ جاتا ہے۔ پھر وہ اُسے پیٹ اینیمل سا پالتو بنا لیتی ہے۔ وہ اُسے مانس، لہسن اور پیاز کھانے سے منع کرتی ہے، لیکن خود مانس کا سیون کرتی ہے۔ اُسے دھرم اور ذات سے پرہیز نہیں۔ گوشت خور کو من پسند گرم گوشت چاہئے۔ گوشت کھانے اور لڑانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ عالمِ بیخودی میں وہ رازوں کو منکشف کرتی رہتی ہے۔ اِسی منافقت اور فاشزم کو ایکسپوز کیا ہے شموئل احمد نے۔ یہی جراتِ رندانہ اور دلکش بیانیہ انھیں ہم عصروں میں مقامِ ممتاز عطا کرتا ہے۔

اس کا اختتام ایک اعلامیہ ہے کہ منظورِ نظر کو بھی سسٹم کے تحت رہنا اور جور و ظلم سہنا ہوگا۔ سونے کے پنجرے کا قیدی پنچھی بھی آزادی چاہتا اور موقعے کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ انجام کا خوف، جبّار کو فرار ہونے کی ترغیب دیتا اور مجبوری، ماموں کی کانی بیٹی سے شادی کر کے کاروبار سنبھالنے کے لیے آمادہ۔ سمجھوتہ، درگزر، قربانیاں اور خود کو دیش بھکت ثابت کرتے رہنا اقلیتوں کا مقدر بن چکا ہے۔ اب تو حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ اِس دیش میں رہنا ہے، تو بندے ماترم کہنا اور جے شری رام کا نعرہ لگانا ہوگا۔ افسانے کا عنوان 'قصاب کی محبوبہ' کہانی کے بالکل برعکس ہے۔ جبّار قصائی سادھونی کا محبوب یا منظورِ نظر نہیں

بلکہ وہ تو جنسی آسودگی کا فقط ایک آلہ ہے اور اُس کا تیز چھرا خلال سا، جو بے کلی کو سکون بخشتا کرتا ہے۔ اِس قدر بولڈ افسانے کو شاملِ اشاعت کرنا، مدیر اعلیٰ کی دلیری کا بھی مظہر ہے۔

اسرار گاندھی نے 'ہڈّیاں' میں جنسی نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک ایسی دوشیزہ کی کہانی ہے، جس کے قدم، شباب کی دہلیز پر ہی ڈگمگانے لگتے ہیں۔ وہ خواہش کے منہ زور گھوڑے کا لگام پکڑے رہتی ہے، لیکن گھوڑے کے بڑھتے قدم کو روک نہیں پاتی۔ ''اچانک اُس کی نظریں اس آدمی پر ٹِک گئیں جو سر سے پاؤں تک ننگا، کالا بھجنگ اور ہٹّا کٹّا تھا..... منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور چہرے پر مکھّیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ یہ وہی پاگل تھا، جو دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا۔'' ظاہر ہے ایسے آدمی پر نظریں جمائے رکھنا اور اُسے دیکھ کر جسم کا بے قابو ہونا اور آسودگی کے لیے کمرے میں رکھی چیزوں کا جائزہ لینا اور پھر ''شمع دان میں ایک ادھ جلی، خوبصورت سڈول مومی شمع۔ اُس کی نگاہیں شمع دان پر ٹِک گئیں۔

رات کے ابھی دس ہی بجے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی۔ ماچس کے سہارے کوئی شمع دان لینے کمرے میں گیا اور پھر دادی ماں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی، پتا نہیں شمع دان سے شمع کہاں چلی گئی۔ شام تک تو تھی۔ وہ چپ چاپ خموشی سے اپنے پلنگ پر لیٹی تیز تیز سانسیں لے رہی تھی اور پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی، کمبخت بجلی کو بھی آج ہی جانا تھا۔'' یہ سوچ و عمل غیر فطری لگتا ہے۔ ممکن ہے اِسے قاری کا ذہن بھی قبول نہ کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ جنس اور جنسی کی نفسیات کو پیش کرنا، چٹّان سے صنم کو پورے حسن و شباب کے ساتھ نکال لینے جیسا دشوار عمل ہے۔ اسرار گاندھی سینئر افسانہ نگار ہیں۔ اِس لیے قارئین کی بڑی توقعات موصوف سے وابستہ ہیں۔

احمد رشید علیگ کی پہچان اُن کا منفرد و مخصوص اسلوب ہے۔ 'سفید لباس، سیاہ راتیں' ایک عمدہ نفسیاتی افسانہ ہے۔ اسلام نے بیوہ سے شادی کی اجازت دی ہے۔ بیٹے کی موت کے بعد کبھی کبھار گھر والے چاہتے ہیں کہ ان کا دوسرا بیٹا بیوہ سے نکاح کر لے۔ ظہیر ناصرہ سے نکاح تو کر لیتا ہے، لیکن دونوں مخمصے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شوہر کی موت کے بعد ناصرہ گزرے لمحوں کو یاد کرتے ہوئے بھی احساسِ گناہ سے دوچار ہونے لگتی اور ظہیر، ناصرہ کو بیوی بنا کر بھی بھابھی بول جاتا ہے۔ اسی اُدھیڑ بُن کی نفسیات کو افسانہ نگار نے بخوبی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ ''ظہیر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر پیچھے کھسک گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ دیکھو بھابھی میں سوچ نہیں پا رہا کہ کیا اچھا ہے؟ اور کیا برا؟ بس اتنا جانتا ہوں..... ن..... ا..... ص..... رہ..... ناصرہ اچھا وہ بھی نہ تھا۔ چونکہ عورت کی تکمیل مرد کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ سب کچھ تمھاری مرضی..... یا..... کچھ میری مرضی سے ہوا..... اچھا ہوا ہے کہ برا ہوا ہے..... میں نے..... اور..... تم نے سب

کچھ قبول کیا ہے۔''

احمد رشید کے یہاں جنس اور جنسی معاملات کے بیان کی آنچ انگیٹھی سی میٹھی میٹھی یا پھر تین اُبال کے بعد کھولتے دودھ کی طرح شانت۔ اِس افسانے کو پڑھ کر راجندر سنگھ بیدی کے 'ایک چادر میلی سی' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

تنویر احمد تمنا پوری کا افسانہ 'وائرس' کرپٹ الیکٹرل سسٹم کی معاون ای وی ایم مشین کی کرشمہ سازی کی پول کھولتا ہے۔ کہانی کی نبض اختتامیہ مکالمے میں دھڑکتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے: ''ہاہا۔ تمھارے فون پر ایک ضدّی وائرس کا حملہ ہوا تھا۔ مبارک ہو۔ سولنکی نے اُسے نکال دیا ہے اور پانچ سال کے لیے اینٹی وائرس ڈال دیا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر وہاں موبائل کی دکان یا ورک شاپ نہیں تھی۔'' مجھے حیرت تھی۔

''برو بر ہے۔ وہ موبائل کی دکان نہیں تھی......مگر وائرس کا کارخانہ تو تھا۔''

''مطلب......؟''

''وہ ایک سافٹ ویئر کمپنی اور ورکشاپ کے سلسلے کا کنٹری ہیڈ آفس ہے۔ وہاں ایلکٹرانک ووٹنگ مشینوں کی 'مرمّت' ہوتی ہے۔ اُس کا سافٹ ویئر بنتا ہے۔''

یہ ایک قابلِ مطالعہ افسانہ ہے۔

زویا حسن، آسیہ رئیس خاں، تاج الدین محمد اور نشاط پروین کے افسانے بھی پسند آئے لیکن تفصیلی گفتگو کی اور گنجائش نہیں۔

خاکہ نگاری کے تقاضے معشوقانہ ہیں۔ ذرا سی چوک کئی الزام کا سبب بن جاتی ہے۔ خاکہ نگار کے پاس ایک آئینہ ہوتا ہے، جسے وہ اِس زاویئے سے استعمال کرتا ہے، جس سے منتخب شخصیت کے اعمال و اطوار، افکار و نفسیات اور قابلِ ذکر کارناموں کے ساتھ اُن کی سیرت کے چیدہ مثبت و منفی پہلو منعکس ہوتے ہیں۔ یہ پیش کش سیلفی سا نہیں ہوتا۔

حضرت محمد ولی رحمانی، عالمِ دین، سجّادہ نشین، خانقاہ رحمانی مونگیر اور امیر شریعت بہار، جھاڑ کھنڈ اور اڑیسہ کے خاکے کو اقبال حسن آزاد نے اِس ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ موصوف کے قابلِ ذکر افکار، کارناموں اور اُن کی شخصی عظمتیں آفتاب کی طرح نصف النہار تک پہنچ جاتی ہیں۔ نیز موصوف سے اُن کی قربتِ خاص بھی منعکس ہوتی ہے۔ یہ ایک قابلِ مطالعہ عمدہ خاکہ ہے۔

خورشید اکرم کی نظم، عین تابش، ڈاکٹر ذکی طارق، اور فردوس گیاوی کی غزلیں شمارے کو معیار و اعتبار بخشتی ہیں۔

مکتوب کا حصّہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ شموئل احمد، مشتاق احمد نوری اور رینو بہل کے خطوط بطور خاص پسند آئے۔

'اداریہ' میں اعتراف کیا گیا ہے کہ 'ثالث' روزِ اوّل سے ہی پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتا آ رہا ہے۔ 'مضامین' کے تحت شامل مضامین اِس قول کی تصدیق کرتے ہیں۔ انتخاب میں حسنِ انتخاب کی جھلک نمایاں ہے۔

دیگر کالم کے تحت شامل چیزیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

المختصر یہ شمارہ اپنی شاندار روایات کا پاس دار ہے اور مدیران بطور خاص ڈاکٹر اقبال حسن آزاد داد و تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

◂● ▸

● سلیم انصاری

ثالث کا شمارہ نمبر۔ ۱۷ موصول ہوا، اس سے قبل ثالث نے عالمی خواتین نمبر شائع کر کے ایک نئی ادبی تاریخ رقم کی تھی، یہی نہیں ثالث نے اس سے قبل بھی کئی خصوصی یادگار نمبر شائع کیے ہیں جس کے لیے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد یقینی طور پر قابلِ مبارک باد ہیں۔ ثالث کے اداریے سے اس بات کا علم ہوا کہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد خود کرونا کا شکار ہو گئے تھے جس کے سبب ثالث کی اشاعت کچھ عرصہ کے لیے تعطل کا شکار رہی، رسائل و جرائد ہی کیوں کرونا جیسی مہاماری نے انسانی زندگی کے ہر شعبے پر جمود طاری کر دیا تھا۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ اب رسائل و جرائد کی اشاعت معمول پر آ رہی ہے۔

ثالث کے زیرِ نظر شمارے میں حسبِ معمول حمد و نعت، غزلیں، نظمیں۔ مضامین، یادِ رفتگاں اور افسانے، تاثرات اور خطوط وغیرہ سب شامل ہیں، اس کے علاوہ اقبال حسن خاں کے ناول کا ایک باب بھی اس شمارے کی زینت ہے۔ محمد شفیع الرحمٰن شفیع کی حمد کے بعد ان کی نعت میں محمد ﷺ سے عشق کی انتہا یہ ہے کہ اگر اسلام کو بس ایک جملے میں سمجھنا ہو، محمد سے وفاداری خدا کو سب سے پیاری ہے، اس کے بعد ارشد عبد الحمید کی تازہ کار اور منفرد اسلوب سے مزین چھ غزلیں شامل ہیں جس سے میرے نزدیک ثالث کے ادبی وقار میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ میرے نزدیک ارشد عبدالحمید عصری ادب کے منظر نامے کا ایک روشن ستارہ ہے، جس کے بغیر مابعد جدید شعری ادب پر کوئی بھی گفتگو نامکمل ہوگی۔ اس کے بعد عین تابش کی پانچ فکر انگیز غزلیں شامل ہیں جو زبان و بیان اور تخلیقی لہجے کی انفرادیت کے سبب متاثر کن ہیں، ان کی غزلوں میں ڈکشن

کے انوکھے پن اور تازہ ہوا کے جھونکے کا احساس ہوتا ہے۔غزلوں کے باب میں ڈاکٹر ذکی طارق،فردوس گیاوی اور خالد جمال کی ایک ایک غزلیں بھی زیرِ نظر شمارے کے حسن میں اضافے کا سبب ہیں۔نظموں کے باب میں خورشید اکرم،کامران غنی صبا،سید اقبال طالب اور مصداق اعظمی کی شمولیت باعثِ برکت ہے۔

مضامین کے باب میں سلمان عبد الصمد کا مضمون ''سوالات کے آئینے میں.....شعر شور انگیز'' اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ فاروقی کی تحریر پر کوئی سوال قائم کرنا یا اس سے عدم اتفاق کا اظہار کرنا بعض لوگوں کے نزدیک ادبی گناہ کے زمرے میں داخل ہے۔قابلِ مبارک باد ہیں سلمان عبد الصمد کہ انہوں نے بڑی جرأت مندی سے یہ لکھا کہ فاروقی اپنے مضمون میں آڈن اور والیری کو درمیان میں لائے بغیر بھی میر کی شاعری میں روزمرے کی بحث قائم کر سکتے تھے کیونکہ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق والیری کی تہذیب میں روزمرہ نام کی کوئی اصطلاح سرے سے موجود نہیں ہے۔اس طرح کے اور بھی کئی سارے اختلافات ہیں جنہیں سلمان عبد الصمد نے اپنے مضمون میں جواز و دلیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔تفضیل احمد نے اپنے مضمون ''مرحلہ دشت میں اک عہد کی تعمیر کا تھا'' میں منظر اعجاز کی شاعری کے مختلف گوشوں پر گفتگو کی ہے اور ان کی شاعری بقول تفضیل احمد موجِ تہِ آب اور تحریرِ بین السطور کی صورت منظر سے نہیں پس منظر سے ابھرتی ہے جسے دیکھنے کے لیے تھوڑا رکنا اور ٹھہرنا ضروری ہے حالانکہ پروفیسر وہاب اشرفی نے منظر اعجاز کی شاعری کو غیر واضح اور بے معنویت کا شکار قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر انور ایرج نے اپنے مضمون ''احتجاجی لہجے کا شاعر.....وہاب دانش'' میں ایک بہت معنی خیز بات کہی ہے کہ وہاب دانش اپنی شاعری میں رمز و علائم کا ایسا طلسم قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جسے آپ کسی منطقی توضیحات یا محض شعوری استدلال سے نہیں توڑ سکتے۔میں ڈاکٹر انور ایرج کی اس رائے سے متفق ہوں کیونکہ جن لوگوں نے بھی وہاب دانش کی نظموں کا بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے وہ میرے اس خیال سے ضرور متفق ہوں گے کہ وہاب دانش اپنی نظموں میں ایک ایسی طلسماتی فضا قائم کرتے ہیں جس سے یک لخت باہر نکلنا کسی بھی سنجیدہ قاری کے لیے ممکن نہیں۔ان کی نظموں میں زبان اور ڈکشن بالکل انوکھا،منفرد اور ان کی غزلوں کی زبان سے یکسر مختلف۔ایک اور بات ڈاکٹر انور ایرج نے لکھی کہ ان کی نظموں میں خدا سے مولویانہ تعلق نہیں بلکہ ایک دوستانہ اور والہانہ تعلق سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر خالدہ ناز نے اپنے مضمون میں قمر جہاں کے افسانے ''کٹی ہوئی شاخ'' کا عمدہ تجزیہ کیا ہے،ان کے مطابق یہ پوری کہانی واحد متکلم کے صیغے میں آگے بڑھتی ہے اور پوری کہانی میں اس کے مرکزی کردار یعنی ''میں'' کا نام ظاہر نہیں ہوتا مگر یہ کردار اپنے آپ سے سوال کرنے اور زندگی کے تلخ حقائق سے پردہ اٹھانے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے

۔زندگی کے مسائل و مصائب جن سے ہم دوچار ہیں،معاشرے کے ہر فرد کا المیہ ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ یہ کہانی کردار کے بغیر بڑی کامیابی سے آگے بڑھتی ہے۔محمد شارب نے اپنے مضمون اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کی اہمیت اور معنویت میں زبان و ادب کے مسائل کو موجودہ سیاسی نظام سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔جب کہ ڈاکٹر قسیم اختر نے ڈاکٹر صفدر امام قادری کی تصنیف خاکوں کا مجموعہ ''جانے پہچانے لوگ'' کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور بہت عمدگی سے کیا ہے۔وہ ''جانے پہچانے لوگ'' کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں کہ صفدر امام قادری کے خاکوں کی انفرادیت کے ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شخصیات کے مزاحیہ پہلوؤں کو ابھارنے میں توجہ مبذول نہیں کرتے حقائق کے بیان اور حقائق کے متعلقات سے عملی زندگی کے لئے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ مضامین کے باب میں ڈاکٹر شاذیہ کمال کا مضمون عبد الصمد کے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا تنقیدی مطالعہ سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے جب کہ سجاد رشید نے پروین شاکر کو نسوانی جذبات کی شاعرہ سے تعبیر کیا ہے،یہ بات سچ ہے کہ پروین شاکر نے اپنی شاعری میں نسوانی جذبات و احساسات کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ عورت کی نفسیات اور اس کی سماجی حیثیت کو بھی اپنی شاعری میں ایک توانا آواز بنا کر پیش کیا،یہی نہیں پروین شاکر نے گھر آنگن کے تصور کو بھی اپنی شاعری کا جز بنایا۔اس حوالے سے دیکھیں تو پروین شاکر کی شاعری میں آج کی عورت اپنے پورے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔

افسانوں کے باب میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں جن میں سب سے نمایاں اور اہم افسانہ شموئل احمد کا افسانہ ''قصاب کی محبوبہ'' ہے۔شموئل احمد کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ ان کے افسانوں یا ناول میں جنس کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے،یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے،مگر یہ بات پوری طور پر سچ نہیں۔قصاب کی محبوبہ کا مطالعہ کرنے کے بعد میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ شموئل احمد کے یہاں افسانے کو فکری اور معنوی ہر دو سطح پر مختلف دشاؤں میں منعکس کرنے کا فن موجود ہے،جو بہت کم افسانہ نگاروں کے پاس ہے۔اس افسانے میں انہوں نے جنس کے علاوہ،انسانی نفسیات اور عصری سیاست کی تلخ سچائی کو بھی اشارتاً ہی سہی نہایت کمالِ ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔جبار ایک قصائی ہے،جس کی سادھونی محبوبہ ہندو ہے،مگر دورانِ وصل جب وہ عالمِ بالا میں پہنچتی ہے تو اس کے اندر کا ہندو تو اجاگر جاتا ہے اور وہ اول فول بکنے لگتی ہے یہاں تک کہ جبار کی بہن اور دیگر رشتہ داروں کے بارے میں بھی نازیبا باتیں کرتی ہے۔یہی نہیں بوچڑ خانے بند ہونے کے بعد جبار جب پھولوں کا کاروبار کرنے لگتا ہے،اور اس کا کاروبار چل پڑتا ہے تو ایک نیتا نے اسے ریلی کے لیے کٹ آؤٹ اور گیٹ سجانے کا کام دیا،مگر اسے دام کے دام بھی نہیں دیتا ہے۔اور اس طرح جبار کو

خسارہ اٹھانا پڑتا ہے، یہاں کنایہ میں ہی سہی شموئل احمد نے موجودہ سیاسی لیڈران کی فطرت اور کردار کو اجاگر کر دیا ہے، اسی طرح سادھونی کا یہ بیان کہ اچھا ہوا تو نے پھولوں کا کاروبار شروع کر دیا، ورنہ وہ بھی کوئی دھندہ تھا.....نردوش پشوؤں کی ہتیا.....؟ یا پھر ارے کٹوا..... گاڑی کے نیچے پلہ آجائے، تو افسوس ہوتا ہے .....ارے کمینہ تجھے کپڑوں سے پہچانیں گے۔، یہ سارے بیانات کہانی کی ہیروئن سادھونی سے کہلوا کر افسانہ نگار نے ہندوستان کی موجودہ سیاست کا کریہہ اور رنفرت آمیز چہرہ دکھایا ہے۔اسرار گاندھی کا افسانہ ''ہڈیاں'' کسی حد تک ایک علامتی افسانہ ہے، جس میں ہڈی کو علامت بنا کر پرانی نسل سے نئی نسل کی بیزاری کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مگر اس کوشش میں کہانی کا بیانیہ متاثر ہوا ہے۔تنویر احمد تماپوری کے افسانے ''وائرس'' میں موبائل دراصل ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جبکہ اصل نشانہ ای وی ایم مشین ہے۔یہ افسانہ الکشن میں ہو رہی بدعنوانی کو اُجاگر کرتا ہے۔موبائل میں اگر کوئی وائرس آجائے تو اس کا علاج ممکن ہے لیکن اگر ای وی ایم مشین میں کسی وائرس کو داخل کر دیا جائے تو پھر نا قابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ عصری حسیت سے لبریز یہ ایک عمدہ افسانہ ہے۔زویا حسن کا افسانہ کھڑکی میں اُگا وجود ہمارے معاشرے میں عام گھریلو مسائل پر مبنی ہے جسے زویا حسن نے عمدگی سے بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی ثالث کے اس شمارے میں شامل افسانے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے حسنِ انتخاب کا نمونہ ہیں، لہٰذا قابل مطالعہ ہیں۔

اسی شمارے میں اقبال حسن خاں کے ناول راج سنگھ لاہوریا کا ایک باب بھی شامل ہے، جس میں ہندوستان کی آزادی اور اس کے بعد کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، اس موضوع پر اگرچہ پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اقبال حسن خاں کا یہ ناول دلچسپی سے پڑھے جانے کا مطالبہ کرتا ہے ۔ناول میں ان کے چست درست جملے اور اثر انگیز مکالمے معنی خیز ہیں اور مطالعے کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں.....مثال کے طور پر، پاکستان کے حصے میں چند ایک کو چھوڑ کر، بہت بڑی تعداد میں بیوروکریسی کے وہ اراکین آئے تھے جو متحدہ ہندوستان میں نالائقوں میں شمار ہوتے تھے۔یا پھر آج پاکستان میں بہت سے سیاسی رہنماؤں کو پیغمبروں کا درجہ دے دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رحمت اللہ علیہ صاحبانِ اقتدار بھی دخترِ زر کے عاشق تھے۔اس طرح کے اور بھی مکالمے اور واقعات اس ناول میں درج کیے گئے ہیں جو صداقت پر مبنی ہیں اور پاکستان کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اسی شمارے میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا ایک خاکہ بھی شامل ہے جو انہوں نے حضرت ولی رحمانی پر تحریر کیا ہے اور رحمانی فاؤنڈیشن کی دینی، ملی اور سماجی خدمات کا خصوصی ذکر کیا ہے، انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رحمانی فاؤنڈیشن نے حضرت ولی رحمانی کی تحریک پر SUPER 30 کی طرز پر رحمانی ۳۰ کلاسز کا

آغاز کیا جس میں غریب و نادار لیکن ہونہار طلباء کو نہ صرف IIT کی مفت کوچنگ کی جاتی ہے بلکہ ان کے قیام و طعام کا بھی انتظام کیا جاتا ہے، یہ رحمانی فاؤنڈیشن کی ایک ایسی خدمت ہے جو قوم و ملت کے حق میں وقت کی اشد ضرورت ہے۔

مجموعی طور پر ''ثالث'' آج ایسا ادبی رسالہ ہے جس نے ادب کی سمت و رفتار کے تعین میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

● ڈاکٹر احسان عالم

اقبال حسن آزاد کی ادارت میں نکلنے والا یہ رسالہ گذشتہ تمام رسالوں کی طرح معلوماتی اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔اداریہ تحریر کرنا ایک پیچیدہ فن ہے۔کیونکہ یہ کسی بھی رسائل کا مغز سمجھا جاتا ہے۔اقبال حسن آزاد کے تحریر کئے گئے اداریے کافی معنی خیز اور دلچسپ ہوا کرتے ہیں۔رسالہ ''ثالث'' کی غرض و غایت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ثالث'' روز اول سے ہی پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتا آرہا ہے اور اساتذہ کے شانہ بہ شانہ نوجوان قلم کی نگارشات بھی اس میں شامل ہوتی رہی ہیں۔اس شمارے میں بھی کئی ابھرتے ہوئے قلم کار شامل ہیں۔

رسالہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ اس رسالہ کی کئی خوبیاں ہیں۔سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ مدیر کے ذریعہ مواد کے انتخاب میں ہنرمندی بہت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ہر عمر کے لکھنے والے قلمکاروں کی شمولیت بھی اس رسالے کا انفرادی پہلو ہے۔

پیش نظر شمارہ کا آغاز محمد شفیع الرحمٰن شفیع کے حمد باری تعالیٰ اور اور نعت پاک سے ہوتا ہے۔اس کے بعد کئی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ارشد عبدالحمید، عین تابش، ڈاکٹر ذکی طارق، فردوس گیاوی اور خالد جمال نے رسالہ کو اپنی اپنی غزلوں سے خوبصورتی بخشی ہے۔خورشید اکرم، کامران غنی صبا، سید اقبال غالب اور مصداق اعظمی نے نظموں کے ذریعہ قارئین کو محظوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزلوں اور نظموں کے بعد مضامین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔سب سے پہلے نوجوان ادیب سلمان عبدالصمد کا ایک مضمون ''سوالات کے آئینے میں 'شعر شور انگیز'' ہے۔اس مضمون میں اردو زبان وادب کی ایک قد آور شخصیت جن کا انتقال چند ماہ قبل ہو چکا ہے میری مراد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ہے پر اپنا تاثر بیان کیا ہے۔''شعر شور انگیز'' شمس الرحمٰن فاروقی کے چند اہم کارناموں میں ایک ہے۔اس کارنامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے سلمان عبدالصمد لکھتے ہیں:

''شعر شور انگیز'' کے مطالعے کے دوران جہاں ایک حساس قاری ''اسلوب انتقادیات'' کی ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے وہیں اس کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ چوں کہ تشریح وتنقید کے بابمیں (دلائل کے ساتھ ساتھ) نکتہ رسی اور باریک بینی کی حیثیت بھی مسلم ہے۔ اس لیے راقم نے فاروقی صاحب کی نکتہ رسی پر غور کیا تو بہت کچھ سیکھا، سمجھا، بار بار پڑھا (پھر بھی بہت کچھ سمجھنے سے رہ گیا)۔ ان کے عالمانہ رویوں سے سیکھنے کے بعد راقم نے اس کتاب پر فکری نہ سہی، تاثراتی سوالات قائم کیے (ضروری نہیں کہ ان سوالوں کی کوئی علمی حیثیت بھی ہو، البتہ سوال آخر سوال ہوتا ہے)۔''

''مرحلہ دشت میں اک عہد کی تعمیر کا تھا.... ڈاکٹر منظر اعجاز'' کے عنوان سے تفضیل احمد کا مضمون اس شمارہ میں شامل ہے۔ اپنے مضمون میں منظر اعجاز کی غزلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں کہ منظر اعجاز کی غزلیں حقیقت ومجاز اور گمان اور یقین کے دو ساحلوں کے درمیان ہم آہنگی، توازن، مفاہمت اور اعتدال کی تلاش کی غزلیں ہیں۔ یہ غزلیں انسان دوستی کے جذبے سے مزین، تضادات میں سانس لیتی زندگی کی بے اعتدالیوں کی کشاکش، قدروں کی پاسپانی کا مرحلہ، آب وسراب کی دورنگیوں سے نبرد آزما ہیں۔ وہ ہر جگہ اپنے زندگہ اور موجود ہونے کا احساس دلاتے جاتے ہیں۔ البتہ قاری کو ہر بیانیے کے پیچھے ایک وسیع مخزونی کی فضا کا تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر انور ارج نے وہاب دانش کو اجتہادی لہجے کا شاعر کہتے ہوئے اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جدید شعراء کے اول صف میں وہاب دانش کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدید رجحان کے حوالے سے اجتہادی لہجے کے کئی اہم شاعر جن میں بانی ظفر اقبال، میرا جی، عادل منصوری، نشتر خانقاہی، محمود ایاز اور وہاب دانش وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں جو اپنے انفرادی لہجے کی وجہ سے اپنی ایک شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہاب دانش بھی اپنے اجتہادی لہجہ اور منفرد اسلوب کی وجہ سے دور سے ہی پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان کا لہجہ روایتی لہجے سے بالکل مختلف ہے۔

ڈاکٹر خالدہ ناز نے پروفیسر قمر جہاں کے کہانیوں میں شاہکار کا درجہ رکھنے والی کہانی ''کٹی ہوئی شاخ'' پر اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ کہانی ان کے افسانوی مجموعے ''اجنبی چہرے'' میں شامل ہے۔ اس کہانی پر روشنی ڈالتے ہوئے خالدہ ناز لکھتی ہیں کہ پوری کہانی واحد متکلم کے صیغے میں آگے بڑھتی ہے اور اس کہانی کا میں جس کا نام بھی ظاہر نہیں ہو پاتا اپنے آپ سے سوال کرتا ہوا زندگی کے بہت سے تلخ حقائق پر سے پردہ

اٹھانے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ پوری کہانی فلش بیک میں اپنے سفر طئے کرتی ہے اور پچھلے واقعاتی ٹی۔ وی۔ اسکرین کی طرح اس کے ذہن میں رقصاں ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا ذہن ڈھیروں سوالوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

محمد شارب نے اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب کی اہمیت ومعنویت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ایسی شیریں زبان ہے جس کی اہمیت ومعنویت میں کمی آنے والی نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کے استعمال، استعمال کرنے والوں کی فکر میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے اہمیت اور معنویت پر فرق نہیں پڑتا۔ اسے واضح کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں کہ بغیر ادب کے انسانی زندگی کا تصور بے معنی ہے۔ ادب انسان کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس کا تعلق اس کی اندرونی اور روحانی دنیا سے ہے۔ سائنس تو اس دنیا کو تسلیم کرنے سے رہی، مناظروں کی حد تک سمجھا بھی دیا جائے تو صدیوں کی صنعتی ترقی نے اس مذہب بیزار معاشرہ کو جنم دیا ہے اور اس میں جس قسم کی زندگی کو وقت کی ضرورت قرار دیا گیا ہے اس میں ادب جیسی چیزوں کے لیے بظاہر کوئی خاص جگہ نہیں۔ یہ صرف مسلمانوں ہی کا مسئلہ نہیں دیگر زبانوں کے ارباب فکر بھی اسی مسئلے سے دوچار ہیں۔ وہاں کی تہذیبی شناخت اور زبان پر خوفناک سایہ منڈلا رہا ہے۔

''مولانا آزاد کی سیاسی وانتظامی صلاحیتیں'' کے عنوان سے محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی نے ایک بہت ہی معیاری مضمون قلمبند کیا ہے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو اردو زبان وادب کا ہر شخص جانتا ہے۔ مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف جہتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں:

''مولانا کی زندگی کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ میں صد ہزار نیرنگیاں ہیں۔ مولانا جنگ آزادی کے ایک جانباز مجاہد، آزادی کی اور جمہوریت کے استحکام کے علم بردار، دردمند، دوراندیش، عظیم مفکر اور رہبر ملت کے ساتھ ساتھ جدید ہندوستان کے معمار، انسان دوست اور قوم پرست بھی تھے۔ مولانا نے جدید ہندوستان کی تعمیر وترقی کے لئے جو بیش بہا خدمات انجام دیئے ہیں اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ مولانا آزاد ایسے پہلے وزیر تعلیم تھے جن کے پاس گزشتہ لوگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے مثال قائم کی اور جدید ہندوستان کی تعمیر میں اپنے حسن بصیرت سے نئے نئے خاکے بنائے۔''

ڈاکٹر شاذیہ کمال نے ''عبدالصمد کے ناول جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناول ''جہاں تیرا ہے میرا'' ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ عام طور پر کوئی ناول ہو اس کی سرزمین

بڑی طویل ہوتی ہے اور جس ناول میں پیچیدگی اور طوالت جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ ناول اتنا ہی ہمہ گیر بن جاتا ہے۔ ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ ناول بہت سارے مسائل (جن کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں سے ہے) اور ان کے پیچیدہ حالات کا چشم دید گواہ ہے۔ پورا ناول ۵۵ مختصر وطویل اکائیوں میں منقسم ہے اور یوں لگتا ہے کہ اس کی ہر اکائی ایک مکمل کہانی ہے جس میں حقیقت کے مختلف رنگ شامل ہیں۔ ہر اکائی ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوعات، کردار نگاری اور انداز بیان کے اعتبار سے اہم ہے۔

''شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی مطالعہ'' نیر وسید کا تحریر کردہ مضمون ہے۔ شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں میں کردار نگاری کو آسمان کی بلندیوں تک نہیں بلکہ گوشت پوشت کے کرداروں کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ جنہیں انہوں نے سماج کے نچلے اور متوسط طبقے سے لیا ہے اور انہیں ریڈیو ڈرامے کی فن اور تکنیک کے مطابق ڈھالنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ آپ نے اکثر اپنے ڈراموں کے لئے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو اپنی انفرادی اور سماجی معنویت کے حامل ہو ہو۔

''نسوانی جذبات کی شاعرہ: پروین شاکر'' کے عنوان سے سجاد رشید نے اپنا مضمون تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے کہ پروین شاکر کی شاعری میں نسوانیت کی گونج بھرپور سنائی دیتی ہے اور اس میں ان کی آپ بیتی کا احساس بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں برصغیر کی ماں، بیٹی، بہن، بیوی غرض عورت کا ہر روپ نظر آتا ہے اور عورت کے ان سب رشتوں کے ذاتی جذبات اور خیالات کو انہوں نے نہایت ہی سلیقے اور ہنرمندی سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ خصوصاً ایک ازدواجی زندگی گزارنے والی عورت کی کیفیات کو انہوں نے جس طرح بیان کیا وہ اپنی نظر آپ ہے۔

ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب نے معروف شاعر راحت اندوری کو ایک احتجاجی شاعر کی شکل میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راحت اندوری ہزاروں کیا لاکھوں میں ایک تھے۔ جو اردو کی اصناف شاعری میں اپنے ہنر وفن سے انقلاب برپا کیا ان کے کہے ہوئے اشعار برف کے سلیوں کے نیچے دبے ہوئے شعلوں کے مانند ہیں جو دیکھنے میں بظاہر ٹھنڈ مگر تاثیر بالکل برعکس ہے۔ ان کی زبان بہت سادہ تھی اور اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی، ان کی آواز میں گرج پن تھا اور ان کا چہر بظاہر جوش وخروش اور جذبات سے خالی نظر آتا ہے لیکن ان کے اندرون میں دہکتی ہوئی آگ کی گرمی اور جذبات کا طلاطم خیز طوفان پوشیدہ تھا جو لفظ ان کے زبان سے نکلتا تھا وہ سننے والوں کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتر کر آگ لگا دیتا تھا۔

رسالہ ''ثالث'' کے مدیر اقبال حسن آزاد نے ایک معروف شخصیت حضرت محمد ولی رحمانی صاحب

پر خاکہ تحریر کیا ہے جو اس رسالہ میں شامل ہے۔ اس خاکہ سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''اس روز مجھے پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ حضرت شعر وادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور بلا شبہ آجکل کے اردو اساتذہ ان کے آگے طفل مکتب سے زیادہ نہیں۔ اس دوران نازک نازک پیالیوں میں نہایت خوشبودار اور لذیذ چائے آئی۔ ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں اور پھر جب رات کافی بھیگ چلی تو صحن کے چبوترے پر لمبا چوڑا دستر خوان بچھایا گیا اور انواع واقسام کے کھانے چنے گئے جن کی اشتہا خوشبوں نے ہمارے دل ودماغ معطر کر دیئے اور جب ہم سیر ہو گئے تو ہمیں خانقاہ کی جیپ میں بٹھا کر گھر تک پہنچا دیا گیا۔''

اس طرح اقبال حسن آزاد صاحب کا یہ پورا خاکہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اگر اس کا مطالعہ کریں تو آغاز کرنے کے بعد انجام تک ضرور پہنچائیں گے۔

رسالہ کے آخری میں شموئل احمد، اسرار گاندھی، احمد رشید علیگ، تنوری احمد تمنا پوری، زویا حسن، آسیہ رئیس خاں، تاج الدین محمد، نشاط پروین کے افسانے سماجی، سیاسی، معاشرتی حالات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔

''ثالث'' خواتین نمبر پر کئی قلمکاروں کے تبصرے ہیں۔ شموئل احمد، حسین الحق، مشتاق احمد نوری، نجمہ محمود، عین تابش، رینو بہل، وسیم احمد فدا، وسیم فرحت علیگ، فرحین جمال، ڈاکٹر ارشد رضا، عشرت ظہیر، بلال مختار، فوزیہ اختر، نصرت بخاری، صدف اقبال، شبانہ جاوید کے مکتوبات رسالہ کی معنویت میں چار چاند لگاتے ہیں۔

اس طرح ''ثالث'' یہ شمارہ بھی مطالعہ طلب ہے۔ دستاویزی حیثیت کا حامل یہ رسالہ اردو زبان وادب کے مختلف اصناف میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے جناب اقبال حسن آزاد، اور ثالث آفاقی صالح صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

◂◂ ● ▸▸

● وسیم احمد فدا

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد صاحب پابندی کے ساتھ 'ثالث' نکال رہے ہیں، یہ قابل تحسین ہے۔ گذشتہ شماروں کی طرح اس عام شمارے میں بھی ادب کے نئے پرانے ستارے انہوں نے یکجا کیے ہیں۔ تاہم نئے قلمکاروں کو بھی 'ثالث' امتیاز کے ساتھ شائع کرتا ہے، یہ خوش آئند امر ہے۔ حصہ نظم ہو یا نثر، زیر نظر شمارہ خوبصورت تخلیقات کا ایک مرقع ہے۔ ایک طرف جہاں محمد شفیع الرحمٰن شفیع صاحب کی حمد اور نعت وحدت وعقیدت کے جذبات سے قاری کو آشنا کرا رہی ہیں، وہیں ارشد عبدالحمید، عین تابش، ڈاکٹر ذکی

طارق، فردوس گیاوی اور خالد جمال جیسے خوش فکر شعراء کی غزلیں قارئین کے شعری ذوق کی تسکین کا خوب خوب سامان کر رہی ہیں۔

'ثالث' کے پچھلے شمارے میں شامل ہندی شاعرہ رشمی بھاردواج کی نظم ''شوہر کی محبوبہ کے نام'' (مترجم اسرار گاندھی) کے جوابی تاثر میں لکھی گئی قابل احترام خورشید اکرم صاحب کی نظم ''پریمی کی پتنی کو..... پریم گیت کھلنائیکہ کا'' ایک خوبصورت نظم ہے جو موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے تو عمدہ ہے ہی، زبان کی سطح پر بھی خورشید اکرم صاحب نے ہندی الفاظ کی وساطت سے نظم کی روح کے ساتھ خوب نباہ کیا ہے۔ اسی طرح کامران غنی صبا کی نظم ''ثالث'' ذات کے اندرون میں اُمنڈنے والے سوالوں کو خوبصورت لفظوں کے سہارے قاری کے سامنے لاتی ہے۔ سید اقبال طالب کی مناجاتی نظم ''رہائی'' پر بے اختیار زبان سے آمین نکلتا ہے۔ محترم مصداق اعظمی صاحب کی نظم ''عذاب'' ہمیں نئے سماج اور اس سماج کے اندرون بتدریج بڑھتی خوف و دہشت کی فضا کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور فکرمند ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ نظم بلاشبہ اپنے موضوع اور لفظیات کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔

گوشۂ مضامین میں سلمان عبدالصمد، تفضیل احمد، ڈاکٹر منور عالم، ڈاکٹر انور ایرج، ڈاکٹر ارشد اقبال، ڈاکٹر خالدہ ناز، محمد شارب، ڈاکٹر قسیم اختر، محمد شہاب الدین رحمانی، ڈاکٹر شاذیہ کمال، نیر وسید اور سجاد رشید جیسے اہل علم خواتین و حضرات اور ریسرچ اسکالرز نے اپنا حصہ ڈالا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی مشہور زمانہ کتاب ''شعر شور انگیز'' پر نوجوان افسانہ نویس، ناول نگار اور ریسرچ اسکالر سلمان عبدالصمد نے اپنے طویل مضمون میں بہت سے تاثراتی سوالات و تحفظات قائم کیے ہیں، موصوف کا یہ مضمون ''شعر شور انگیز..... سوالات کے آئینے میں'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ڈاکٹر شاذیہ کمال صاحبہ نے معروف فکشن رائٹر عبدالصمد کے ناول ''جہاں تیرا ہے یا میرا'' کا اہم اور بامعنی نکات کے ذریعے تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جو مذکورہ ناول کی پڑھت پر قاری کو مہمیز کرتا ہے۔

مدیر محترم اقبال حسن آزاد صاحب نے مولانا ولی رحمانی پر بہت عمدہ خاکہ تحریر کیا ہے۔

ان کے علاوہ شمارے میں شامل دیگر مضامین بھی اپنے موضوعات کے حوالے سے علمی اور تحقیقی اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانوں کے ذیل میں راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ ''کوارنٹین'' کا انتخاب برمحل اور حسب حال ہے۔

اردو فکشن میں اپنے قلم کی برجستگی، موضوعات کے تنوع اور جوان و بے باک نثر لکھنے کے لیے مشہور محترم شموئل احمد صاحب افسانوں کی اس محفل میں ''قصاب کی محبوبہ'' کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ شموئل

صاحب کی عمدہ کردار نگاری اور ان کا مخصوص رواں بیانیہ ہمیشہ کی طرح اس افسانے میں بھی پہلی سطر سے ہی قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ لیکن جس طرح کلائمکس میں قصاب نے چپکے سے اپنی دکان سمیٹی، ایسا لگا گویا شموئل صاحب نے بھی عجلت میں افسانے کو سمیٹ لیا۔ قاری سوچ رہا ہوتا ہے کہ اب قصاب اپنی محبوبہ کا کچھ ''انتظام'' کرے گا مگر شموئل صاحب نے حیران کن طریقے سے افسانے کو اس طرح ختم کیا کہ ایک تشنگی سی رہ گئی۔ معروف افسانہ نگار اسرار گاندھی صاحب کا افسانہ ''ہڈیاں'' اپنے ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بہت خوبصورت اور عمدہ افسانہ ہے۔ خود لذتی جیسے ایک عامیانہ موضوع کو فاضل مصنف نے اس خوبصورتی، سلیقگی اور ہنرمندی سے ملفوف کیا ہے کہ افسانہ محض ایک سوقیانہ تحریر بننے سے محفوظ رہا۔ زویا حسن کا ''کھڑکی میں اُگا وجود'' متاثر کرتا ہے۔ فردا پنی داخلیت کے اندر ایک الگ ہی دنیا میں خود کو جیتا ہے۔ یہ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے..... صرف اس کی دنیا۔ افسانے کے کلائمکس میں زویا حسن نے حیران کیا ہے۔ تنویر احمد تماپوری کا افسانہ ''وائرس'' ایک عام سی بُنت کے باوجود اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں کے سہارے ایک اچھی نثر کا تاثر دیتا ہے۔ افسانے کا اختتام خوب ہے۔ تنویر احمد تماپوری کے یہاں نئی کہانی کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ احمد رشید علیگ کا افسانہ ''سفید لباس سیاہ راتیں'' اور آسیہ رئیس خان صاحبہ کا افسانہ ''رفاقت'' انسانی رشتوں کو الگ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ محترمہ نشاط پروین صاحبہ نے لاک ڈاؤن کے زیر اثر ماحول پر حاوی ہونے والے سناٹے اور گلی محلوں میں پسری خاموش ویرانی کو اپنی کہانی ''شور'' کے ذریعے بیان کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اسی طرح تاج الدین محمد کا افسانہ ''سو روپے کا نوٹ'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی حسب روایت سنجیدہ قاری کی تمام ادبی ضیافت کا مکمل سامان کیے ہوئے ہے۔ اس شمارے میں شامل تمام اہل قلم خواتین و حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور محترم اقبال حسن آزاد صاحب کا شکریہ بجا لاتا ہوں کہ ہر مرتبہ ثالث کی صورت میں ایک خوبصورت ادبی تحفے سے نوازتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

● ڈاکٹر شاذیہ کمال

مدیر اقبال حسن آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ''ثالث'' یو جی سی, نئی دہلی سے منظور شدہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف بہار اور ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کے قلم کار و قارئین برصغیر کی سرحدوں سے باہر دنیا کے ان تمام ممالک میں مل جاتے ہیں جہاں جہاں اردو کے شیدائی اور چاہنے والے موجود ہیں۔

اس کا شمارہ نمبر, 17 جنوری تا مارچ 2021 پیش نظر ہے۔ رسالہ کی قواعد کے مطابق شمارے کا

آغاز مدیر اقبال حسن آزاد کے اداریے سے ہوتا ہے۔ اداریے میں موصوف نے گزشتہ سال کہرام مچانے والی عالمی وبا کورونا سے سماج اور ادب پر پڑنے والے اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس وبا نے نہ جانے کتنے لوگوں اور عزیزوں کو ہم سے چھین لیا۔ اس کی زد میں کچھ ایسی بھی ہستیاں آئیں جن کے بغیر اردو یتیم ہوگئی۔ ان میں سے شمس الرحمٰن فاروقی کی کمی اردو ادب میں تادیر محسوس کی جائے گی۔

اداریہ لکھنا بڑا اہم کام ہوتا ہے۔ مدیر کی نظر نہ صرف شمارے کے مواد پر ہوتی ہے بلکہ وہ تمام سماجی، سیاسی، اخلاقی محرکات زیر نگاہ ہوتے ہیں جن کے گرد و پیش میں شمارہ تخلیق پاتا ہے۔ موصوف نے کورونا کے دور کے سماجی و سیاسی حالات اور اس دوران حکومت اور میڈیا کی اخلاقی پستیوں کی مذمت بھی کی ہے۔

کورونا کے اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مدیر اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں۔

''ملک عزیز میں تو صورت حال اور بھی خراب ہوگئی۔ سڑکوں اور ریل کی پٹریوں پر مزدور مرنے لگے۔ اس برے دور میں سب سے خراب رول ہمارے بعض سیاسی رہنماؤں اور کئی ایک پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کا رہا۔ انھوں نے عوام کو گمراہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ اس سے ایک طرف تو وبا تیزی سے پھیلی اور دوسری طرف ملک کی ہم آہنگی اور بھائی چارے کو بھی زبردست خطرہ لاحق ہوگیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اہل وطن نے جوش سے زیادہ ہوش سے کام لیا اور اس طرح حالات حد سے زیادہ بگڑنے نہیں پائے۔''

موصوف کورونا کے مثبت پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ کورونا سے جہاں بہت سارے انسان لقمہ اجل بن گئے وہیں یہ کرۂ ارض کی فضا میں موجود آلودگی کو کم کرنے کا بھی سبب بنا۔ اس دوران شعر و ادب کے تعلق سے بھی اچھا خاصا کام ہوا۔

مدیر کے اداریے کے بعد محمد شفیع الرحمٰن شفیع کی حمد اور نعت سے شمارے میں روحانی فضا قائم ہوتی ہے۔

جس کی زباں پہ حمد ہو وہ خوش نصیب ہے (حمد)
خدا نے ذکر احمد کو عجب رفعت عطا کی ہے
شب معراج اپنے عرش پر محفل سجادی ہے (نعت)

اس کے بعد ارشد عبدالحمید، عین تابش، ڈاکٹر ذکی طارق، فردوس گیاوی اور خالد جمال کی غزلیں قارئین کو محظوظ ہونے کے مواقع فراہم کر رہی ہیں۔ حصۂ نظم میں خورشید اکرم، کامران غنی صبا، سید اقبال طالب، اور مصداق اعظمی کی نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں موضوعاتی اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں۔

مضامین کی فہرست میں سلمان عبدالصمد، تفضیل احمد، ڈاکٹر منور عالم، ڈاکٹر انور ایرج، ڈاکٹر ارشد اقبال، ڈاکٹر خالدہ ناز، محمد شارب، ڈاکٹر قسیم اختر، محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، ڈاکٹر شاذیہ کمال، نیر وسید اور سجاد ظہیر کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شمارے کی ادبی معنویت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ سلمان عبدالصمد کا مضمون ''سوالات کے آئینے میں.....شعر شور انگیز'' میرؔ کی شاعری سے متعلق ممتاز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی کتاب ''شعر شور انگیز'' پر ایک انتقادی مضمون ہے۔ اس مضمون میں ایک جگہ سلمان عبدالصمد لکھتے ہیں۔

''شعر شور انگیز'' کے مطالعے کے دوران جہاں ایک حساس قاری ''اسلوب انتقادیات'' کی ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے وہیں اس کے ذہن میں چند سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ تشریح و تنقید کے باب میں (دلائل کے ساتھ ساتھ) نکتہ رسی اور باریک بینی کی حیثیت بھی مسلم ہے اس لیے راقم نے فاروقی صاحب کی نکتہ رسی پر غور کیا تو بہت کچھ سیکھا، سمجھا، بار بار پڑھا (پھر بھی بہت کچھ سیکھنے سے رہ گیا)۔ ان کے عالمانہ رویوں سے سیکھنے کے بعد راقم نے اس کتاب پر فکری نہ سہی تاثراتی سوالات قائم کیے (ضروری نہیں کہ ان سوالوں کی کوئی عملی حقیقت بھی ہو، البتہ سوال آخر سوال ہوتا ہے)۔

ہم عصر اردو ادب کے ممتاز ادیب و ناقد اور شاعر تفضیل احمد کا مضمون ''مرحلہ دشت میں ایک عہد کی تعمیر کا تھا.....ڈاکٹر منظر اعجاز'' کسی ادبی شخصیت کی شناخت کے سلسلے سے ایک اہم مضمون ہے۔ اس مضمون میں تفضیل احمد نے اپنے تنقیدی شعور سے ڈاکٹر منظر اعجاز کی شاعری کی ادبی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''منظر اعجاز کی غزلیں حقیقت و مجاز اور گمان اور یقین کے دو ساحلوں کے درمیان ہم آہنگی، توازن، مفاہمت اور اعتدال کی تلاش کی غزلیں ہیں۔ یہ غزلیں انسان دوستی کے جذبے سے مزین، تضادات میں سانس لیتی زندگی کی بے اعتدالیوں کی کشاکش، قدروں کی پاسپانی کا مرحلہ، آب و سراب کی دورنگیوں سے نبرد آزما ہیں۔ وہ ہر جگہ اپنے زندہ اور موجود ہونے کا احساس دلاتے جاتے ہیں۔ البتہ قاری کو ہر بیانیہ کے پیچھے ایک وسیع محزونی کی فضا کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منور عالم کا مضمون ''ہندی فلموں میں اردو کی خوشبو'' میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ ہندی فیچر فلم کہی جانے والی فلموں کا وجود اردو کے بغیر ادھورا ہے۔ ڈاکٹر انور ایرج نے شاعر وہاب دانش کی شاعری پر مضمون ''اجتہادی لہجے کا شاعر..... وہاب دانش'' تحریر کیا ہے۔ وہاب دانش کی شعری خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر انور ایرج لکھتے ہیں۔

''وہاب دانش رمز و علائم کا ایک ایسا طلسم اپنی شاعری میں قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جسے آپ کسی منطقی توضیحات یا محض شعوری استدلال سے نہیں توڑ سکتے۔ دانش کی شعری کائنات میں صرف تجربات و مشاہدات یا افکار و خیالات کے ساتھ داخل ہونا کافی نہیں بلکہ ایک وجدانی و الہامی کیف و سرور کا

ہونا بھی ضروری ہے تبھی آپ اس وسیع رموز سے واقف ہوسکیں گے۔''

ڈاکٹر ارشد اقبال نے اپنے مقالہ ''اسرار گاندھی کا تخلیقی ارتقاع'' میں اسرار گاندھی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر خالدہ ناز نے مشہور افسانہ نگار قمر جہاں کی کہانی ''کٹی ہوئی شاخ'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔محمد شارب کا مضمون ''اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب کی اہمیت اور معنویت'' اردو ادب کے حوالے سے عمدہ مضمون ہے۔ڈاکٹر قسیم اختر کا مضمون ''جانے پہچانے لوگ، کا تنقیدی چہرہ'' قابل مطالعہ ہے۔ یہ مضمون مشہور ادیب اور ناقد صفدر امام قادری کے خاکوں کا مجموعہ ''جانے پہچانے لوگ'' کا تاثراتی جائزہ ہے۔محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی کا مضمون ''مولانا آزاد کی سیاسی وانتظامی صلاحیتیں'' مولانا آزاد کی سیاسی زندگی اور ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں سے ہمیں آشنا کراتا ہے۔میرا مقالہ ''عبدالصمد کے ناول' جہاں تیرا ہے یا میرا' کا تنقیدی جائزہ'' بھی توجہ کا طالب ہے۔ یہ ناول ہندوستانی مسلمانوں کی محرومیوں اور ان کی پستیوں پر نوحہ زن ہے اور خدا سے استفہام کررہا ہے۔نیر وسید کا مضمون ''شمیم حنفی کے ڈراموں کا فنی مطالعہ'' بھی اہم ہے-اس مضمون میں نیر وسید نے شمیم حنفی کے ڈراموں کے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے-شمیم حنفی کے ڈراموں سے متعلق اپنی آرا کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں-

''آپ جہاں نئی اور پرانی نسل کے درمیان فکر ونظر کے تصادم وتضاد کو پیش کرتے ہیں وہیں قدیم وجدید افکار واقدار اور عصر حاضر کے رسم ورواج کی معنویت پر سوالیہ نشان بھی قائم کرتے ہیں۔''

مقالہ ''نسوانی جذبات کی شاعرہ..... پروین شاکر'' میں مقالہ نگار سجاد رشید نے پروین شاکر کی شاعری کا موضوعاتی جائزہ پیش کیا ہے۔اس سلسلے سے وہ رقمطراز ہیں۔

''غزل میں پروین شاکر کی انفرادیت کا سبب ان کی موضوعاتی جدت ہے۔انھوں نے نسوانی جذبات واحساسات کو حقیقی انداز میں غزل میں پیش کیا۔ان کے ہاں چاہت، رفاقت، ملاقات، جدائی، فراق، جذبے اور احساسات نئے انداز اور جدید دور کے تناظر میں محرک ملتے ہیں۔''

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

بعد مضامین ''یادرفتگاں'' کے صیغے میں شاعر راحت اندوری کو جگہ دی گئی ہے۔مضمون "راحت اندوری.....ایک احتجاجی شاعر'' میں ڈاکٹر محمد یٰسین نے شاعر کی حیات اور شاعری سے مختصراً بحث کی ہے۔

ہم عصر اردو شاعری میں راحت اندوری اپنے منفرد لب ولہجے, انداز اور آواز سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی شاعری حق گوئی اور بے باکی کی عمدہ مثال ہے۔انصاف اور حقوق کی بازیافت سے متعلق اشعار

ان کے یہاں کثرت سے ملتے ہیں۔

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

راحت اندوری کی شاعری سے متاثر ہوکر ڈاکٹر محمد یٰسین لکھتے ہیں۔

''راحت اندوری نے اردو شاعری کو ایک نئے آیام سے جوڑنے کی کامیاب سعی کی ہے- جسے محبوب کی زلفوں کے پیچ وخم سے باہر نکال کر عوام کے دکھ درد سے جوڑ دیا۔ جہاں مظلوموں کی کراہ اور سسکیوں کا حساب برابر کرنے کی بات کہی جانے لگی۔''

اس شمارے میں حضر محمد ولی رحمانی.....دامت برکاتہم پر مدیر اقبال حسن آزاد کا ایک خاکہ بھی ہے جسے انھوں نے مولانا کی شخصیت اور ان کی سیرت سے متاثر ہوکر تحریر کیا ہے۔ یہ خاکہ بہ یک وقت مولانا کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی عکاسی کررہا ہے۔

شمارے کے آخر میں شموئل احمد، اسرار گاندھی، احمد رشید علیگ، تنویر احمد تماپوری، زویا حسن، آسیہ رئیس خاں، تاج الدین محمد اور نشاط پروین کے افسانے ہیں۔ یہ تمام افسانے ہمارے معاشرتی، سماجی اور اخلاقی حالات کو بیان کرتے ہیں۔شمارے میں اقبال حسن خاں کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا ایک باب بھی قابل توجہ ہے-

اس کے بعد ''ثالث'' شمارہ نمبر 15,16 (عالمی خواتین نمبر 2020) پر سلیم انصاری، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر شاہد جمیل، پروفیسر محمد ظفر الدین، سلمان عبدالصمد، ڈاکٹر شاذیہ کمال اور ہاشمی فاطمہ کے تبصرے درج ہیں۔شموئل احمد، حسین الحق، مشتاق احمد نوری، نجمہ محمود، عین تابش، رینو بہل، وسیم احمد فدا، وسیم فرحت علیگ، فرحین جمال، ڈاکٹر ارشد رضا، عشرت ظہیر، بلال مختار، فوزیہ اختر رد، نصرت بخاری، صدف اقبال اور شبانہ جاوید کے مکتوبات شمارے کی قدر وقیمت میں مزید اضافے کا باعث ہیں۔

اس طرح یہ شمارہ ثالث کے گزشتہ شماروں کی طرح ہی معلوماتی اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔اس شمارے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کے قریب سبھی موضوعات ہم عصر اردو فنکاروں اور ادبا سے وابستہ ہیں۔ یقیناً یہ شمارہ ہم عصر اردو ادب کو سمجھنے کی سمت میں معاون ثابت ہوگا۔

◂◂ ● ▸▸

تبصرے

کتاب: دھواں (ناول)

مصنف: شاکر انور

سن اشاعت ۲۰۱۹

تبصرہ نگار: مریم صدیقی

انسانی نفسیات اور اس سے جڑے مسائل اور بیماریوں کو ضبط تحریر میں لانا قدرے مشکل امر ہے۔ خاص کر بات جب کسی ناول کے کرداروں کی آئے تو اکثر ناول نگار اس سے انصاف نہیں کر پاتے۔ ناول کا کینوس یوں بھی وسیع ہوتا ہے اگر ایسے میں درمیان میں دلچسپی کم ہو جائے یا ناول کا پلاٹ ناول نگار کے ہاتھ سے چھوٹ جائے تو قاری بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اکثر مصنفین جو نفسیاتی بیماریوں پر لکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ نفسیاتی بیماریوں کی پیچیدگیاں، ان کی علامات، علاج اور ان کے اردگرد رہنے والوں کے رویے عمومی طور پر مناسب انداز میں نہیں لکھ پاتے۔ اسی لیے ایسے ناول اکثر خشک اور سنجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور قارئین کو متاثر کرنے میں کسی حد تک کامیاب نہیں ہو پاتے۔

زیر نظر ناول ''دھواں'' کی کہانی بھی ایسی ہی ایک نفسیاتی بیماری یعنی شیزوفینیا کے گرد گھومتی ہے۔ اس ناول کے مصنف محترم شاکر انور صاحب ہیں اور یہ شاکر انور کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کا افسانوں کا مجموعہ ''خواب، خوش بو اور خواہشیں'' شائع ہو چکا ہے اور دیگر کتب جن میں ناولز اور افسانوں کا مجموعہ ستمبر کا سمندر زیر تکمیل و اشاعت ہیں۔ شاکر انور صاحب نے 1982 میں اپنا پہلا افسانہ لکھا اور پھر لکھنے کا یہ سفر تا حال جاری ہے۔ آپ کے افسانوں نے پاک و ہند کے کئی ادبی جرائد میں اپنی جگہ بنائی۔

بات کریں اس ناول اور اس کے کرداروں کی تو یہ کہانی تیمور اور ساشا ہے۔ چونتیس ابواب پر مشتمل یہ ناول تیمور اور ساشا کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ جس طرح ان دونوں پر قیامت ٹوٹی اور انہیں بے آبرو کیا گیا ایسے حالات کسی بھی انسان کو ذہنی طور پر گہرا دھچکا پہنچانے کا سبب بن سکتے ہیں اور ایسا ہی تیمور کے ساتھ ہوا لیکن یہ دکھ کی کیفیت یہ اذیت تیمور نے تنہا نہیں جھیلی بلکہ ساشا نے بھی ہر اس اذیت کو محسوس کیا لیکن اختتام پر مصنف نے دنیاوی تلخ حقائق کو پس پشت ڈال کر کہانی کو ایک خوب صورت موڑ دے دیا اور تیمور و ساشا کی زندگی میں بہار نو کی نوید سنائی۔ کہانی کے دیگر کرداروں کو بھی بخوبی لکھا گیا ہے۔ کہانی میں ہر

ایک کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا گیا ہے۔

کہانی کے اہم اور دلچسپ پہلو چابک دستی سے بنا گیا پلاٹ، عمدہ منظر نگاری، برجستہ و فطری مکالمہ نگاری ہے۔ قدرتی مناظر کو شاکر صاحب نے جس خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو قدرتی مناظر سے خصوصی رغبت ہے۔ ناول میں جا بجا تفصیلی منظر نگاری ہے جو کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتی۔

طباعت کی بات کریں تو 176 صفحات پر مشتمل یہ کتاب عمدہ معیار کی ہے۔ بہترین کوالٹی کا کاغذ اور ڈبل فلپ کور کے ساتھ کتاب کی قیمت فقط 350 روپے ہے۔ اسے الحمد پبلیکیشنز نے شائع کیا ہے۔ یہ ناول قاری کو اول تا آخر جکڑے رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مختصر ابواب پر مشتمل کتاب ذوق مطالعہ رکھنے والا شخص چند ایک نشست میں مکمل پڑھ سکتا ہے۔ محترم شاکر انور صاحب کو منفرد موضوع کے ساتھ انصاف کرنے پر مبارکباد پیش کرتی ہوں اسی کے ساتھ ان کی آنے والی کتاب ''ستمبر کا سمندر'' (افسانوی مجموعہ) اور ان کے ادبی سفر کے لیے نیک خواہشات۔

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب: جانے پہچانے لوگ (خاکے اور شخصی تاثرات)

صنف: خاکہ

مصنف: صفدر امام قادری

مرتبہ: ڈاکٹر عابدہ پروین نیلوفر یاسمین

صفحات: 288

قیمت: 350 روپے

زیر اہتمام: مکتبۂ صدف، ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی

مبصر: اقبال حسن آزاد

خاکہ کے لغوی معنی ڈھانچہ بنانا یا مسودہ تیار کرنا ہیں۔ جبکہ ادبی نقطہ نظر سے خاکہ شخصیت کی ہو بہو عکاسی کا نام ہے، اس خاکہ نگاری میں نہ صرف شخصیت کی ظاہری تصویر کشی کی جاتی ہے بلکہ باطن کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی شخص کے حقیقی خدوخال قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں ایک جیتی جاگتی حقیقی شخصیت کی دلکش اور دلچسپ پیرائے میں تصویر کشی کی جاتی ہے۔ خاکہ نگار واقعات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات و قیاسات کو بھی شامل کرتا ہے۔

ایک کامیاب خاکہ نگار کی نگاہ اس مقام کو پالیتی ہے جس مقام تک عام خاکہ نویسوں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ نثار احمد فاروقی کا کہنا ہے کہ:

''خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔''

اور بقول رشید احمد صدیقی:

''خاکہ نگاری کی بڑی اور اولین شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنادے بڑے کو کتنا بھی بڑا دکھانا آسان ہوگا بہ نسبت اس کے کہ چھوٹے کو بڑا دکھایا جائے فن اور فن کار کی یہ معراج ہوگی۔''

صفدر امام قادری ایک مجلسی آدمی ہیں۔ وہ تعلقات بنانے، بڑھانے اور نبھانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں لوگوں کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے پر قدرت حاصل ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو مردم شناس کہا جاتا ہے۔

صفدر امام قادری افسانہ نگار بھی ہیں، شاعر بھی اور صحافی بھی لیکن مجھے ان کی جو بات سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے وہ ان کی زبان و بیان پر غیر معمولی گرفت ہے۔ ایسی زبان دانی فی زمانہ خال خال ہی ملتی ہے۔

''جانے پہچانے لوگ'' صفدر امام قادری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ ایک ایسے دور میں جب پوری دنیا کورونا کے خوف سے ڈری سہمی ہوئی ہے کچھ لوگ زبان و قلم کی آبیاری میں مشغول ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ''جانے پہچانے لوگ'' میں پندرہ مرحومین کے شخصی خاکے اور تاثرات شامل ہیں۔ (۱) اشرف قادری (مصنف کے والد محترم) (۲) وہاب اشرفی (۳) شفیع جاوید (۴) ناز قادری (۵) مجتبیٰ حسین (۶) اسرار جامعی (۷) سید ہاشم رضا (مصنف کے استاد) (۸) راحت حسین بزمی (۹) حبیب تنویر (۱۰) محمد مختار وفا (۱۱) مرزا کھونچ (۱۲) شین مظفر پوری (۱۳) مختار الدین احمد (۱۴) منظر سلطان (۱۵) میری ماں (مصنف کی والدہ)

مرحومین کے ان زندہ خاکوں کے علاوہ ''تعارف'' کے طور پر پروفیسر انیس الرحمان، پروفیسر غضنفر، جاوید دانش، ڈاکٹر جمال اویسی، سلمان عبدالصمد اور ڈاکٹر کلیم الرحمان کا کوی کی تحریریں شامل کتاب ہیں۔ علاوہ ازیں مصنف کا ''بیانِ واقعی'' اور مرتبین ڈاکٹر عابدہ پروین اور محترمہ نیلوفر پروین کے خیالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر کمالی اور واحد نظیر کی منظومات نے کتاب کے حسن و وقار میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

اپنے والد، والدہ، پروفیسر ناز قادری اور استاد کے خاکوں میں جہاں عزت و احترام کے جذبے جھلکتے ہیں وہیں محبت اور عقیدت کی لہریں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ وہاب اشرفی اور شفیع جاوید سے ان کی قربت کچھ زیادہ ہی تھی لہٰذا ان کے جیتے جاگتے اور متحرک نظر آتے ہیں۔ مجھے وہاب اشرفی صاحب پر لکھا

گیا خاکہ سب سے زیادہ پسند آیا شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاب صاحب سے میری بھی کئی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ایک دفعہ میں ڈاکٹر منظر اعجاز کے ساتھ وہاب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دورانِ گفتگو کسی ادبی پروجیکٹ کا تذکرہ آیا۔ وہاب صاحب نے کہا، ''یہ کام صرف صفدر ہی کرسکتے ہیں۔''

ان خاکوں میں ایک جانب اگر مرحومین کے زندہ مرقعے ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں تو دوسری جانب مصنف کی شخصیت کے بھی کئی پہلو وا ہوجاتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' تو صفدر امام قادری نے شروع سے ہی اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروانا شروع کردیا تھا۔ صفدر امام قادری ایک نہ تھکنے والی شخصیت کا نام ہے۔ اب تک ان کی اردو، ہندی اور انگریزی میں لگ بھگ تیس تصنیفات منصۂ شہود پر آرداد و تحسین حاصل کرچکی ہیں جبکہ کئی کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ یہ وہ نابغۂ روزگار ہیں جنہیں دیکھنے، سننے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ ان کا یہ ادبی سفر تادیر جاری رہے گا اور تشنگانِ ادب ان کی تحریروں سے اپنی علمی اور ادبی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ
نیک خواہشات کے ساتھ

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب	:	عہد ساز شخصیت: سرسید احمد خاں
مرتب	:	پروفیسر شہزاد انجم
مبصر	:	اقبال حسین
صنف	:	تحقیق (انتخاب مضامین)
صفحات	:	784
قیمت	:	448 روپئے
طبع اول	:	نومبر، 2019
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

پندرہویں صدی میں نشاۃ ثانیہ نے یورپ میں صنعت و حرفت، فلسفہ و الٰہیات، سیاسیات و سماجیات، سائنس اور ٹکنالوجی، آئین اور قانون کے میدان میں ایسا عظیم انقلاب برپا کیا کہ معاصر اسلامی دنیا جواب تو کیا دیتی اسے سمجھنے سے بھی قاصر تھی۔ اٹھارہویں صدی سے پسپائی شروع ہوئی اور انیسویں صدی

کے آخری عشرے تک پورا اسلامی ایشیا اور افریقہ مغربی استعمار کے سمندر میں غرق آب تھا۔ اس مسئلے کے علاج کی غرض سے کئی احیائی تحریکوں نے جنم لیا جن کے نزدیک سارا مسئلہ قرون اولیٰ کے اسلام سے انحراف کا نتیجہ تھا اور تاریخ کے پہیے کو الٹی سمت میں موڑنا علاج تجویز کی گئی۔ واپسی تاریخ کی روایت کے شایان شان نہیں ہے۔ احیاء پسندوں کے پاس نیا کچھ بھی نہیں تھا، حقیقی منزل قدیم اخلاقی روح کے برخلاف قدیم روایت کا احیاء تھی۔ ایسے میں گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر بھنور ہے تقدیر کا بہانہ۔ مغربی استعماریت اور استحصالیت میں پستی امت مسلمہ کی نجات دہندہ بھیجنے کی دعاؤں کے بارآور ہونے کا وقت آیا تو 17 اکتوبر 1817 میں ایک اعلیٰ ترین ذہین شخصیت نے جنم لیا جسے تاریخ سید احمد خاں کے نام سے جانتی ہے۔

انگریزوں نے 1857 کی جنگ آزادی کے ناکام ہوتے ہی صہبائی اور مولوی باقر جیسے با حوصلہ مسلم علماء و دانشوران کی کثیر تعداد کو انتقاماً قتل کروادیا تھا، بہتوں کو قید و بند میں ڈال دیا تھا اور بہتوں کو تو ملک بدر بھی کردیا تھا۔ غالب جیسا دانشور شاعر گوشہ نشیں ہوکر 'دستنبو' تحریر کرنے لگا تھا۔ سرسید نے اس پرآشوب دور میں انگریزوں سے ٹکر لینے کی بجائے مصالحت میں ہی قوم کی بھلائی سمجھا اور رسالہ 'اسباب بغاوت ہند' تحریر کرنے کی ہمت کرکے مسلمانوں کے تئیں پہلی بار انگریزوں کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے پر مائل کیا۔ دریں اثناء اسی مرد درویش نے ہندوستانی مسلمانوں کو پسپائی کے صدمے سے نکلنے کے لئے ایک حاذق حکیم کی طرح جدید تعلیم کے کڑوے گھونٹ کو نگلنے کی تحریک بھی دلایا یہ نسخہ آگے چل کر ان کے لئے سودمند اور بارآور ثابت ہوا۔

جدید تعلیم کے محرک اور جدید نثر کے موجد کی حیات اور کارناموں سے متعلق اب تک بیسیوں زبانوں میں ہزارہا کتب اور مضامین صفحۂ قرطاس کی زینت بن چکے ہیں۔ حالی، شبلی اور سید عبداللہ سے لیکر ڈیوڈ لیلی ویلڈ، مشیر الحسن اور راما چندرا گوہا جیسے معروف دانشوران اور مؤرخین نے اس شخصیت کے ذکر خیر سے اپنے قلم کی تخلیقی صلاحیت کو جلا بخشا ہے۔ 2017 میں سید احمد خاں کی ولادت کی دوسری صد سالہ سال گرہ کے موقع سے دنیا بھر میں سیکڑوں مضامین اور کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے معروف محقق و ناقد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم نے 'عہد ساز شخصیت: سرسید احمد خاں' نامی کتاب کی ترتیب و تزئین کے کام کو مکمل کیا ہے۔ 784 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب نومبر 2019 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں سید احمد خاں کی ہمہ جہت شخصیت کے مدنظر 50 نثری مضامین کو سات عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ اور 18 منظوم تخلیقات کو ایک علیحدہ باب میں جگہ دی گئی ہے۔ مضامین و منظومات

کی ترتیب میں منطقی معروضیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ مضامین کے انتخاب میں قدیم و جدید دانشوران کے علمی سرمائے سے خوشا چینی کی گئی ہے۔ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، اسماعیل پانی پتی، جواہر لعل نہرو، سید عبداللہ، غلام رسول مہر، خلیق انجم، احتشام حسین، محمد مجیب، سید عابد حسین، رشید احمد صدیقی اور خلیق احمد نظامی کے علاوہ بہت سے اہل علم کے علمی و تحقیقی مضامین شامل کتاب ہیں۔ منظوم حصے میں محمد اقبال، الطاف حسین حالی، اسرار الحق مجاز، اکبر الہ آبادی، ظفر علی خاں، وحید الدین سلیم، اور دوسرے صاحب فن شعراء کی تخلیقات کو کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔ کتاب پر علمی و تحقیقی نوعیت کا ایک بہت ہی وقیع اور تفصیلی مقدمہ تحریر کیا گیا ہے، جس میں سید احمد خاں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ سید احمد خاں پر اب تک اردو میں شائع ہوئے ہزاروں مضامین میں سے شامل کتاب ان 50 مضامین کے انتخاب کے عمل اور ان کی منطقی اور معروضی ترتیب سے متعلق خاطر خواہ وضاحت بھی مقدمہ میں موجود ہے۔ کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین پر قابل لحاظ حد تک علمی مباحثہ پیش کرتے ہوئے مزید مباحث کی گنجائش کا خیال بھی رکھا ہے۔ مؤلف کتاب اس کی ترتیب و تزئین اور اشاعت کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''اس کتاب کے ذریعہ میری کوشش یہ ہے کہ سرسید کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور نئی نسل کو ان کی خدمات سے واقف بھی کرایا جائے۔۔۔ اسی جذبے کے تحت اس کتاب کی ترتیب اور اشاعت کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے''۔

سید احمد خاں نہ صرف ہندوستانیوں کے رویے اور طرز احساس میں انقلابی تبدیلی کے باعث بنے بلکہ وہ ان میں سائنسی، معروضی اور منطقی طرز فکر کے فروغ کے محرک بھی بنے۔ ان کی تحریک نے شعراء اور نثر نگاروں کی ایک کثیر تعداد کو متاثر کیا اور عقلیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں ان کے تعاون کو سراہا۔ لہٰذا اردو میں اپنی نوعیت کی اس منفرد کتاب کا مطالعہ سرسید کی شخصیت اور کارناموں سے روشناش ہونے میں بہت حد تک معاون ثابت ہوگا۔

◂◂ ● ▸▸

کتاب کا نام ''یادوں کی سوغات''
(خطوط: پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار)
ترتیب و تدوین: مصنف: پروفیسر محمد غیاث الدین
(سابقہ صدر شعبہء اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھوارہ یونیورسٹی اورنگ آباد مہاراشٹر)
تبصرہ نگار: : شیخ اصغر شیخ اکبر

(پی۔ایچ۔ڈی۔رسرچ اسکالرشعبہءاردوڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد مہاراشٹر)

صفحات : ۳۷۷

قیمت : ۴۰۰ روپئے

سن اشاعت: ۲۰۱۹ء

پبلیشنگ : ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی۔

”یادوں کی سوغات“ پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار کے خطوط کا مجموعہ ہے۔جو انھیں مختلف اوقات میں بڑی بڑی شخصیتوں نے لکھے تھے۔ان خطوط کو پروفیسر محمد غیاث الدین نے ترتیب وتدوین کیا ہے۔پروفیسر محمد غیاث الدین بحثیت مدوین کسی تعارف کے محتاج نہیں اس سے پہلے انکی تین کتابیں منظر آم پر آچکی ہیں جوانھوں نے مرتب کی ہیں۔جسکے نام’ آئینہ آیام‘ جو قاضی عبدالستار کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔دوسری کتاب’ نذر قاضی عبدالستار‘ ہے جو قاضی صاحب کی شخصیت اور انکے فن پر مضامین کا مجموعہ ہے۔جس کو محمد غیاث الدین نے بڑی محنت ،لگن ،اور عرخ ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔تیسری کتاب’ مخدوم محی الدین حیات اور ادبی خدمات‘ ہے جو مخدوم محی الدین کے فن پر لکھے گئے مقالات کو مرتب کیا گیا ہے۔

اب پروفیسر محمد غیاث الدین کی چوتھی کتاب ”یادوں کی سوغات“ منظر آم پر آئیں ہے۔جس میں محمد غیاث الدین نے اپنے استاد محترم پدم شری قاضی عبدالستار کے خطوط کو مرتب کیا ہے۔جو قاضی صاحب کو مختلف اوقات میں مختلف شخصیات نے وقفہ وقفہ میں لکھے تھے۔اس کتاب کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کیونکہ ان خطوط سے قاضی صاحب کے زندگی کے چھپے ہوئے گوشے سامنے آتے ہیں۔جو ابھی تک اردو ادب کے لکھنے والوں کی نظر سے نہیں گذرے یا ان سے چھوٹ گئے تھے۔ظاہر ہے محمد غیاث الدین پدم شری قاضی عبدالستار کے شاگرد خاص ہے اور قاضی صاحب کے بہت قریب شاگردوں میں انکا شمار ہوتا ہے۔اس لئے محمد غیاث الدین کو قاضی صاحب کے وہ خطوط مل گئے جنھیں ابھی تک قاضی صاحب نے اردوئے دنیا سے چھپا کر رکھا تھا۔

”یادوں کی سوغات“ میں کل خطوط کی تعداد ۲۴۲ دوسو بیالیس ہے۔جس میں قاضی صاحب کو لکھے گئے خطوط کی تعداد ۲۲۳ دوسوتئیس ہے۔جبکہ بقیہ وہ خطوط ہیں جو قاضی صاحب نے اپنے شاگرد عزیز پروفیسر محمد غیاث الدین کو لکھے تھے۔انھیں ترتیب دیا گیا ہے۔ویسے تو قاضی صاحب بہت کم خطوط لکھا کرتے تھے ۔اور بہت کم خطوط کا جواب دیتے تھے۔جو بہت ضروری باتیں ہوتی تھی یا لکھنے پڑھنے کی باتیں ہوتی تھی بس

ان ہی خطوط کا جواب دیا کرتے تھے۔جسے محمد غیاث الدین نے اپنے مقدمے میں بیان کیا ہے۔اقتباس

”ان خطوط کو ترتیب دینے کا اصل مقصد یہی ہے کہ یوبھی قاضی صاحب بہت کم خطوط لکھا کرتے تھے۔ورنہ اردوں کے اچھے خاصے ادباء اور شعراء کی شہرت اور عظمت ان کے دن رات خط لکھنے کی مرہونِ منت ہے۔ان کی آدھی تنخواہ خط و کتابت میں خرچ کردینے کے طفیل ہے۔اور آج کل موبائل کے ماہانہ بل کے ذمہ ہے۔کچھ لوگوں کو پڑھنے لکھنے کی طرح خط لکھنے اور موبائل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔قاضی صاحب کو ایسی کوئی لت نہ تھی ۔وہ نہایت ضروری حالت میں خط لکھتے تھے یا پھر کسی کے بہت اقرار کرنے پر مختصر سا جواب دیتے تھے۔موبائل سسٹم تو ان کے آخر تک سمجھ میں نہیں آیا جو خطوط انھوں نے اپنے شاگرد کو لکھے ہیں وہاں بھی علم و درس ،رشد و ہدایت ،اور شفقت و محبت کی بات کی ہے۔دنیا داری ،کاروباری ،اور ظاہر داری ،دور دور تک نہیں ہے۔“ (یادوں کی سوغات۔محمد غیاث الدین۔صفحہ۔۱۱)

اسی طرح ”یادوں کی سوغات“ کے خطوط ہمیں اس وقت کے حالات اور واقعات کا اشارہ ملتا ہے۔جو قاضی عبدالستار صاحب کے زندگی میں رونما ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ ان خطوط میں قاضی عبد الستار کے فن کی وہ باتیں بھی سامنے آئیں ہے جس سے ہم ابھی تک محروم تھے۔یہ خطوط قاضی صاحب کی اردو ادب میں اسکی اہمیت اور بڑھا دیتے ہیں۔بہت سارے خطوط ایسے ہیں۔جن میں اردو ادب کی بڑی بری شخصیتوں نے قاضی صاحب کے فن کا لوہا مانا ہے۔یادوں کی سوغات سے سے قاضی صاحب کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ان خطوط میں انکی محبت ،شفقت ،ہمدردی ،انکصاری ،خلوص ،پیار ،دیکھنے کو ملتا ہے جوانھوں نے اپنے شاگردوں ،چاہنے والوں سے ظاہر کیا ہے۔یہ خطوط قاضی صاحب کے مخفی شخصیت کے پہلوں اجاگر کرتے ہیں۔’یادوں کی سوغات‘ کی خطوط کے مجموعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے اردوئے دنیا کے بڑے بڑے نام قاضی صاحب کو کس طرح چاہتے تھے۔اور ان سے پیار و محبت کا اظہار کس طرح کرتے تھے۔قاضی صاحب کو خطوط لکھنے والوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی ،سہیل عظیم آبادی ،پروفیسر انجم فاطمی ،کلام حیدری ،پروفیسر احتشام حسین ،پروفیسر نورالحسن ہاشمی ،پروفیسر تنویر احمد علوی ،اقبال مجید ،جوگیندر پال ،پروفیسر گیان چند جین ،اکبر علی خان (گورنر اتر پردیش) ،احمد جمال پاشاہ ،پروفیسر محمود الحیٰ ،وغیرہ وغیرہ۔

محمد غیاث الدین نے خطوط کی تدوین میں بڑی محنت صرف کی ہے۔پہلے تو خطوط کو حاصل کرنا اور پھر ان پرانے خطوط جو بوسیدہ بھی ہو چکے تھے۔جیسا کہ مصنف نے خود اپنے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔پھر ان

خطوط کو پڑھنا اور پھر ترتیب دینا یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہوتا ہے۔محمد غیاث الدین کی یہ اپنے استاد کے لئے محبت کا نتیجہ ہے کہ قاضی صاحب کے خطوط آج ہمارے سامنے آ گئے۔حالانکہ محمد غیاث الدین کو یہ تشنگی رہ گئی کے قاضی صاحب کے حیات میں یہ خطوط شائع ہو جاتے تو انھیں اور خوشی ہوتی۔بحر حال یہ خطوط کا مجموعہ آج ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔جو مصنف کے محنت،لگن،اور انکی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

'یادوں کی سوغات' ترتیب کی بات کی جائے تو یہ کتاب کل ۳۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔جس میں کل خطوط کی تعداد ۲۴۲ ہے۔جسکی قیمت ۴۰۰ روپئے رکھی گئی ہے۔یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔جسکا انتساب مصنف نے اپنے ماموں جناب حاجی محمد عیسیٰ صاحب کے نام کی ہے۔کتاب کے سرورق کی بات کی جائے تو کتاب کا ورق بہترین ڈزائین کیا گیا ہے۔کتاب کے فرنٹ پیج کور پر پدم شری قاضی عبدالستار صاحب کی فوٹو مقالہ پڑھتے ہوئے دیکھائی گئی ہے۔کتاب کے بیک سائیڈ پیج پر مصنف پروفیسر محمد غیاث الدین کی فوٹو اور انکی کتابوں اور ناولوں کے نام دئے گئے ہیں۔کتاب کے شروع میں اندرون صفحات میں قاضی عبدالستار کی تخلیقات کی فہرست اور انکے انعامات واعزازات کے نام دئے گئے ہیں جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔کتاب کے آخری صفحات میں وہ خطوط کی فوٹو کاپی لگائی گئی ہے جو قاضی صاحب نے اپنے شاگرد خاص پروفیسر محمد غیاث الدین کو لکھے تھے۔یہ فوٹو کاپی کتاب میں چار چاند لگا دیتی ہیں۔

کتاب 'یادوں کی سوغات' کے لئے پروفیسر محمد غیاث الدین یقیناً مبارک باد کے حقدار ہے۔لیکن اس کتاب کی اہمیت اسلئے بھی بڑھ جاتی ہے۔کیونکہ آنے والے رسرچ اسکالر اور اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے یہ کتاب یقیناً کا آمد ثابت ہوگی۔اردو ادب میں محمد غیاث الدین یہ کتاب ترتیب دیکر آنے والے رسرچ اسکالر کے لئے ایک بہترین تحفہ پیش کیا ہے۔جس کے لئے ہم پروفیسر محمد غیاث الدین کے شکر گذار ہیں اور انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب:اسیر خواب
مصنفہ:مریم تسلیم کیانی
صنف:افسانہ
قیمت:۴۰۰/روپے
تعداد:۵۰۰
اشاعت اول:اگست/۲۰۱۷

ناشر:مایا پبلیکیشنز،کراچی(پاکستان)
رابطہ:0321-2183178
مبصر:ڈاکٹر محمد ابوعبیدہ جوہر،شاہ کالونی،شاہ زبیر روڈ،مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob:98358 58955

کر گئے وعدہ کہ ہم خواب میں آ جائیں گے
نیند آتی ہی نہیں خواب کہاں آئے گا

''اسیر خواب'' مریم تسلیم کیانی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ۱۷/افسانے اور ۸/افسانچے ہیں۔اس کے علاوہ سائرہ غلام نبی کا تحریر کردہ ایک تعارفی مضمون بعنوان ''مریم کے افسانے'' بھی شامل ہے۔ اور بیک کور پر اردو کے مستند افسانہ نگار جناب حمید شاہد کے تاثرات بھی ہیں۔اس مجموعے میں زیادہ تر افسانے عورت کی نفسیات سے جڑے ہوئے ہیں۔انہوں نے کے الگ الگ روپ کو قریب سے دیکھا ہے۔یوں تو عورت ماں بھی ہے،بہن بھی،بیٹی بھی،ساس بھی اور بہو بھی۔اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سارے رشتے ہوتے ہیں اور ہر رشتے کی ایک الگ اہمیت ہے۔آج کی عورت مظلوم نہیں بلکہ طاقتور ہے۔جو حالات کا مقابلہ کرنا جانتی ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت کے دل کے اندر خاموش ڈھر کنیں تو دوسری جانب بلکتی روح بھی۔اس کے جذبات کو سمجھنے کے لیے اسے ایک سچا اور ہمدرد عاشق چاہئے.....آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے اشکوں کے سیلاب کو پیار و محبت کی ضرورت محسوس کرنے والا ایک رحم دل انسان بھی۔مریم تسلیم کیانی نے اپنے اردگرد اس طرح کے کرداروں ،ان کی قربتوں،غم اور خوشی اور جذباتی کیفیتوں کو دیکھا ہے اور اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب واجدہ تبسم کے افسانوں نے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بڑھا دی تھیں۔انہوں نے اپنی بے باک تحریروں کے ذریعہ عورتوں پر کیے گئے ظلم وستم اور ان کے ٹوٹتے بکھرتے خوابوں کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی تھی۔مریم تسلیم کیانی کے افسانوں کو پڑھ کر واجدہ تبسم کی یاد آ جاتی ہے۔

مریم تسلیم کیانی کا شمار عصر حاضر کے بہترین افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے انہوں نے اردو افسانے کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات مختلف النوع ہیں۔لیکن ان سب کا بنیادی عنصر جنس ہے۔انہوں نے عورت کے اندر پیدا ہونے والی ہلچل،بیزاری،بے بسی،بے چینی اور مرد کی بے رخی کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے پہلے جملے سے ہی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ان کا اسلوب نہایت عمدہ ہے۔

یوں تو ان کے سبھی افسانے اچھے ہیں لیکن ان کے وہ افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں عورتوں کی

زندگی، گھریلو الجھنوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''اسیر خواب'' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے ۔اور یہی اس مجموعے کا نام بھی ہے۔ یہ ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں عورت اور مرد کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ حالانکہ اس افسانے میں کرداروں کا کوئی نام نہیں ہے لیکن کہانی مرد اور عورت کے اردگرد گھومتی ہے۔ اس میں ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں، لمبے، گھنے اور کالے بال ہیں۔ ہونٹ سرخ ہیں۔ اس کے تشنگی بھی ہے اور کسک بھی..... بے چینی بھی ہے اور گھبراہٹ بھی۔

''آؤ باتیں کریں'' ماڈرن ٹکنالوجی کی ضرورتوں اور خوبیوں کے علاوہ اس کے کی مضر رسا اثرات کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور عمدہ افسانہ ہے۔ ''انحطاط'' محبت اور غربت سے جُڑا ہوا ایک عمدہ افسانہ ہے۔ یہ ایک غریب انسان اور بے زبان کبوتروں کی کہانی ہے جسے نہایت چابکدستی اور خوبصرتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ''گہری لالی'' ایک ایسی کنواری لڑکی کی کہانی ہے جس کے دل میں خواہشیں، تمنائیں، جذبات اور چاہت کا سمندر موجزن ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر بے چینی، بے قراری ارگھبراہٹ بھی ہے۔ وہ ایک بے نام سی کسک اور لذت سے آشنا ہوتی ہے۔ لیکن اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو جاتی ہے جو محبت کے لفظ سے نا آشنا تھا۔ وہ عورت کو صرف جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ''ماں کی گود'' ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں رشتے والدین کی مرضی سے طے ہوتے ہیں۔ گرچہ بعض جگہوں پر لڑکی سے بھی اس کی مرضی پوچھ لی جاتی ہے لیکن زیادہ تر لڑکیاں ماں باپ کی پسند کے آگے سر تسلیم خم کر لیتی ہیں۔ شادی کے پہلے ہر لڑکی ایک خوابوں کا محل سجاتی ہے جہاں وہ اپنے شہزادے کے ساتھ زندگی کے دن ہنسی خوشی گزارتی ہے۔ لیکن اس افسانے کی ہیروئن ندرت کی شادی ایک ایسے نوجوان اشعر سے ہو جاتی ہے جو ذہنی طور پر نابالغ ہے۔ اس طرح کا رویہ والدین کے ساتھ overattacment کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے cases میں بچوں کی نشو ونما صحیح طریقے سے نہیں ہو پاتی ہے۔ اور بچوں میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے اس قدر attached ہے کہ ندرت میں بھی اپنی ماں کو ہی دیکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہو جاتی ہے۔ آخر کار وہ ایک ماہر نفسیات خاتون سے مدد لیتی ہے جس نے اشعر کا کامیاب علاج کیا اور وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

محترمہ مریم تسلیم کیانی کا ادبی سفر جاری ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں وہ اور بہتر افسانے تخلیق کریں گی۔

◂◂ ● ▸▸

مکتوبات

●

''ثالث'' کا تازہ شمارہ ملا۔ مشکور ہوں کہ ''ثالث'' ملتا رہتا ہے اور حسب توفیق مطالعہ کرتا ہوں اور فائدہ اُٹھاتا ہوں۔

میری زندگی میں حقیقتوں سے اتنا واسطہ پڑتا رہتا ہے کہ افسانوں سے دلچسپی نہیں ہوتی، نہ میری زندگی میں موقع ہے کہ ترقی پسند اب، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے جھگڑوں میں پڑوں۔ کہیں بھی اچھی تحریر ملتی ہے تو قلب ونظر کو تھام لیتی ہے۔ اچھے اشعار سامنے آتے ہیں تو یاد ہو جاتے ہیں۔ آپ کی تحریریں بھی مجھے پسند آتی ہیں اس لیے ''ثالث'' سے بھی ایک تعلق ہے۔

پرسوں ایک صاحب نے مجھے بہت دور سے اطلاع دی کہ آپ نے ''ثالث'' میں مجھ پر ''خاکہ نگاری'' کی ہے۔ ''ثالث'' پہنچا تو وہ خاکہ بھی نظر سے گزرا۔ آپ کا شکر گذار ہوں کہ ادب دانوں، ادب نوازوں کے بیچ ایک ''بے ادب'' کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ نے مضمون کی شروعات ایک شعر سے کی ہے اور اسی شعر سے پورا خاکہ بُنا گیا ہے۔ شعر پڑھتے ہی میرا ذہن حضرت جگر کے ایک شعر کی طرف گیا:

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر
انساں ہی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں

میری ہلکی ہلکی دبی دبی یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ ہمارا گرد و پیش، ہمارا ماحول اردو زبان کی لذت سے واقف ہو اور کم از کم اردو شعر و شاعری کے ذریعہ سہی نئی نسل کا تلفظ صحیح ہو..... بگاڑ تو بہت ہے، پوری دو نسلیں بے توجہی اور بگاڑ کا نمونہ ہیں۔ پڑھے لکھوں کی زبان سنتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ حواس پر ہتھوڑا برس رہا ہے۔ اردو کے اساتذہ بھی جب بولتے ہیں تو زبر زیر پیش سے آزاد! آداب تلفظ سے معرّیٰ بولتے ہیں۔ اس بگاڑ کی اصلاح کی میں چھوٹی بڑی کوششیں کرتا رہتا

ہوں۔آپ کی نگرانی میں مختلف محلّوں کے طلباوطالبات کی زبان کی اصلاح کی ایک کوشش تھی جو کامیاب ہوئی۔آپ اور مولانا منظر قاسمی کی محنت سُوارت ہوئی۔ رحمانی فاؤنڈیشن کے میدان میں اسٹیج سے اردو شعراء کے رواں دواں کلام کو گایا یا تحت اللفظ سنایا گیا تو بڑی خوشی ہوئی کہ مسلم اور ہندو طلبہ وطالبات نے بڑے اچھے تلفظ کا اظہار کیا اور تھوڑی سی کوشش ہوئی تو اچھا رنگ چڑھا۔یہ اردو تہذیب کی بقاء کی طرف ایک چھوٹا سا قدم تھا جس نے ماحول پر اثر ڈالا اور:

ابھی خزاں تھی ابھی لہلہا اُٹھا گلشن
میں اپنا رنگ تخیل چمن پہ ڈال آیا

چاہتا تھا کہ یہ کوشش جاری رہے مگر مولانا منظر کی گونا گوں مشغولیت نے اس کا موقع نہیں دیا۔

پہلی جنگ آزادی پر جو سیمینار رحمانی فاؤنڈیشن میں فروری ۲۰۰۹ء کو منعقد ہوا تھا اور جس میں آپ نے بھی مقالہ پیش کیا تھا، جی چاہتا تھا کہ مقالات کا مجموعہ مرتب کیا جائے اور اس کتاب کی اشاعت ہو۔NCPUL کے ایک صاحب نے سارے مقالوں کو یہ کہہ کر ''قبول'' کرلیا کہ انہیں NCPUL چھپوائے گا۔میں نے ان کے ارادے کو ڈائریکٹر صاحب سے بیان کردیا۔بعد میں حالات بدلے، ڈائریکٹر صاحب بدلے اور بار بار یاد دہانی کی گئی تو یہ جواب ملا کہ وہ فائل ''مس پلیس'' ہوگئی ہے۔اب کیا کہا جائے، مس اور مسز کے چکر میں وہ سارے مضامین تشنۂ طباعت رہ گئے۔

آپ نے بڑی ہمت کا کام کیا ہے۔''ثالث'' نکالا اور نکال رہے ہیں۔عمدہ کاغذ، روشن طباعت اور بہترین گیٹ اپ کے ساتھ! جی چاہتا رہا ہے کہ مونگیر کے کچھ لوگوں کو جمع کیا جائے اور ''ثالث'' کا استقبال کیا جائے مگر کوئی ایسا موقع نہیں آیا جس میں یہ کارِ خیر انجام پائے اور ''ثالث''، ''آپ'' اور ''ثالث آفاق صالح'' کی رونمائی ہو۔دیکھئے کب یہ موقع ہاتھ لگتا ہے۔

اللہ کرے آپ خیر و عافیت، صحت وتندرستی کے ساتھ ہوں۔گھر میں سبھوں سے سلام ودعا کہہ دیں۔

(مولانا محمد ولی رحمانی، سجادہ نشیں، خانقاہ مونگیر)

● ثالث کا شمارہ 17 دستیاب ہوا۔خوشی ہوئی کہ عالمی خواتین نمبر جیسا ضخیم شمارہ نکال کر آپ چپ نہیں بیٹھے اور ایک خوبصورت شمارہ اور نکال دیا۔کچھ چیزیں تو میں نے پی ڈی ایف میں ہی پڑھ لی تھیں اب رسالہ سامنے ہے تو کچھ چیزیں اور پڑھ گیا۔

سب سے پہلے سلمان عبدالصمد کے مضمون کی بات کریں۔شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''شعر شور انگیز'' بہت اہم تسلیم کی جاتی ہے جس میں انہوں نے میر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب نے کتنوں کی ذہن کی کھڑکیاں کھول دیں۔ میں نے جب اس کا مطالعہ تو فاروقی کی تنقید کا نہ صرف قائل ہوگیا بلکہ یہ سمجھ میں آیا کہ بغیر ڈوب کر پڑھے اتنی کھری تنقید نہیں کی جاسکتی۔سلمان نے بھی عمیق مطالعہ کے بعد ہی اتنا جامع مضمون لکھا۔اس نے بہت معروضی اور مدلل گفتگو کی اور ثابت کیا کہ وہ واقعی چھوٹے قد کا بڑا ادیب ہے۔پی ڈی ایف وہ بھی موبائل پر اتنا طویل مقالہ ایک شفٹ میں پڑھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ تحریر میں دَم ہے۔سلمان کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔اسے ابھی عشق کے مزید امتحان سے گزرنا ہے۔

منتخب افسانے کا انتخاب لاجواب ہے۔کوارنٹین بالکل آج کا افسانہ ہے۔بیدی کی کہانی میں نے پہلی بار پڑھی اور خوب لطف اندوز ہوا۔شموئل کا افسانہ ''قصاب کی محبوبہ'' شروع بہتر انداز سے ہوا لیکن آخر میں منہ کے بل گر گیا کلائمکس کو وہ سنبھال نہیں پائے۔سادھونی کوئی بھی فائر برانڈ لیڈر ہوسکتی ہے۔وہ پرگیا ٹھاکر ہو یا اوما بھارتی۔شموئل نے سیکس کے خاص لمحوں میں سادھوی کی مسلمانوں کے تئیں شدید نفرت کے اظہار کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔پھر قصاب کے استفار پر معصومیت سے مکرنا بھی خوب ہے جبکہ سرور کے ان لمحات میں عام طور پر سامنے والے کی شخصیت یاد نہیں رہتی، صرف مرکزی نکتے پر فوکس ہوتا ہے۔لیکن سادھوی کے الفاظ جان بوجھ کر نفرت کا اظہار یہ ہیں جسے جبار بھی محسوس کرتا ہے۔افسانہ بہتر انداز میں چل رہا تھا لیکن جبار نے منظر سے بھاگ کر سب گڑبڑ کردیا۔اسے وہیں رہ کر اتوار کی طے شدہ ملاقات میں سادھوی کو سبق سکھانا چاہیے تھا تاکہ اس بات کی دھمک دور تک جاتی کہ مسلم جہاں بھی رہتا ہے کیل گاڑ کر رہتا ہے اور اپنے وجود کو تسلیم کراتا

ہے۔ مجھے منٹو کا خوشیا یاد آ گیا جس کے سامنے جوان طوائف جب ننگی آ گئی کہ یہ تو اپنا خوشیا ہے تو اسے خوشیا نے اپنی ہتک سمجھی اور پھر اسے ایک بھڑوے کی بجائے ایک خریدار بن کر اپنے مرد ہونے کا احساس کرایا۔ شموئل اب بھی چاہ لیں تو کلائمکس اس سے جاندار ہوسکتا ہے۔ اسرار گاندھی کی ''ہڈیاں'' آج کے ایک بہت اہم مسئلے پر فوکس کرتی ہے اور اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ ہماری قوم کو شادی بیاہ میں ہڈی پر زور دینے کی بجائے شرافت پر توجہ دینی چاہیے ورنہ اسی طرح شمع دان سے موم بتاں غائب ہوتی رہیں گی۔ اس سلسلے میں عرض کروں کہ اس موضوع پر اس سے خوبصورت افسانہ آپ کے ثالث میں ہی فارحہ ارشد کا پڑھا تھا اور وہ افسانہ اتنا بہتر تھا کہ میں نے فون کر کے فارحہ کو داد دی تھی۔ ''کھڑکی میں اُگا وجود'' بھی ایک اچھا افسانہ ہے جس میں زویا حسن نے تنہائی اور بے بسی کے کرب کو نمایاں کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پیار شادی سے قبل سے بہتر ہے کہ شادی کے بعد کیا جائے۔ ایک جوان لڑکی ایک کھوکھلے مرد کے ساتھ جس کرب سے دوچار ہوتی ہے اس کا بہتر اظہار ملتا ہے۔ آج کی انٹرنیٹ کی دنیا میں کس طرح برقی مباشرت سے ہمارا پورا ماحول مبتلا ہے اور جوان بوڑھے سب اس وبا کے شکار ہیں۔ یہ وہی کھڑکی ہے جس میں جھانک کر وقتی تلذذ تو حاصل کیا جاسکتا لیکن حقیقت کی دنیا میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح فضیلت کو بعد میں معلوم ہوا کہ کھڑکی سے دیکھا ہر سچ جھوٹ پر مبنی تھا۔

نشاط پروین کی کہانی ''شور'' ساؤنڈ پولوشن پر مرکوز ہے۔ ایک گرہنی کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا اسے بھی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ کرونا سے ہوئی موت کی میت کو محلے میں داخل ہونے سے روکنا اس جہالت کا ثبوت ہے جو ہاسپٹل کے کارندے پھیلا رہے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ موت جس سبب بھی ہو اس مرض کے جراثیم لاش میں نہیں پائے جاتے ساری بیماری زندہ رہنے تک ہی رہتی ہے۔

آپ کا اداریہ بھی غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور آپ کا مولانا ولی رحمانی پر خاکہ آپ کی عقیدت کو ظاہر کرتا ہے۔

منظوم حصے میں جو نام ہیں وہ معیار کے ضامن ہیں خصوصاً بھائی ارشد عبدالحمید ا

ورعین تابش کی غزلوں نے کافی متاثر کیا۔ دیگر تخلیق پڑھ نہیں پایا ہوں اس لیے رائے نہیں دے سکتا۔ بھائی اقبال حسن خان کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا باب اطمینان سے پڑھوں گا۔

اس پُر آشوب دور میں اتنا اچھا رسالہ نکالنا کتنا مشکل ہے مجھے معلوم ہے۔ اللہ آپ کی دیوانگی سلامت رکھے تاکہ ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہے۔

مشتاق احمد نوری (پٹنہ)

● اردو سہ ماہی ثالث کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ 2021 آج رجسٹرڈ ڈاک سے ملا۔ بھائی اقبال حسن آزاد کا شکریہ۔ کورونا کے اس بھیانک دور میں جب مہینوں تک پوری دنیا میں نہ صرف چھوٹے بڑے کاروبار ٹھپ رہے، لاکھوں لوگ اس مہاماری کی چپیٹ میں آ گئے، لوگوں کے شب و روز بری طرح متاثر ہوئے، ایسے ظالم وقت میں بھی جو دوست ادب کی خدمت میں لگے رہے ان کی ادب سماج کے تعلق سے لگاؤ کو سلام۔ آزاد صاحب خاص طور سے اس عزت کے حقدار ہیں کیونکہ وہ خود اس وبا میں مبتلا ہوئے اور کورونا کو شکست دے کر صحت یاب ہو کر گھر لوٹے۔ دوران علاج بھی وہ مسلسل لکھتے پڑھتے رہے اور سوشل میڈیا پر بھی متحرک رہے۔ ان کی ہمت، حوصلے اور مثبت سوچ کو سلام۔ اسی دوران انہوں نے ثالث شمارہ نمبر-17 کی تیاری کی۔ آپ کی شخصیت مبارک باد کی مستحق ہے۔ آپ کے لیے نیک خواہشات۔ اس شمارے کا سرورق ہمارے دوست محمد نعیم یاد (پاکستان) نے تیار کیا ہے۔ انہیں بھی بدھائی۔

سریش کمار (علی گڑھ، انڈیا)

● ماشاء اللہ! اردو مجلّات کی فہرست میں ''ثالث'' کو اس اعتبار سے امتیاز اور افتخار حاصل ہے کہ اس میں شائع ہونے والے مقالات و مضامین انتہائی وقیع اور اہم ہوتے ہیں۔ اس کے مشمولات میں عموماً وہی تحریریں جگہ پاتی ہیں جن میں معیار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ غور وفکر کی نئی جہتیں روشن ہوتی ہوں۔ حالیہ شمارے میں نوجوان اسکالر ڈاکٹر سلمان عبدالصمد کی فاروقی صاحب کی کتاب ''شعر شور انگیز'' سے متعلق ایک فکر انگیز مقالہ شامل ہے۔ ''ثالث'' میں عموماً بڑے نام کے بجائے

بڑی تحریروں کو جگہ ملتی ہیں۔رسالے کی بھیڑ میں ''ثالث'' کی یہی انفرادیت ہے اور امتیاز بھی۔کسی بھی رسالے کی کامیابی میں معیار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ میعاد کی پابندی بھی ایک اہم وجہ ہوتی ہے۔''ثالث'' کے روح رواں کامیابی کے اس رمز سے واقف ہیں۔تمام تر مصروفیات کے باوجود وقت کی پابندی اور معیار کا خیال ان کی ترجیحات میں شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ اتنے خوبصورت اور بامعنی رسالے کو چشم بد سے بچائے اور اقبال حسن آزاد صاحب کی تمام آفات و بلیات سے حفاظت فرمائے۔آمین یارب العالمین!

(نعمان قیصر، دور درشن، نئی دہلی)

- ''ثالث'' کے شمارہ نمبر ۱۷ میں احقر کی دو غزلیں شامل کرنے کے لیے شکر گذار ہوں۔آپ جس محنت اور لگن سے پرچہ ترتیب دیتے ہیں وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔آپ اردو کے ان مجاہدین میں سے ہیں جنہوں نے اردو کو زندہ رکھنے اور اس کو فروغ دینے میں 'دامے، درمے، قدمے، سخنے اپنا سب کچھ داؤ پر لگایا ہوا ہے۔اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ صحتمند رہیں اور اسی طرح ادب کی آبیاری کرتے رہیں۔

ڈاکٹر ذکی طارق (غازی آباد، انڈیا)

- ''ثالث'' کا عالمی خواتین نمبر موصول ہوا۔آپ نے جس محنت اور جانفشانی کے ساتھ مواد کو اکٹھا کیا ہے اور لاک ڈاؤن کے باوجود اسے بروقت شایع کر نذرِ قارئین کیا ہے وہ آپ کی محنت اور زبان وادب سے دلچسپی کا غماز ہے۔مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ آپ نے ادب کی ان تمام عظیم خواتین کو کسی نہ کسی طور پر اس میں شامل کرلیا ہے جو نسائی ادب کی نمائندگی کرتی ہیں۔اگرچہ ابھی بھی بہت گنجائش ہے اور مزید کام کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر افشاں ملک کا مہمان اداریہ ''اردو کا نسائی ادب.....ایک جائزہ'' ادب کی مختلف اصناف میں خواتین کی حصہ داری کا مختصر لیکن جامع احاطہ ہے۔خصوصی مضامین کے تحت نسترن احسن فتیحی کا مضمون بعنوان ''تانیثیت'' بھرپور ہے۔انہوں نے تانیثیت کو خود بھی سمجھا ہے اور قاری کو بھی اس کو سمجھنے کی دعوت دی ہے جو ان کے وسیع مطالعے کی دلیل ہے۔انہوں نے مختلف نظریات کے حوالے سے مکمل دلائل و

براہین سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور مرد ذات کو آئینہ دکھایا ہے۔لیکن بقول مشتاق احمد نوری:

''آج ہم عورت کو برابر کا درجہ تو دینا چاہتے نہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ''ڈور ہمارے ہی ہاتھ میں رہے گی۔'' شموئل احمد نے بھی مرد کی بالا دستی کے اردگرد ہی اپنے مضمون کا تانا بانا بُنتے ہوئے مذہب اسلام کی روشنی میں معاشرہ میں عورت کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔اپنی جانب سے صاحب مضمون نے کوئی ٹھوس گفتگو نہیں کی ہے۔جبکہ وہ اپنے مشاہدے اور مطالعے کی بنا پر اس موضوع پر اچھی گفتگو کر سکتے تھے۔ریاض احمد نے تانیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے کہ ''تانیثی ڈسکورس کو ایک ادبی ڈسکورس کے طور پر لیا جائے تاکہ ایسی زمین تیار کی جائے جو تانیثی ادب کے لیے مفید ہو'' بہرکیف! ''ثالث'' کا یہ ضخیم نمبر نسائی ادب میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا جس کے لیے میں آپ کو پیشگی مبارکباد دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ڈاکٹر ذکی طارق (غازی آباد، انڈیا)

◂◂ ● ▸▸

اقبال حسن آزاد

کا

چوتھا

افسانوی مجموعہ

اوس کے موتی

(زیر طبع)